علوم القرآن



مصنف

ڈاکٹر صبحی صالح لبنان

ترجمہ

پروفیسر غلام احمد حریری رح

ملک سنز پبلشرز
کارخانہ بازار فیصل آباد

عُلُومُ الْقُرْاٰن

★ حَقِیقَتِ وَحی

★ جَمعُ وتَدوِینِ قُراٰن

★ عُلُومُ الْقُرْاٰن

★ اِرتِقاءِ تفسِیر

★ اِعْجازالقراٰن

بار ششم

طبع جدید انیق (رجسٹرڈ)

★

تصنیف

ڈاکٹر صبحی صالح

(بیروت)

★

ترجمہ و تحشیہ

پروفیسر غلام احمد حریری

صدر شعبہ علوم اسلامیہ:

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد (پاکستان)

(ناشرین)

ملک سنز پبلشرز کارخانہ بازار فیصل آباد

پاکستان

فون ۲۴۳۷۵

بار سوم ——— آفسٹ ایڈیشن ——— تعداد ۵۰۰

اگست سنہ ۱۹۸۶ء سنہ ۱۹۹۸ء

بار چہارم ——— سنہ ۱۹۹۳ء سنہ ۱۹۹۰ء

طابع : ملک سنز پبلشرز، کارخانہ بازار فیصل آباد

مطبوعہ : طبع فی المطبعة العربية

کاتب : محمود الحسن خوشنویس ساکنہ حضرت کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ

قیمت :

علوم القرآن

★	★
تصنیف	ترجمہ
ڈاکٹر صبحی صالح	غلام احمد حریری
لبنان	ایم-اے

ملک سنز ناشران و تاجران کتب کارخانہ بازار فیصل آباد

فون :- ۲۴۳۷۵

قیمت :- کاغذ سفید روپے

فہرست

سخنہائے گفتنی

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا۔

امّا بعد غیر ملکی سامراج نے جس بُری طرح سے ہمارے قلب و ذہن کو متأثر کیا اور ہمارے فکر و نظر کے سانچوں اور پیمانوں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کے بدترین ثمرات و نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارا رشتہ اپنی تاریخ اور اپنے ماضی کی فکری اور تہذیبی تحریکوں سے بے حد کمزور ہو گیا ہے۔ اور ہم خود اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو دوسروں کی نگاہ سے دیکھنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ کسی قوم کی تاریخ میں یہ انتہائی پست مقام ہے جس سے زیادہ پستی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس فکری محکومیت اور ذہنی مرعوبیت نے جس احساس کمتری کو جنم دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنے اسلاف کے تابندہ و درخشندہ علمی کارناموں کو یکسر بھول گئے۔ ہمیں مطلقاً یاد نہ رہا کہ ابن جریرؒ، ابن کثیرؒ، ابن تیمیہؒ اور رازیؒ و غزالیؒ کون تھے اور انہوں نے کیا کچھ کارہائے نمایاں کر دکھائے؟ ان کے برخلاف ملٹن، شکسپیئر، کارلائل وغیرہ کے نام ہمارے قلب و ذہن پر ثبت ہو گئے۔

آج جن کتابوں کا ایک بے پناہ طوفان مغرب سے اُٹھ کر مشرق کو لپیٹ میں لے رہا ہے ان میں سے کوئی یہ نہیں بتاتی کہ وہ راجر بیکن جسے انگلستان میں بابائے سائنس سمجھا جاتا تھا عربوں کا شاگرد تھا۔ اور وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ صحیح علم حاصل کرنا ہے تو عربی پڑھو۔ مورخین مغرب یونانیوں کو علم کا سرچشمہ بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کی کتابیں چھ سو برس تک اسکندریہ، ایتھنز اور قسطنطنیہ میں مقفل پڑی رہیں۔ عربوں نے انہیں نکالا، عربی میں ترجمہ کیا۔

اور یہی تراجم مسلمانوں کے ساتھ یورپ میں پہنچے۔ یورپ میں سائنس اڑھائی سو برس میں اسحاق نیوٹن سے آئن سٹائن تک جا پہنچی۔ لیکن عربوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہزار سال تک یونانیوں کا ترجمہ ہی کرتے رہے۔ اور انہوں نے علوم وفنون میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا۔

لیکن جو قوم اپنے قیمتی اثاثہ سے خود ہی غافل ہو وہ دوسروں کو اس سے کیا آگاہ کر سکتی ہے؟ پروفیسر خلیپ، کے حتی مذہبی تعصب کے باوجود قرونِ وسطیٰ کے عربوں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہی مسلمان آگے چل کر قرونِ وسطیٰ میں یورپ کو ایسے ذہنی اثرات کے منتقل کرنے کا وسیلہ بنے جنہوں نے مغربی دنیا کو بیدار کر کے اسے نشاۃِ جدیدہ کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے قابل بنا دیا۔ انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے جو خدمات عربوں نے قرونِ وسطیٰ کی ابتداء میں انجام دی ہیں ویسی خدمت کسی اور قوم نے انجام نہیں دی۔ اس زمانہ میں جب کہ عرب علماء ارسطو کا مطالعہ کر رہے تھے، یورپ میں شارلیمان اور اس کے امراء اپنے نام کے ہجے سیکھ رہے تھے۔ ایک اسلامی شہر قرطبہ ہی میں سترہ بڑے کتب خانے تھے۔ ان میں سے ایک کتب خانے میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں۔ ایسے زمانہ میں جب کہ جامعہ آکسفورڈ کے عالم غسل کرنے کو بے دینوں کی رسم جانتے تھے۔ اسی قرطبہ کے مسلمان سائنس دان پر تکلف حماموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔" (ہسٹری آف دی عربس)

پروفیسر مذکور مزید لکھتا ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد عرب کی بانجھ زمین کو جیسے کسی نے جادو کے زور سے مردم خیز خطہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ پھر تو اس خاک سے ایسے ایسے عالی ہمت اور بلند حوصلہ لوگ اٹھے کہ شمار اور صفات کے اعتبار سے اور کہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ عراق، شام اور مصر میں خالد بن ولید اور

عمرو بن العاص نے جو مصر کے سر کیے حربیات کی تاریخ میں ان کا شمار ایسی فوجی حملوں میں ہوتا ہے جو جرأت و جلالت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ ان کا مقابلہ بجا طور پر نپولین، ہنی بال اور سکندر کی جنگی حملوں سے کیا جا سکتا ہے۔"

(ہسٹری آف دی عربس)

مگر اس کا کیا علاج کہ ہماری نئی پود مستشرقین و مغربی محققین کی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتی اور ان کے قلم و زبان سے نکلے ہوئے ہر حرف کو وحی الٰہی سے کم نہیں سمجھتی۔ اس ضمن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بڑے ایمان افروز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی نظریات کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اصول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہو جائے، یا کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ ایک طرف انہوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر و ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت و دقیانوسیت کا مترادف قرار دیا۔ دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انہوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سیکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہنچانے اور جاہلیت قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں

ہو سکا۔" (اسلامی ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش)

مغربی مصنفین اور ان کی تصنیفات نے نوجوان طبقہ پر جو اثرات ڈالے اس کا حال تہذیب مغرب کے ایک واقف کار کی زبانی سنیئے:

"ہمارے نوجوانوں کا ایمان متزلزل ہے جس کی وجہ سے نہ ان میں کردار کی بلندی باقی رہی ہے نہ صحیح ترقی کا ولولہ۔ یہی نہیں کہ ان کے عمل سے اسلام کی بو نہیں آتی۔ بلکہ ان کے دل بھی اسلام کی محبت سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے والدین اور بزرگوں کی زندگی میں اسلام نظر نہیں آتا تو وہ اپنے آبائی دین کی عظمت کو کیسے سمجھیں؟ ہماری درس گاہیں جسد بے جان ہیں۔ جہاں نہ علم ہے نہ کردار۔ نہ دین، نہ جذبہ۔ ان سے تعلیم پاکر نوجوان جوش و ولولہ کہاں سے لائیں؟ ان کے دل پر جب اغیار کی عظمت کے نقوش ثبت ہیں تو وہ اپنی کسی چیز پر فخر کیسے کریں؟ اگر ان کے کانوں میں مغربی تہذیب کے راگوں کے الاپ ہی پڑے ہیں تو وہ اپنی تہذیب میں کسی خوبی کا نشان کیسے پائیں گے؟ اور ثقافت اور دین کا چونکہ گہرا تعلق ہے لہٰذا ان کے دل اگر ارتداد کی طرف مائل ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے"؟

(پیش لفظ "اسلامی نظریۂ حیات" ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)

ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں:

"اس ثقافت کی بربادی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ خود ہمارے بچے اب ان کتابوں سے بھی ناواقف ہیں جو ہمارے لیے مشعل راہ تھیں۔ اس کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ جن قدروں پر ہماری انفرادی اور ملی زندگی تعمیر ہوئی تھی وہ اب استہزاء اور نسیان کے سپرد ہو گئیں۔ ہم نے خوش ہو کر وہ کالے ناگ پال لیے جو قدم قدم پر ہمیں ڈستے ہیں اور ہم نے بطیب خاطر ان رہزنوں کو بلا بلا کر اپنی روحانی اقدار کی بستیوں

میں بسا لیا جو ہمارے ہوش و حواس کو نقارہ بجا بجا کر لیتے ہیں۔ تو یہ ثقافت بیچاری اگر دم توڑ رہی ہے اندر اپنی جگہ ایک ایسا عمیق غار کھچ کر جا رہی ہے جس میں ہم سما جائیں گے اور پتہ بھی نہ چلے گا۔ تو اس میں حیرت و استعجاب کا تو خیر محل ہی کیا ہے۔ یہ بھی باعث تعجب نہیں کہ اس ثقافت کو جس کی گود میں ہماری قومیت کی تعمیر ہوتی تھی دفن کرتے ہوئے نہ ہماری آنکھ میں نمی ہے نہ دل میں درد۔ نہ لبوں پہ آہ ہے۔ اور اگر کسی واقف راز کے دل سے آہ نکلتی بھی ہے تو دوسرے حیرت سے اس کا منہ تکتے ہیں کہ ایسی خوشی کی گھڑی میں یہ بدشگونی کیسی"؟ (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی)

خلاصہ یہ کہ دور حاضر کا مسلمان اسلامی تہذیب سے یکسر بیگانہ ہے۔ اس میں مذہب سے انحراف کا ایک واضح اور نمایاں رجحان پایا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جدید مغربی تہذیب لا مذہبیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ انسانی تجربہ سے واضح ہوتا ہے کہ مذہب کو ترک کر کے انسان نہ صرف یہ کہ اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جاتا ہے بلکہ خود مادی وسائل کے استعمال میں بھی وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکتا جو فلاح و خوش حالی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ زندگی کی شب تاریک صرف مذہب ہی کی روشنی سے منور ہو سکتی ہے۔ دور حاضر کا انسان ایک طرف تو چاند پر کمندیں پھینک رہا ہے۔ دوسری جانب اس کی بے بصیرتی کا یہ عالم ہے کہ وہ دینی حقائق سے یکسر بے بہرہ ہے۔ علامہ اقبال نے اس صورت حال کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ ہمارے طلبہ کو سکولوں اور کالجوں میں کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان خرافات کے خلاف نہ طلبہ آواز اٹھاتے ہیں نہ اساتذہ اسی انداز تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو اسلامی روایات سے متنفر کیا۔ ان کے حوصلے توڑے اور

میں احساسِ پستی پیدا کیا۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ انہیں قرآنی علوم سے آشنا کیا جائے تاکہ ان کی جھکی ہوئی گردنیں بلند ہو جائیں۔ یہ شاہراہِ حیات پر سینہ تان کر چلیں۔ اور ان میں غلامانہ ذہنیت کی رمق بھی باقی نہ رہے۔

یہی افکار و آراء پیشِ نظر تھے کہ لبنان یونیورسٹی آرٹس کالج کے ڈاکٹر صبحی صالح کی کتاب "علوم القرآن" پر نظر پڑی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف وہاں علوم اسلامیہ و فقہ اللغۃ کے پروفیسر ہیں۔ دل میں اس جذبہ نے کروٹ لی کہ قرآنی علوم و حقائق سے متعلق ہمارے نوجوانوں میں جو سرد مہری پائی جاتی ہے کچھ عجب نہیں یہ کتاب اس کو دور کر دے اور ان کے دلوں کو علوم قرآنی کی تابانی و درخشانی سے جگمگا دے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ہمارے ملک میں جو لوگ قرآن فہمی کے مدعی ہیں وہ اپنے دعویٰ میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ اور کیا نورِ نبوت کو مشعل راہ بنائے بغیر بھی کسی شخص کے لیے علوم القرآن کے بحرِ ناپیدا کنار کی غواصی ممکن ہے؟ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس چشمہ سے قرآنی معارف کے سوتے پھوٹتے ہیں اور دلوں میں انوارِ قرآن کی جلوہ گری ہوتی ہے اس سے انکار کر کے بھی ایک شخص نہ صرف اعلیٰ درجہ کا مومن و مسلم بلکہ مفسرِ اعظم بن کر مسندِ تفسیر پر بھی براجمان ہو جائے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں ؎

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

تو اس کور نگاہی کے باوصف قرآنی علوم میں مہارت کا دعویٰ کہاں تک درست ہے؟ اس سوال کا جواب آپ کو کتاب ہٰذا میں ملے گا۔

مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

فَهَلْ مِنْ عَجَبٍ إِذَا حَرَّمَ الْعُلَمَاءُ الْمُحَقِّقُوْنَ الْإِقْدَامَ
عَلَىٰ تَفْسِيْرِ كِتَابِ اللّٰهِ لِمَنْ جَهِلَ أَسْبَابَ النُّزُوْلِ.

اسبابِ نزول سے آگاہ ہوئے بغیر اگر علماء نے تفسیرِ قرآن کو حرام قرار دیا ہے تو اس میں تعجب کیا بات ہے؟

(علوم القرآن بحوالہ اسباب النزول للسیوطی)

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

"اگر سبب نزول کا ذکر و بیان ضروری نہ ہوتا تو لوگ آج تک شراب اور نشہ آور اشیاء کو آیت قرآنی "لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا" کے پیش نظر مباح قرار دیتے رہتے"

(سورۃ المائدہ - ۹۳)

مصنف موصوف بیچارے کیا جانیں کہ پاکستان کہلانے والے ملک میں ایسے مفسر بھی موجود ہیں جو اسباب نزول کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناقابل تسلیم قرار دیتے ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ محولہ بالا آیت سے شراب کو حلال طیب قرار دینے والے نہ صرف پاکستان میں موجود ہیں بلکہ بڑے بڑے سرکاری اداروں کے سربراہ ہیں۔ حکومت سے ہزاروں روپے تنخواہ پاتے ہیں اور سرکار دربار میں بڑی عظمت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ہے قرآن سے بے اعتنائی ——— نہیں بلکہ ناانصافی ——— کا عالم اس ملک میں جس کو خدا کے نام پر دین کی نشر و اشاعت کے لیے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ حالات دیکھ کر خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمۃ کے قول کی صداقت مجسمہ حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ :

"دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم دو ہیں : (۱) قرآن کریم (۲) حضرت حسین رضؓ"

یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ قرآن و اسلام پر اتنا ظلم مستشرقین نے نہیں کیا تھا جتنا ان کے پاکستانی روحانی و جسمانی شاگردوں نے۔ توڑ مروڑ اور تحریف و تغییر کا سلسلہ جاری ہے اور جانے کہاں جا کر یہ سلسلہ رکے۔ کوشش یہ ہے کہ خود بدلنے کے بجائے کیوں نہ اسلام کو اپنے قالب میں ڈھال لیا جائے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

ڈاکٹر صبحی صالح نے استھم، براؤن اور نکلسن کے مسلم نما عیسائی شاگردوں کو قرآن فہمی کا

طریقہ بتانے کی کوشش کی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ اب بھی اپنی ہٹ پہ قائم رہیں ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ڈاکٹر صبحی صالح نے مندرجہ ذیل عنوانات کو موضوع بحث بنایا ہے:

حقیقت وحی - تاریخ قرآن - علوم القرآن - اعجاز القرآن و ناسخ تفسیر

حقیقت یہ ہے کہ صاحب موصوف نے ان مباحث کا حق ادا کر دیا ہے۔ مذکورہ صدر چار ابواب کے تحت سیکڑوں ذیلی عنوانات پھیلتے گئے ہیں۔ یہ ذیلی عنوانات مصنف نے قائم نہیں کیے تھے۔ احقر نے بغور مطالعہ کے بعد ان کی نشان دہی کر دی ہے۔

خلاصہ یہ کہ زیر تبصرہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت مفصل اور تقریباً اس ضمن میں تحریر کردہ یک صد کتب کی جامع ہے جن کا تذکرہ ماخذ کے طور پر مصنف نے کتاب کے آخر میں کیا ہے۔ ترجمہ میں تفہیم مطالب کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور مبہم و مجمل مباحث کو آسان بنانے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ الغرض خدمت قرآن کا جو جذبہ دل کی گہرائیوں میں پنہاں تھا علوم القرآن کی صورت میں مجسم ہو کر آپ کے سامنے جلوہ گر ہے۔ میرے قلبی اخلاص کی حقیقت سے وہی دانائے کل آگاہ و آشنا ہے جو علیم و خبیر بھی ہے اور سمیع و بصیر بھی۔ اگر یہ خدمت میری نجات اخروی کا سامان بن جائے تو اس کی رحمت بے پایاں سے کچھ بعید نہیں ؎

غرض نقشیست کز ما یاد ماند

کہ ہستی را نمی بینم بقائے

احقر العباد مترجم

غلام احمد حریری

یکم مئی ۱۹۶۶ء

ڈی ۶۱ پیپلز کالونی - فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ مصنّف طبع جدید

یہ کتاب پہلی مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ۱۹۵۵ء میں منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ قارئین کرام نے دیکھا کہ یہ کتاب یونیورسٹی میں کی گئی تقاریر و خطبات پر مشتمل ہے۔ یہ لیکچر دقیق قرآنی مباحث و موضوعات سے متعلق ہیں جن کو ایسے آسان علمی انداز میں بیان کیا گیا ہے جو طلبہ و محققین سبھی کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اوسط درجہ کے طلبہ بھی اس کے فہم وادراک سے قاصر نہیں رہتے۔ بنا بریں دینی اور علمی وادبی مدارس اور لائبریریوں میں اس کی مقبولیت چنداں حیرت خیز نہ تھی۔ یہ امر بھی موجب حیرت و استعجاب نہیں کہ ان اداروں نے کتاب مذکور کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور علمی یا دینی یا دونوں محرکات کے پیش نظر اس کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

میں اپنے جی میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ طبع اول کے وقت کتاب کی حیثیت یونیورسٹی تقاریر سے زیادہ نہ تھی جس کا مواد میں نے ان خطبات سے اخذ کیا تھا جو دمشق یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں عربی زبان و ادب کے طلبہ کے سامنے دیے گئے تھے۔ ان اسباق و خطبات کے بارے میں مجھے اس سے زیادہ کچھ توقع نہ تھی کہ تفسیر کے عملی اسباق کی کلید ہونے کے لحاظ سے یہ طلبہ کے ہاتھوں میں موجود رہیں گے اور بوقت ضرورت وہ ان سے استفادہ کر لیا کریں گے۔ اسی لیے میں نے طبع اول کے مختصر مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی۔ کہ ان مباحث میں میں نے جامعیت اور ہمہ گیری کو

نہیں بلکہ سہولت و اختصار کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔ میں نے واشگاف الفاظ میں یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ اس کتاب سے میرا مقصد جدید عربی اسلامی ثقافت کے طلبہ کو علوم کثیرہ متعلقہ قرآن سے آگاہ و آشنا کرنا اور ان کے ذہنوں کے اس جانب مبذول و متوجہ کرنا ہے اور بس!

طبع جدید میں ہر بحث ایک نئے رنگ و روپ میں متشکل نظر آتی ہے۔ جدت طرازی کی بڑی وجہ اگر وہ اضافات اور ملحقات نہ ہوں جو اس میں کیے گئے ہیں تو پھر اس کا بڑا سبب اس کے اسلوب نگارش اور انداز بیان کی سحت و صفائی اور روانی ہو گی۔ میں نے کتاب ہذا میں مندرجہ مباحث کو جس طرز و انداز سے مرتب کیا ہے اس میں بھی قاری ایک انوکھا پن محسوس کرے گا یہ مباحث چار ابواب پر مشتمل ہیں۔ ہر باب میں چند فصلیں ہیں۔ ابواب و فصول میں منطقی ربط و تسلسل پایا جاتا ہے اور ان میں ہر وہ قرآنی مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے جس کا جاننا ہر عرب اور مسلم کے لیے از بس ناگزیر ہے۔

میں نے باب اوّل اور اس کی تین فصلوں کو قرآن و وحی کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے وحی کی توضیح و تشریح میں میں نے زیادہ طوالت سے کام لیا۔ اس لیے کہ قرآنی علوم کے ذکر و بیان کے لیے حقیقت وحی سے متعلق تفصیلات بیان کرنا ایک طبعی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح قرآن کے تدریجی نزول اور اس کے اسرار کے بارے میں بھی میں نے زیادہ طوالت سے کام لیا۔ ہمیشہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ تعلیم و تدریس کے ضمن میں زیادہ گہرائی اور سطحیت کے درمیان ایک معتدل راہ ہی طلبہ کے لیے زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے

دوسرا باب تاریخ قرآن سے متعلق ہے۔ اس کی فصول ثلاثہ میں میں نے قرآن کی جمع و کتابت پر روشنی ڈالی اور مستشرقین و مستغربین کے شکوک و شبہات کی تردید کی ہے۔ جیسا کہ تاریخی دستاویزات میں مذکور ہے میں نے حروف سبعہ کی بحث چھیڑ دی۔ میرا خیال ہے کہ حروف سبعہ کی بحث میں نہایت اہم دینی مسائل و قضایا پائے جاتے

ہیں جن کی بھلائی یا برائی کو جانچنے پرکھنے کے لیے علماء اسلام کا اس جانب توجہ مبذول کرنا ازبس ضروری ہے۔ ان شاء اللہ العزیز یہ غور وفکر بڑے مفید نتائج کا حامل ہوگا۔ اب مذکورہ کی ایک فصل میں جہاں میں نے عثمانی مصاحف میں پیش آمدہ تجوید و تحسین کا ذکر کیا ہے۔ وہاں میں نے قرآن کریم کے رسم الخط اور اس کی عہد بعہد تبدیلیوں کے بارے میں جدید تحقیقات کا اضافہ کیا ہے۔ یہ تحقیقات ان لوگوں کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں جو عربی رسم الخط کی اصلاح چاہتے اور اس میں پیدا شدہ تغیرات کو معلوم کرنے کے درپے ہیں۔

طبع جدید میں اگرچہ باب اول و ثانی میں بہت سے اضافے کیے گئے ہیں۔ تاہم مقابلتہً وہ تیسرے باب کی نسبت قلیل الحجم ہیں۔ تیسرے باب کا موضوع "علوم القرآن" ہے اس میں آٹھ فصلیں ہیں۔ یہ باب اس قدر مفصل ہے کہ تنہا کتاب کے نصف سے زائد حصہ پر مشتمل ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ میری کتاب کا نام "مباحث فی علوم القرآن" ہے۔ لہٰذا اس میں جدت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ علوم قرآنیہ کی تفصیلات کا بیان کرنا ازبس ناگزیر تھا۔

تیسرے باب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ باب نادر تحقیقات اور شافی و کافی اضافات کا گنجینہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس شخص نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن پڑھا ہے وہ ان اضافات کا قدردان ہوگا خصوصاً میں نے ناسخ و منسوخ کے لاینحل اور پیچیدہ مسئلہ پر جو گفتگو کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ طبع اول میں میں نے اس دقیق مسئلہ کو نہیں چھیڑا تھا۔ میں کرۂ ارضی پر رہنے والے تمام علماء کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس بحث کو پورے غور و خوض سے پڑھیں۔ میرے نزدیک اس کے فہم و ادراک میں بڑے مقاصد و فوائد پنہاں ہیں۔ میں اس بحث کے مندرجات پر نقد و تبصرہ کو بھی بڑا مفید خیال کرتا ہوں۔

میں علماء کو "اسباب نزول" اور "مکی و مدنی" نامی دو فصلوں کے مطالعہ کی بھی دعوت دیتا ہوں تاکہ مجھے اپنے زاویۂ نگاہ کے درست یا غلط ہونے کا پتہ چل سکے۔ مذکورہ

فصلوں کے آغاز میں وہ جگہ نمایاں طور پر لائق مطالعہ ہے جہاں میں نے ان مبالغات و مغالطات کا ذکر کیا ہے جن میں اسباب نزول پر تصنیفات لکھنے والے مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور جہاں میں نے کسی آیت کے عام سبب نزول کے پیش نظر کسی خاص واقعہ کو اس کے نزول کا حقیقی سبب قرار دینے سے انکار کیا ہے۔ میرا ذہنی رجحان و میلان اس جانب ہے کہ کسی آیت کے تاریخی سبب اور ادبی سیاق و سباق کو آیات و سورکا باہمی ربط و تعلق بیان کر کے یکجا کر دیا جائے۔ اور آیات کو دوسرے اسباب کی طرف منسوب کیا جاتے ہیں۔ سے کثیر اسباب نزول سے تجاوز کیا ہے اس باب کی آخری فصل ہیں میں قرآن کے چھ مراحل سے بہت دور نکل گیا ہوں۔ ان میں سے تین مراحل ——— ابتدائی متوسط اور آخری ——— مدینہ میں اور تین مکہ میں وقوع پذیر ہوئے۔ ہر مرحلہ اپنے مخصوص موضوعات مثلاً بیان کردہ واقعات و قصص اور الفاظ و فواصل کے زیر و بم کے اعتبار سے دوسرے مرحلہ سے مختلف ہے۔

اس امر کی گنجائش موجود تھی کہ میں تیسرے باب میں تفسیر سے متعلق مسائل بیان کرتا۔ اس لیے کہ عصر تدوین سے لے کر علم تفسیر کے مسائل قرآنی احکام و مسائل میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر میں نے ان کی اہمیت کے پیش نظر ان کو ایک الگ باب میں بیان کرنا زیادہ مناسب خیال کیا اور چونکہ اعجاز القرآن کی بحث ان سے نہایت قریبی مماثلت رکھتی تھی۔ اس لیے اس کو اسی باب میں شامل کر دیا۔ میرے خیال میں قرآن کریم کی وہی تفسیر قابل اعتماد و استفادہ ہو سکتی ہے۔ جس میں قرآنی بلاغت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ کیونکہ کتاب تعداد ندی میں سحر بیانی اور فصاحت و بلاغت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔

میں بہت جلد ایک اعلان کرنے والا ہوں کہ دنیا بھر کے تمام شریعت کالجوں میں ——— خواہ وہ عالی ہوں یا ثانوی ——— قرآن کریم کی تفسیر بیانی (جس میں بلاغت قرآنی کو خصوصی اہمیت دی گئی ہو) کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے

خصوصاً جامعہ ازہر کے اسکولوں و کالجوں اور جامعہ دمشق و بغداد کے دونوں شریعت کالجوں میں تو اس کا احساس بے حد ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بلند پایہ اداروں میں قرآن کریم کے جس فقہی پہلو کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اسے کسی قیمت پر بھی قرآن کریم کے ادبی پہلو پر ترجیح دینا مناسب نہیں۔ جہاں تک قرآن کریم کے فقہی پہلو کا تعلق ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اس لیے کہ تمام اسلامی ادوار میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ قرآن کریم کے فقہی احکام کا فہم و ادراک حاصل کیے بغیر قرآنی ادب میں مہارت حاصل کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔

غالباً اسی امر نے مجھے کو اس بات پر آمادہ کیا کہ میں طبع جدید میں باب چہارم کو تفسیر و اعجاز کے مباحث تک محدود و مقصور رکھوں۔ چنانچہ میں نے فن تفسیر کے آغاز و ارتقاء کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس بات کو کھول کر واضح کر دیا کہ قرآن کی تفسیر قرآن کے ساتھ کیونکر ممکن ہے۔ اور اس کا ربط و تعلق میں نے اعجاز کے موجودہ فنی معنی و مفہوم کے ساتھ قائم کر دیا۔ جہاں جہاں قدیم اصطلاحات مثلاً تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز کے اقسام کا ذکر آیا وہاں ان میں جدت کی روح پھونکنے کو ضروری خیال کیا۔ قرآن کی سحر طرازی اور جادو بیانی کو بدرجۂ اوّل اس کی باطنی تاثیر پر محمول کیا۔ اس اثر آفرینی کے ذکر و بیان کے لیے ایک الگ فصل باندھی۔ اگرچہ قاری اس فصل کو مختصر سمجھے گا اور اس امر کا آرزومند ہو گا کہ کاش یہ زیادہ تفصیلات پر مشتمل ہوتی۔ مگر میری نگاہ میں یہ مختصر فصل اس حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن کریم نے ایک نہایت منفرد اور حیرت خیز اندازِ بیان میں نثر و شعر کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔

مَیں بارگاہِ ربانی میں التماس کناں ہوں کہ اس کتاب میں جو حرف و سطر بھی میں نے تحریر کی اور ان مباحث میں مَیں نے جس زاویۂ نگاہ کی بھی دعوت دی اللہ تعالیٰ

اس کو میرے لیے اپنی رضامندی وخوشنودی کا موجب بنائے اور مجھے فلاح دارین سے نوازے۔ آمین

مصنف
ڈاکٹر صبحی صالح!
بیروت یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ

مترجم
غلام احمد حریری ایم۔ اے
ڈی ــــــ ۶۱
پیپلز کالونی فیصل آباد

مقدمہ

جب میری یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپ کر آئی تو میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھا کہ میں نے ان تمام علوم پر تفصیلی بحث کی ہے۔ جن کا قرآن کے ساتھ دور یا نزدیک کا تعلق ہے۔ اس لیے کہ قرآنی درس و مطالعہ کے اطراف و جوانب نہایت متنوع اور وسیع ہیں۔ قرآن کریم سے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ یا کہا جا سکتا ہے اس کا حق تو ہزاروں جلدوں میں بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ میرا مقصد اس کتاب سے قرآن کے ان بنیادی مسائل کی شرح و توضیح تھی جن کو میں نے متقدمین کی تصانیف سے اخذ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے بعض نیک نہاد معاصرین کی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا اور اس سے غافل نہ رہا۔ اگرچہ طبع چہارم میں میں نے کثرت سے اضافے کیے ہیں تاہم مجھے اس امر کا بخوبی اعتراف ہے کہ میں نے کتاب ہذا میں صرف امہات المسائل سے تعرض کیا ہے اور کسی مسئلہ پر بھی تفصیلی گفتگو نہیں کی۔

دورِ حاضر میں جو شخص قرآن و اسلام سے متعلق مسائل کے بارے میں کوئی تحقیقی کام کرنا چاہتا ہے اس کو قدیم کتب کی طرف رجوع کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ جب کسی شخص کو کسی آیت کی تفسیر و تاویل کسی نظریہ کی توضیح یا کسی قرآنی آیت کے ادبی تجزیہ کے سلسلہ میں قدیم کتب کی طرف مراجعت کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ان کتب میں ایک ہی آیت کی تاویل و تفسیر میں متعارض روایات اور متناقض افکار و آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بنی نوع انسان میں اگرچہ تعارض و تناقض کا وجود ناگزیر ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ہماری قدیم کتب میں یہ بہت بڑا عیب اور بدترین نقص ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیے ہر آیت کی صحیح تفسیر جاننا ضروری ہے۔ اگرچہ ہم ذوق

یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس آیت سے جو منشاء خداوندی تھا اس کو پالیا ہے۔

اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ قرآنِ کریم ہمارے اسلاف کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کو جس توجہ و انہماک کا مستحق سمجھا آج تک کسی کتاب کو اس قابل نہ سمجھا گیا۔ جس چیز کا بھی قرآن سے ادنیٰ تعلق تھا ہمارے اسلاف نے اس کو ضرور پڑھا اس کی حد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عزیز اوقات کو ایسے امور میں بھی صرف کیا جن سے بظاہر قرآن کی کوئی خدمت نہیں ہو پاتی۔ اسلاف کی اس عدیم المثال محنت و کاوش کا تقاضا ہے کہ جن نتائج تک وہ پہنچے ہم ان کو بلا چون و چرا تسلیم کرلیں اور ان کی تصنیفات کے سامنے سرِ نیاز جھکا دیں۔

مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اگر ہم اسلاف کی مساعی کو کافی سمجھ لیتے تو ہم قرآن کی پرکشش سحر طرازی اور جادو بیانی کے چہرے کی نقاب کشائی کے قابل نہ ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم درس و مطالعہ کا طرز و منہاج اس طلب و تحقیق اور جستجو کا ساتھ نہیں دے سکتا جو قرآن کے ہر پہلو کے لیے ناگزیر ہے اور جس کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں بہت سے مکتبہ ہائے فکر قائم ہوئے اور مختلف قسم کے افکار و آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔

اگر ہم متقدمین کی علمی فضیلت کا اعتراف کریں اور یوں کہیں کہ ہم علمی مباحث کی تکمیل میں ان کے دستِ نگر ہیں۔ اور ان کے علمی انوار سے مستنیر ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کے قدیم طرز و انداز پر کچھ اعتراض بھی نہ کرسکیں اور بلا چون و چرا اس کو تسلیم کرلیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخی اعتبار سے ان کا طرز و منہاج دقت و عمق میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ مگر ان کے قرآنی مباحث پر تاریخ کا غلبہ اس حد تک نمایاں ہے کہ قرآن کے ادبی اور فنی پہلو کو اجاگر کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی حالانکہ قرآن کے ادبی پہلو ہی سے نقائص کی تکمیل ہوتی اور سب خلاء پُر ہو جاتے ہیں۔

بخلاف ازیں تاریخ بڑے بڑے حقائق کو مسنوخ و محجوب کر دیتی ہے۔

ہمارے متقدمین علماء نے علوم القرآن کی جو تعریف کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخ کو انہوں نے کس حد تک اہمیت دی ہے۔ علمائے سلف کے نزدیک علوم القرآن مسائل کے اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے نزول کتابت جمع و تدوین تفسیر الفاظ اور بیان خصائص و اغراض سے بحث کی جاتی ہے۔ پھر اس تعریف کے الفاظ کی جو تفصیلی تشریح انہوں نے کی ہے اس سے تاریخ کا غلبہ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ متقدمین نزولِ قرآن کے ابتدائی درمیانی اور آخری مراحل و ادوار کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ تفصیلاً لکھتے ہیں کہ فلاں آیت رات کو آتری اور فلاں دن کے وقت۔ فلاں سورت موسم سرما میں اُتری اور فلاں گرما میں۔ فلاں صلح کے موقع پر اُتری اور فلاں میدان جنگ میں۔ وہ اس ضمن میں اس قدر تفصیلات پیش کرتے ہیں کہ کسی جزئی سے جزئی واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ انفرادی یا اجتماعی مواقع پر بالاقساط جو سورتیں اتریں وہ ان کی تفصیل بیان کرنے سے بھی قاصر نہیں رہے۔ قرآن کریم کی حفاظت و تدوین اس کو مصاحف میں رقم کرنے اس کی کتابت کو خوبصورت بنانے، حروفِ سبعہ کو باوثوق طریقہ سے لکھنے اور قراءتِ متواترہ کو قطعی و یقینی طریقہ سے ثابت کرنے کے سلسلہ میں انہوں نے جو مباحث تحریر کیے ان کی نظیر کہیں تلاش کیے بھی نہیں ملتی۔ نصوص کی تحقیق اور روایات کی چھان بین کے لیے انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تاریخ صحیح کی روشنی میں فیصلہ صادر کرنے کی قوت ان میں سب سے زیادہ تھی۔

مگر متقدمین کی اس عظیم خصوصیت میں ایک نقص بھی پایا جاتا ہے۔ وہ تاریخ میں اس قدر مشغول اور منہمک رہے کہ قرآن کریم کی ادبیت کی جانب کما حقہٗ توجہ نہ دے سکے۔ وہ کئی جگہ اسباب نزول بیان کرتے ہوئے اس کا تاریخی سبب اور ادبی سیاق و سباق بھی بیان کر دیتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ ان دونوں باتوں کو جمع نہیں کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سائل

کے ذہن میں طبعًا یہ سوال اُبھرتا ہے کہ یہ آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی ہے؟ اور طویل زمانی بُعد کے باوصف ایک موضوع کو دوسرے کے ساتھ کس لیے منضم کیا گیا ہے؟ اگرچہ متقدمین کے یہاں روایات کی بھرمار ہے اور انہوں نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ مگر اس سوال کا کوئی شافی جواب ان کے یہاں نہیں ملتا۔

یہی وجہ ہے کہ اسباب نزول کی بحث میں ہم نے ان نازک پیمانوں کو کافی خیال نہیں کیا جو متقدمین نے اسباب نزول کی روایات کو جانچنے پرکھنے اور ترجیح دینے کے لیے وضع کیے ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہم نے ان افکار و نظریات کو بھی بیان کر دیا ہے جو جدید دیگر برگزیدہ محققین کی تفسیروں میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے نظم کی رعایت اور حسنِ ترتیب وغیرہ۔ چنانچہ ہم نے بعض آیات سے استشہاد کرنے میں خاصی طوالت سے کام لیا ہے۔ ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے فنی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے زمانِ نزول کے تصور کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں قرآن کی ہر آیت محکم البناء متصل الاجزاء اور دیگر آیات سے مربوط و متلاحق نظر آتی ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آیا یہ آیت سابقہ آیت کی تکمیل کرتی ہے یا اپنے معنی و مفہوم میں مستقل ہے؟ اور اگر ماقبل سے الگ ہے تو دونوں کے مابین کیا مناسبت پائی جاتی ہے۔

ہم علمائے سابقین کے ثناخواں ہیں کہ انہوں نے آیات کے اصلی اسباب سے تجاوز کر کے ان کو دیگر اسباب کی جانب متعدی کیا۔ اور سبب خاص کے باوجود آیت کے مفہوم کو عام قرار دیا۔ مگر بات یہ ہے کہ قرآن نے زمان و مکان اور اسباب و مناسبات کے تصور سے قطع نظر انسانیت کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں وہ ان کی نگاہ سے اوجھل رہے۔ لہٰذا ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے امکانی حد تک قرآن کے اجنبی پہلو کی خدمت کریں۔ اس کائناتِ ارضی پر جو مشاہد و مناظر پائے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ یہ باتیں ہمیں الہام کرے گا۔

ہر محقق کے نزدیک یہ امر شک و شبہ سے بالا ہے کہ ہمارے متقدمین نے مکی و مدنی سورتوں سے متعلق ہر چیز تفصیلاً بیان کر دی ہے۔ بعض محققین نے مکی و مدنی آیات کو تین مراحل وار ــــــــ ابتدائی۔ درمیانی اور اختتامی ــــــــ میں تقسیم کیا ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ ہمارے اکابر ان مراحل کی تفصیلات میں اس قدر کھو گئے کہ ہر مرحلہ میں وارد شدہ عقائد و احکام کا ذکر کرنا ان کو بالکل یاد نہ رہا۔ اسی طرح انہوں نے الفاظ و فواصل کے اداء و تلفظ اور ان کے صُوَر و مشاہد کے طرز و انداز کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

ہمارا مقصد ان دراسات سے یہ ہے کہ مکی و مدنی سورتوں کی خصوصیات سے متعلق قاری نے جو کچھ پڑھا ہے۔ وہ بچشم خود قرآن میں ان کو ملاحظہ کر سکے۔ ہم نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ جو طالب علم قرآن کریم کی بعض سورتوں کے ادبی و بیانی تجزیہ کا شائق ہے وہ بچشم خود اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بیس سورتوں کے موضوعات و اسالیب پر کھل کر گفتگو کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی نزولی ترتیب کو تاریخی اعتبار سے ملحوظ رکھا ہے۔

جن متقدمین نے ناسخ و منسوخ کی بحث میں عجیب طرح کی مبالغہ آمیزی سے کام لیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ توفیقِ ایزدی ان کے شاملِ حال نہ تھی۔ اس بحث میں انہوں نے بہت سے مفہومات کو باہم خلط ملط کر دیا تھا ان میں سے بہت سے لوگ اس امر میں فرق نہ کر سکے کہ جو چیز خداوند تعالیٰ اور جو انسان کی جانب منسوب ہو دونوں کے مابین کیا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ نسخ اور تخصیص، نسخ اور بداء، نسخ اور انساء، نسخ احکام اور نسخ اخبار کے درمیان فرق نہ کر سکے۔ اُن کے غلو اور مبالغہ نے ہمیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے معجز و متواتر کلام کو ان کے عجیب و غریب اقوال سے جو کسی طرح بھی قرین عقل و منطق نہیں ہیں پاک اور بلند خیال کریں۔

ہمارے اسلاف نے جس طرز و انداز سے اعجاز القرآن کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے بے شک وہ ہمیں پسند ہے۔ مگر اس پسندیدگی کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم ان کے اسلوب بیان سے سرِ مو بھی انحراف نہ کر سکیں اسلاف کے طرز و منہاج سے ہٹ کر ہم قرآنی اسلوب کو بلاغی اصطلاحات کی تنگنائے سے نکال کر ادب کے بلند اُفق تک پہنچانے کے متمنی ہیں۔ چنانچہ اعجاز القرآن کی بحث میں آپ بیانی صورتوں کو اس طرح دیکھیں اور سمجھیں گے کہ ان میں فن کی تروتازگی اور ادب کا گھنا سایہ نمایاں دکھائی دے گا۔ اور ہم اپنے باطنی حواس کے ساتھ قرآن کی داخلی موسیقی کو صاف محسوس کر سکیں گے۔ اس میں نثر کا دقیق و عمیق اظہار و بیان بھی ہو گا اور شعر کے خوش آیند اور نرم و نازک نغمے بھی۔

خلاصۂ کلام! یہ مباحث علوم القرآن سے متعلق ہیں۔ ان کے بارے میں ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ ہر لحاظ سے جامع اور ہمہ گیر ہیں اور ان میں قرآن سے متعلق ہر بات آگئی ہے بخلاف ازیں یہ مباحث چند ضروری مسائل پر مشتمل ہیں جن سے دانستہ یا نادانستہ طور پر بے بہرہ رہنا یا ناواقفیت کا اظہار کرنا کسی عرب کو زیب دیتا ہے جو ضاد کا لفظ بولتا ہو اور نہ مسلم کو جو دین حنیف کا مدعی ہو۔ ہم ان مباحث کا قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں اور بارگاہ ایزدی میں متدعی ہیں کہ ان کے ذریعے ان میں کتاب ربانی کی تلاوت کا شوق پیدا ہو۔ اور وہ اس کے احکام میں غور و فکر کر کے اس کی تعلیمات پر عامل ہوں کچھ بعید نہیں کہ قدیم تاریخ پھر لوٹ کر آجائے اور اس کتاب کی برکت سے ہم اسی طرح "خَيْرَ اُمَّةٍ" بن جائیں جس طرح ہم پہلے ایک بہترین اُمت تھے۔

مترجم
غلام احمد حریری، ایم۔ اے
فیصل آباد

مصنف
ڈاکٹر صبحی صالح
بیروت

باب اوّل

قرآن و وحی

فصل اوّل

اسماءِ قرآن اور ان کا مادۂ اشتقاق

اللہ تعالیٰ نے اپنی ارسال کردہ وحی کے لیے چند جدید نام تجویز کیے ہیں۔ یہ نام عربی کلام کے ناموں سے اجمال وتفصیل کے اعتبار سے مختلف ہیں۔[1] ان القاب و اسماء میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ فلاں نام کیوں رکھا گیا اور اس کا مادۂ اشتقاق کیا ہے ان میں سے دو لقب زیادہ مشہور ہیں۔ (۱) الکتاب (۲) القرآن۔

۱۔ الکتاب:-

الکتاب کے نام سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس کو سطور میں جمع کیا گیا ہے، کتابت حروف کے جمع کرنے اور الفاظ کے لکھنے کو کہتے ہیں۔ القرآن کہہ کر اس کے سینہ میں محفوظ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ القرآن اسی طرح مصدر ہے جیسے القراءۃ قراءت (پڑھنا) سے ایک چیز یاد اور محفوظ ہو جاتی ہے۔ القرآن واضح اور روشن عربی زبان میں اُترا۔ اس کی حفاظت وصیانت کا اس قدر اہتمام کیا گیا کہ یہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ جو لوگ اس کو بازیچہ طفلاں بنانے کے درپے تھے اور اس میں تحریف کرنے کے خواہاں تھے وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو نہ تو باقی کتابوں کی طرح صرف لکھ کر محفوظ کیا گیا۔ اور نہ صرف حفظ کے ذریعہ اس کی حفاظت کا اہتمام ہوا۔ بلکہ کتابت کے ساتھ ساتھ تواترِ اسناد بھی اس کے حصہ میں آئی۔ مزید براں اسناد متواتر کے پہلو بہ پہلو اس کی نقل وروایت میں انتہائی امانت و دیانت کو ملحوظ رکھا گیا۔

---

[1] اتقان سیوطی ج ۱۔ ص ۸۶۔

۲- القرآن :-

قرآن کریم کے یہ دونوں نام (الکتاب - القرآن) آرامی الاصل ہیں - کتابت کے معنی آرامی زبان میں حروف کا لکھنا اور نقش کرنا ہے - قرادت آرامی زبان میں تلاوت کو کہتے ہیں - اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے لیے یہ دونوں نام کس لیے تجویز کیے گئے - وحیِ محمدی کو جملہ مراحل و ادوار میں یہ امتیاز ہمیشہ حاصل رہا کہ اس کے نصوص و تعلیمات کو سینوں اور سفینوں میں جگہ دی گئی -

مگر ان دونوں ناموں میں سے القرآن کے لقب کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی - اس کی حد یہ ہے کہ کتاب ربانی کے لیے قرآن کے لفظ نے ایک شخصی لقب کی حیثیت حاصل کر لی - لہٰذا نہایت موزوں ہے کہ وحی اور قرآن سے متعلق مباحث کو چھیڑنے سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کا لفظ کس سے مشتق ہے - کیونکہ لغات سامیہ میں چند اور الفاظ بھی اس سے ملتے جلتے ہیں - نیز یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے دیگر اہم اسماء کیا ہیں اور ان کا لغوی مفہوم و مدلول کیا ہے - خواہ السنہ سامیہ اور عربی زبان میں ان سے ملتے جلتے الفاظ ہوں یا نہ ہوں -

علماء نے لفظ "القرآن" کے بارے میں مختلف افکار و آراء کا اظہار کیا ہے - چنانچہ بعض اس کو مہموز اور بعض غیر مہموز کہتے ہیں - امام شافعی الفراء[1] نحوی اور اشعری[2] کے نزدیک یہ غیر مہموز ہے - اس ضمن میں اختلافات کا خلاصہ حسب ذیل ہے -

---

[1] الفراء کوفہ کے مشہور نحوی اور ائمہ لغت میں سے تھے - ان کا نام یحییٰ بن زیاد دیلمی اور کنیت ابوزکریا ہے - آپ نے معانی القرآن پر ایک کتاب تصنیف کی ہے ۲۰۷ھ میں فوت ہوئے - (طبقات الزبیدی ص ۱۴۳-۱۴۶ نیز وفیات الاعیان - ج ۲ - ص ۲۲۸) -

[2] امام ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری جن کی طرف اشعریہ فرقہ منسوب ہے - آپ نے اہل بدعت جہمیہ خوارج اور روافض کی تردید پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں ۳۲۴ھ میں فوت ہوئے -

(وفیات الاعیان - ج ۱ ص ۳۲۶)

۱۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ القرآن کا لفظ جس پر تعریف کا الف لام داخل کیا گیا ہے نہ مشتق ہے اور نہ مہموز۔ بلکہ یہ ایک غیر مشتق لفظ ہے اور اس کو اس کلام کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ امام شافعی کے نزدیک یہ لفظ قراءت (پڑھنا) سے ماخوذ نہیں۔ اور اگر قرآن کا مادۂ اشتقاق قراءت کا لفظ ہوتا ہے تو ہر پڑھی جانے والی کتاب کو قرآن کہا جاتا (حالانکہ یہ درست نہیں) امام شافعی کے نزدیک قرآن کتاب الٰہی کا اسی طرح نام ہے جیسے تورات اور انجیل دونوں نام ہیں[1]

۲ الفراء کا قول ہے کہ قرآن قرائن سے مشتق ہے۔ قرائن کا واحد قرینہ (نشان علامت) ہے۔ چونکہ آیاتِ قرآنیہ باہم ملتی جلتی ہیں اس لیے وہ ایک دوسری کے لیے قرینہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرائن میں نون اصلی ہے۔ (اس لیے قرآن قراءت سے مشتق نہیں ہو سکتا)۔[2]

۳ امام اشعری اور ان کے متبعین کا قول ہے کہ قرآن کا لفظ "قَرَنَ الشَّیَٔ بِالشَّیٔ" (ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملا دیا) سے نکلا ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیتیں اور سورتیں باہم ملی جلی ہوتی ہیں[3]

مذکورہ صدر تینوں آراء میں القرآن کو غیر مہموز قرار دینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ قواعدِ اشتقاق اور محاورہ لغت کے اعتبار سے بعید از قیاس ہے۔ جو لوگ قرآن کے لفظ کو مہموز قرار دیتے ہیں ان میں زجاج[4] ۔ لحیانی[5] اور علماء کی ایک جماعت شامل ہے۔

---

[1] تاریخ بغداد از خطیب ج ۲- ص ۶۲- [2] الاتقان سیوطی ج ۱- ص ۸۰-

[3] البرہان- ج ۱- ص ۲۷۸- [4] زجاج کا نام ابراہیم بن السری اور کنیت ابو اسحاق ہے۔ کتاب معانی القرآن آپ کی تصنیف ہے ۳۱۱ھ میں فوت ہوئے (انباہ الرواۃ- ج ۱- ص ۱۶۳)

[5] ابو الحسن علی بن حازم مشہور لغوی تھے ۲۱۵ھ میں فوت ہوئے ابن سیدہ نے اپنی کتاب المخصص کی تالیف میں ان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

۱۔ زجاجؒ کا قول ہے کہ القرآن بروزنِ فعلان مہموز ہے۔ اس کا مادہ القرأ (جمع کرنا) ہے عربی میں بولتے ہیں۔ قَرَءَ الْمَآءَ فِي الْحَوْضِ (حوض میں پانی جمع کیا) قرآن کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں سابقہ کتب کے ثمرات و نتائج کو جمع کیا گیا ہے۔[۱]

۲۔ علامہ اللحیانیؒ کا قول ہے کہ قرآن بروزن غُفران مصدر مہموز ہے۔ اس کا مادہ قَرَءَ (پڑھا) ہے۔ قرآن کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ پڑھا جاتا ہے۔ گویا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے۔[۲]

یہ آخری رائے زیادہ وقیع اور راجح ہے۔ تو گویا قرآن اسی طرح مصدر ہے جیسے قراءت۔ دونوں کے معنی و مفہوم میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا — اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔[۳] — ہم اس کو پڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ پڑھیں۔)

دورِ جاہلیت میں جب عرب "قَرَءَ" کے لفظ سے آشنا ہوئے تو انھوں نے اس کو تلاوت کے علاوہ دوسرے معانی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ بولتے تھے:۔

هٰذِهِ النَّاقَةُ لَمْ تَقْرَءْ سَلًى قَطُّ — اس ناقہ کو حمل نہیں ٹھہرا اور نہ اس نے بچہ جنا۔

مشہور جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے ؎

هِجَانُ اللَّوْنِ لَمْ تَقْرَءْ جَنِيْنًا

(سفید رنگ اونٹنیاں جو ابھی تک حاملہ نہیں ہوئیں)

قَرَءَ کا لفظ جس کے معنی ہیں پڑھا عربوں نے آرامی زبان سے لیا اور اس کو اپنی زبان میں رائج کر لیا۔

---

[۱] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۷۸۔

[۲] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۸۷۔

[۳] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت قرآنی "عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" میں القرآن کے معنی القراءۃ یعنی پڑھنے [illegible] ۱۷-۱۸ -

بقول جی۔ برگسٹراسر (G. BERGSTRAESSER) آرامی حبشی اور فارسی زبانوں نے عربی زبان پر بڑے انمٹ نقوش ثبت کیے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ان اقوام کی زبانیں تھیں جو بڑی متمدن تھیں اور ہجرت سے قبل عرب کے قرب وجوار میں آباد تھیں۔

جب ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ آرامی طرزِ تلفظ بلاد فلسطین و شام دجلہ و فرات کے درمیانی علاقہ اور عراق کے بعض حصہ پر غالب تھا تو اس پر اظہارِ حیرت کرنے اور اس کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہود کی مذہبی زبان آرامی تھی اور وہ عربوں کے پڑوس میں آباد تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرامی زبان کے بہت سے مذہبی الفاظ عربوں میں پھیل گئے۔ مشہور مستشرق کرنکو (KRENKOW) نے لفظ کتاب پر بحث کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اس طرف اشارہ کیا ہے؟ اسی طرح مستشرق بلاشیر (BLACHERE) نے آرامی سریانی اور عبرانی زبانوں کے بہت سے مذہبی الفاظ کا ذکر کیا ہے جن کو عرب یہودیوں اور دیگر اہل مذاہب کی دیکھا دیکھی استعمال کرنے لگے تھے۔

مندرجہ ذیل الفاظ بھی ان میں شامل ہیں۔

قرء۔ کتب۔ کتاب۔ تفسیر۔ تلمیذ۔ فرقان۔ قیوم۔ زندیق۔

خلاصۂ کلام یہ کہ لفظ قرء اپنی اصل کے اعتبار سے آرامی تھا۔ عربوں نے ظہور اسلام سے قبل اس کو تلاوت کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عربوں نے اس کو معرب بنالیا تھا اور اس لیے کتاب ربانی کو قرآن سے موسوم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ فرقان :۔

قرآن کریم کے ناموں میں سے فرقان بھی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ	وہ ذات بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر
عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝	فرقان نازل کیا، تاکہ وہ سب جہانوں کے لیے ڈرانے

(سورۃ الفرقان آیت ۱) والاتحو۔

فرقان کا لفظ آرامی الاصل ہے۔ اس کے مادہ میں تفرقہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ فرقان کے نام سے اس جانب اشارہ کیا کہ یہ کتاب حق و باطل کے مابین حدّ فاصل ہے، اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہے۔

۴۔ الذکر

قرآن کریم کا ایک نام الذکر بھی ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنٰهُ۔ — اور یہ مبارک ذکر ہے جس کو ہم نے نازل کیا۔ (سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۵۰)

ذِکر خالص عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی عظمت و شرافت کے ہیں۔ قرآن میں فرمایا:۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ۔[51] — ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی جو تمہارے لیے باعث عظمت و شرف ہے۔

۵۔ تنزیل

قرآن کا ایک نام التنزیل بھی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔[52] — یہ سب جہانوں کے پروردگار کا نازل کردہ ہے۔

یہ خالص عربی نام ہے۔ اس نام سے قرآن کا وحی ہونا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نازل ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے مذکورہ صدر اسماء بہت زیادہ مشہور ہیں۔ بعض علماء نے قرآن کریم کے ناموں میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ علامہ زرکشی نے قاضی شیذلہ[53] سے نقل کر کے پچپن ۵۵

---

[51] سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۱۰۔ [52] سورۃ الشعراء آیت نمبر ۱۹۲۔

[53] شیذلہ شافعی المسلک فقیہ تھے۔ نام عزیزی بن عبداللہ اور کنیت ابوالمعالی ہے۔ ان کی کتاب کا نام "البرہان فی مشکلات القرآن" ہے۔ ۴۹۴ھ میں وفات پائی (وفیات الاعیان ج ۱۔ ص ۳۱۸ و شذرات الذہب

نام گنائے ہیں۔ دراصل تو موصوف نے قرآن کے اسماء و القاب کو ایک چیز سمجھ لیا ہے۔ اور ان میں فرق نہیں کیا۔ مثلاً قرآن کا ایک نام "العلی" بھی ہے۔ کیونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے:۔

وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ [1]

اور وہ (قرآن مجید) ہمارے پاس لوحِ محفوظ (میں مکتوب ہے) وہ بہت بلند اور دانائی کا مخزن ہے۔

۶۔ المجید

قرآن کریم کا ایک نام مجید بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ [2]

بلکہ وہ قرآن مجید ہے۔

۷۔ العزیز

قرآن کریم کو عزیز بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا:۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ [3]

یہ کتاب عزیز ہے۔

۸۔ العربی

قرآن کریم کا ایک نام العربی بھی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:۔

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا [4]

عربی قرآن کریم۔

بعض علماء نے قرآن کریم کے نوشتے سے زائد نام ذکر کیے ہیں [5]۔

---

[1] سورۂ الزخرف آیت ۴ (البرہان ج ۱۔ ص ۲۷۴)

[2] سورۂ البروج آیت ۲۱ (البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۷۶)

[3] سورۂ فصلت آیت ۴۱ (البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۷۶)

[4] سورۂ الزمر آیت ۲۸ (البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۷۵)

[5] علامہ حرالی کا نقطۂ نگاہ یہی ہے۔ دیکھیے البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۷۳۔ حرالی حرالہ نامی گاؤں کی جانب منسوب تھے۔ یہ گاؤں مرسیہ کے گرد و نواح میں واقع تھا۔ ان کا نام علی بن احمد بن حسن التجیبی اور کنیت ابو الحسن ہے سنہ [illegible] میں وفات پائی (النجوم الزاہرہ۔ ج ۶۔ ص ۳۱۷ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۱۸۹)

قرآن کریم کی تعریف

قرآن کو کسی نام سے یاد کیا جائے اس کی جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ "قرآن وہ کلام معجز ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کیا گیا۔ جسے صحیفوں میں لکھا جاتا ہے اور جو آپ سے بتواتر منقول ہے۔ اور جس کی تلاوت عبادت کا درجہ رکھتی ہے" قرآن عزیز کی مذکورہ صدر تعریف علمائے اصول و عربیت اور فقہاء کے مابین تسلیم شدہ ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

فصل دوم

وحی کا مفہوم

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نرالے رسول نہ تھے۔ اسی طرح آپ کی دعوت بھی باقی انبیاء سے کوئی الگ تھلگ چیز نہ تھی۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر خدا کے چیدہ و برگزیدہ بندے لوگوں کو خدا کا پیغام سناتے چلے آئے تھے۔ ان کی اپنی خواہشات کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ جو وحی ان پر نازل ہوئی اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی تائید و حمایت سے نوازا۔ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ وحی سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھی۔ سب انبیاء پر نازل شدہ وحی ہر لحاظ سے بالکل ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ وحی کا مصدر و ماخذ بھی ایک ہے اور اس کی غرض و غایت بھی متحد[1]۔ (اس لیے وحی کے مختلف النوع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی کی جیسے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی طرف کی، اور حضرت ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب ان کی اولاد اور حضرت عیسیٰ و ایوب و یونس و ہارون اور سلیمان کی طرف اور ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کیا۔ ہم نے بعض رسولوں کا ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہم کلامی بخشا۔"[2]

---

[1] تفسیر طبری۔ ج ۶۔ ص ۲۰۔

[2] سورۃ النساء آیت نمبر ۱۶۳ و ۱۶۴۔

مذکورہ صدر آیت میں جن انبیاء کے اسماء مذکور ہیں وہ بنی اسرائیل کے مشہور نبی تھے۔ جو اہل کتاب حجاز کے گرد و نواح میں آباد تھے وہ عام طور سے ان انبیاء کے اخبار و احوال سے آگاہ تھے۔[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر جو کلام نازل کیا گیا اس کو وحی کہتے ہیں۔ انبیاء سابقین پر نازل شدہ تعلیمات کا نام بھی وحی ہے۔ اس طرح وحی کا معنی و مفہوم جملہ انبیاء کے مابین مشترک چلا آتا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ قرآن میں فرمایا:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝[2]	(وہ (رسول کریم) اپنی مرضی سے نہیں بولتا وہ تو صرف وحی الٰہی کی زبان ہے۔)

نیز فرمایا:-

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ[3]	آپ فرما دیں کہ میں اپنی مرضی سے اس کو تبدیل نہیں کر سکتا میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف کی جاتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي[4]	آپ فرما دیں کہ میں تو اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف بھیجی جاتی ہے

جو لوگ وحی کے بارے میں اظہار حیرت کرتے تھے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:-

"کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک شخص پر وحی نازل کی کہ لوگوں کو ڈرائیں اور ایمان والوں کو اس بات کی خوشخبری دیں کہ ان کو اُن کے رب کے نزدیک پورا مرتبہ ملے گا۔ کافروں نے کہہ دیا کہ یہ تو ظاہر جادوگر ہے"۔[5]

---

[1] الوحی المحمدی - ص ۳۱ -
[2] سورۃ النجم -
[3] سورۂ یونس آیت نمبر ۱۰ -
[4] الاعراف آیت نمبر ۷ -
[5] سورۂ یونس آیت نمبر ۲ - نیز تفسیر المنارج ۱۱ ص ۱۴۳ -

کیا عقل و منطق اس بات کی تائید کر سکتی ہے کہ چونکہ اس کائنات پر بسنے والے انسان ہونے میں برابر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو بھی علم و ایمان اور حکمت کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتا؟ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہے، عقل انسانی اس بات کو ایک اعجوبہ کیونکر قرار دے سکتی ہے کہ اس حیرت خیزی کا مذاق اڑایا جائے اور اہل کفر اس کو جادوگری سے تعبیر کرنے لگیں؟

خلاصہ یہ کہ جس وحی پر حیرت و استعجاب کے اظہار کی کوئی وجہ نہیں وہ نہایت آسان ہونی چاہیے۔ اور اس میں کوئی دشواری اور پیچیدگی نہیں ہونی چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دینی اعتبار سے وحی کی حقیقت کیا ہے؟ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ وحی اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی وحی میں کس حد تک مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے؟

جب دین اسلام میں نہایت پوشیدہ اور تیزی سے اطلاع دینے کو وحی کے نام سے موسوم کیا گیا تو اس میں وحی کے لغوی معنی کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بلکہ وحی اور ایحاء کے لغوی معنی کو اصطلاحی وحی میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

چنانچہ انسان کو جو فطری الہام ہوتا ہے اس کو بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ[1]	ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ اس کو دودھ پلاؤ۔

نیز فرمایا:۔

"اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلمان ہیں"[2]

---

[1] سورۃ القصص آیت نمبر ۷۔

[2] المائدہ آیت نمبر ۱۱۱

حیوانات کو جو طبعی الہام ہوتا ہے اس کو بھی قرآن میں وحی کہا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ — اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں
اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ — یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا لے
مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ[1] — اور درختوں میں اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں

رمز و ایماء کے طور پر جلدی سے جو اشارہ کیا جاتا ہے اس کو بھی وحی کہتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ — محراب سے نکل کر اپنی قوم کو اشارہ کیا کہ صبح و
فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا[2] — شام تسبیح بیان کرتے رہا کرو۔

اس آیت کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے کہ حضرت زکریاؑ نے جلدی سے اشارہ کر دیا تھا اور زبان سے کچھ نہیں بولا تھا۔ اعضاء سے اشارہ کرنے کو بھی وحی کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

نَظَرْتُ اِلَیْهَا نَظْرَةً فَتَحَیَّرَتْ — دَقَائِقُ فِكْرِیْ فِیْ بَدَائِعِ صِفَاتِهَا[3]
فَاَوْحٰی اِلَیْهَا الطَّرْفُ اَنِّیْ اُحِبُّهَا — فَاَثَّرَ ذَاكَ الْوَحْیُ فِیْ وَجَنَاتِهَا

میں نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کی عجیب و غریب صفات کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آنکھ کے اشارہ سے میں نے اسے بتایا کہ میں اسے چاہتا ہوں اور اشارہ نے اس کے رخساروں کو متاثر کر دیا۔

شیطان جو وسوسہ انسانی ذہن میں ڈالتا ہے اور بُرے خیالات کو حسن آراستہ پیراستہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کو بھی وحی سے تعبیر فرمایا ہے قرآن میں فرمایا

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا — اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے جن و انس

---

[1] النحل آیت ۶۸۔ نیز اساس البلاغۃ۔ ج ۲ ۔ ص ۴۹۶۔
[2] سورہ مریم آیت نمبر ۱۱۔ [3] مفردات راغب اصفہانی۔

شَیٰطِیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ۔[۱]

کے شیطانوں کو اس کا دشمن بنایا وہ باہم ایک دوسرے کو بُرے خیالات کی تلقین کرتے ہیں۔

نیز فرمایا:۔

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ۔[۲]

اور شیطان اپنے دوستوں کی طرف وحی کرتے ہیں تاکہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں۔

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو جو احکام دیتے ہیں ان کو بھی وحی فرمایا:

قرآن میں فرمایا:۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَی الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ۔[۳]

جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اطلاع دیتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

اللہ تعالیٰ فرشتہ کو جو پیغام نبی تک پہنچانے کے لیے دیتے ہیں اس کو بھی وحی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح وحی کی نسبت بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی پیغمبر کی طرف کی جاتی ہے۔ یہ دونوں وحی ہیں اور ان کے مفہوم میں چنداں فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا فرشتے کا کام یہ ہے کہ جو امانت اُسے تفویض کی گئی ہے وہ بکمال احتیاط اُسے نبی تک پہنچا دے اس کے بعد نبی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس پیغام کو سُن کر یاد کرے اور آگے لوگوں کو اس سے آگاہ کر دے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی۔[۴]

پھر اپنے بندے کی طرف وحی کی جو کرنی تھی۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے امین فرشتے جبریلؑ کی طرف وحی کی اور جبریل نے من و عن وہ پیغام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا۔ اس آیت میں وحی سے

---

[۱] الانعام آیت نمبر ۱۱۲۔
[۲] الانعام آیت نمبر ۱۲۱۔
[۳] الانفال آیت نمبر ۱۲
[۴] النجم آیت نمبر ۱۰۔

وہی تنزیل مراد ہے جس کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

"یہ رب العالمین کا اُتارا ہوا ہے۔ اسے جبریل امین نے آپ کے دل پر اس لیے اُتارا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں"[۱]

البتہ قرآن جب اصطلاحی وحی کے مفہوم میں اس کے لغوی معنی یعنی بسرعت تمام پوشیدہ طور سے آگاہ کرنے کو ملحوظ رکھتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آسمانی کتب کو بوساطتِ فرشتہ اُتارنے سے وہ غیبی اور پوشیدہ تعلق جو اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندوں کے درمیان ہوتا ہے کمزور پڑ جاتا ہے۔ بخلاف ازیں ایک آیت میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ وحی کی حسبِ ذیل تین صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) معنی و مفہوم کو نبی کے دل پر القاء کیا جاتا یا اس کے دل میں پھونک دیا جاتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نبی سے بے حجابانہ ہم کلام ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو درخت کے پیچھے سے پکارا اور انہوں نے خدا کی پکار سُنی۔

(۳) وحی کا تیسرا مفہوم عام طور سے معروف ہے۔ جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو ہر دیندار آدمی اس سے یہ مفہوم سمجھ لیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کا فرستادہ فرشتہ اس کے پیغام کو لے کر نبی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ فرشتہ بعض اوقات انسانی صورت میں حاضر ہوتا ہے اور بعض دفعہ اپنی اصلی صورت میں۔ مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں وحی کی انہی تین صورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ کسی بشر سے ہم کلام نہیں ہوتے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ	مگر بذریعہ وحی یا پسِ پردہ یا کسی فرستادہ
يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا	کو بھیج کر وہ اس کے حکم سے جو چاہتا ہے

[۱] الشعراء آیت نمبر ۱۹۲-۱۹۵۔

إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ [1] — وحی کرتا ہے وہ بہت بلند اور صاحب حکمت ہے

مذکورہ صدر آیت سے واضح ہوتا ہے کہ وہ خفیہ اور سریع اعلام (آگاہ کرنا) جس کو وحی کہتے ہیں، اس کی چند صورتیں ہیں۔ یہ صورتیں بظاہر مختلف ہیں مگر خفا اور سرعت کا مفہوم وحی کے لیے استعمال شدہ تمام قدیم و جدید الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی اصطلاح میں سب انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کا مفہوم متحد ہے۔

اتحادِ وحی کے قرآنی نظریہ سے آگاہ ہونے کے بعد جب ہم قرآن کریم کی ڈکشنری[2] پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس میں وحی کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہ قرآن کی مصطلح وحی سے بالکل مختلف ہے اور دونوں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے مذکورہ صدر ڈکشنری میں وحی کی حسب ذیل تعریف کی گئی ہے۔

"وحی کا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے کو کسی بات کا اس طرح الہام ہو کہ خدا کی روح اس میں حلول کر جائے اور وہ روحانی حقائق اور غیبی خبروں سے بخوبی آگاہ و آشنا ہو جائے۔ مگر اس وحی کے باوصف اس کی شخصیت بھی قائم رہے اور وہ اپنے اسلوب و انداز کے مطابق کام کرتا رہے"۔

ہم نے اس تعریف کو اس لیے افسوسناک کہا ہے کہ اس تعریف کے مطابق وحی کا تعلق زیادہ تر اس کشف و الہام کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جس کی عمدہ ترین قسم الہامی شعراء اور عارفین صوفیاء کے یہاں ملتی ہے، اور اس کی بدترین انواع و اقسام کاہنوں اور نجومیوں کے ہاں دیکھنے میں آتی ہیں جو پرلے درجہ کے جھوٹے اور دجال ہوتے ہیں۔ اس تعریف کے پیش نظر وحی کا اصلی تصور جو تعلق باللہ اور ذاتِ خداوندی سے اخذ و استفادہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ذہن سے دور ہو جاتا ہے۔

---

[1] الشوریٰ آیت نمبر ۵۱۔

[2] قرآن کریم کی یہ ڈکشنری ڈاکٹر جارج پوسٹ نے تحریر کی تھی۔ یہ بیروت میں ۱۸۹۴ء میں طبع ہوئی۔

یہ بات ہمارے لیے ایک دینی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہم کشف الہام حدس باطنی شعور، بالاشعور، داخلی اور اس قسم کے الفاظ سے احتراز کرنا چاہتے ہیں جن کو ہمارے مہذب نوجوان حقیقی یا جعلی عجمیوں کی پیروی میں اندھا دھند استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے کلمات کو بے محل استعمال کرنے سے التباس اور حق پوشی کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے۔ ایسے الفاظ کو استعمال کر کے ہمارا نوجوان طبقہ بکمالِ سادگی انبیاء علیہم السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ وحی کی تشریح و توضیح کرنا چاہتا ہے۔

جو شخص بھی کشف کا مدعی ہے۔ ہم آسانی سے اس کو کشف کا مفہوم سمجھا سکتے ہیں اور اس پر یہ حقیقت الم نشرح کر سکتے ہیں۔ کہ کشف و وحی دونوں ایک چیز نہیں۔ جہاں تک کشف کا تعلق ہے اس کی دلالت اپنے مفہوم پر واضح اور متعین نہیں ہوتی۔ کشف اکثر اوقات محنت و مشقت روحانی ریاضت یا طویل سوچ بچار کا ثمرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشف کے ذریعہ نفس انسانی میں نہ یقین کامل پیدا ہوتا ہے اور نہ مکمل شک و شبہ۔ بخلاف ازیں کشف ایک شخصی اور ذاتی معاملہ ہوتا ہے اور وہ کسی بلند پایہ ماخذ و مصدر سے حقیقت کو حاصل نہیں کرتا۔

عارفین کا کشف ہو یا واصلین کا الہام یہ ایک قسم کا نفسانی وجدان ہے جس کا مرتبہ مقام یقین سے بہر حال کم ہے۔ نفس انسانی مصدر حقیقی کا شعور حاصل کیے بغیر خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ذوق و وجد کی فراوانی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ان افسانوں کی آماج گاہ بنتا چلا جاتا ہے۔ جو یونانیوں کے یہاں شعر کی دیوی اور جاہلی عربوں میں شیاطین شعر سے متعلق رائج تھے۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ کشف و الہام کے الفاظ علم النفس کی جدید

---

[1] امام محمد عبدہ نے اپنی کتاب "رسالۃ التوحید ص ۱۰۸ پر لکھا ہے کہ الہام ایک قابل یقین وجدان کا نام ہے۔ مگر ہم ان کے ساتھ اس امر میں متفق نہیں ہیں۔

انتہ امامت میں سے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ کشف والہام کو مانتے ہیں، وہ بھی ان کے مفہوم کو واضح نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ الفاظ لاشعور کے نہاں خانہ میں جاگزیں رہتے ہیں۔ اور لاشعور تو اپنے نام کی طرح لاشعور ہوا جو عقل و شعور سے کوسوں دُور ہے۔

جب کسی انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اربابِ کشف والہام میں سے ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ وحی اور نبوت کے منصب پر فائز ہو گیا اس لیے کہ وحی و نبوت میں شعور و احساس کا معنی و مفہوم پایا جاتا ہے[1] (بخلاف ازیں کشف والہام کی بنیاد لاشعور اور عدم احساس پر رکھی گئی ہے)۔ لاشعور سے اس شخص کو متہم کیا جاتا ہے جس میں شعور کا فقدان ہو۔ اور عدم احساس کا عیب اس شخص پر عاید کیا جاتا ہے جس میں شعور و ادراک نہ پایا جاتا ہو۔

ظاہر ہے کہ دینی حقائق اور غیبی اخبار و واقعات وحی کے باب میں ایسے لاشعوری اسالیب و اطوار کے تابع نہیں ہوتے جن سے ذہانت و فطانت اور حدس باطنی پر جہالت کے پردے پڑ جائیں۔ اسی طرح جیسے دینی حقائق حواسِ ظاہری کے ان پیمانوں کو تسلیم نہیں کرتے جو منطقی دلائل اور گھٹیا قسم کے استنباط کی اساس پر نامعلوم اشیاء کو ٹھکرا دیتے ہیں[2]۔

احادیثِ صحیحہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب مبارک پر نزولِ وحی کی کیفیت کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں :-

"بعض اوقات نزولِ وحی کے وقت مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ میرے لیے بہت سخت ہوتی ہے۔ جب یہ کیفیت دُور ہوتی ہے۔ تو جو کچھ مجھے بتایا گیا ہوتا ہے مجھے یاد ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات فرشتہ انسانی صورت میں آکر بات چیت کرتا ہے۔ اور اس سے سُن کر میں یاد کر لیتا ہوں[3]۔"

---

[1] الظاہرۃ القرآنیۃ۔ ص ۱۳۹۔
[2] دیکھیے النبأ العظیم ص ۴۳۔
[3] صحیح بخاری باب بدء الوحی ج ۱ ص ۲۔ یہ حدیث حارث بن ہشام نے روایت کی ہے۔

مذکورہ صدر حدیث میں آپؐ نے وحی کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں ۔

(۱) وحی کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک گراں بار قول (قول ثقیل) آپ کے دل پر القاء کیا جاتا تھا ۔ ایسی وحی کے نزول کے وقت آپ گھنٹی کی سی مسلسل آواز سنا کرتے تھے[1]

(۲) وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ جبریل ایک انسان کی صورت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ۔ اس صورت میں آپ مطمئن رہا کرتے تھے اور ہراساں یا مرعوب نہیں ہوا کرتے تھے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ وحی کی پہلی صورت آپ کے لیے زیادہ گراں اور دشوار ثابت ہوتی تھی ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ہم آپ پر ایک گراں بار قول القاء کریں گے ۔[2]

جب آپ پر وحی کی یہ کیفیت طاری ہوتی تو پیشانی مبارک پسینہ سے شرابور ہو جاتی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :۔

"سخت سردی کے دن آپ پر وحی نازل ہوتی ۔ جب فارغ ہوتے ، تو پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا[3]"

وحی کی مذکورہ صدر صورت بعض اوقات اس حد تک شدت اختیار کر جاتی کہ جب حالتِ سواری میں یہ کیفیت طاری ہوتی تو سواری کا جانور بوجھ تلے دب کر بیٹھ جاتا ۔ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ران زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر رکھے ہوئے تھے کہ وحی نازل ہوئی ۔ حضرت زید پر اس قدر بوجھ پڑا کہ ان کی ران ٹوٹنے لگی[4]

وحی کی دوسری صورت مقابلتہً زیادہ خفیف اور آسان تھی ۔ اس صورت میں نہ

---

[1] اس ضمن میں امام خطابی کی رائے ملاحظہ کیجیے جس کو سیوطی نے الاتقان ۔ ج ۱ ۔ ص ۱ ۔ پر نقل کیا ہے

[2] سورۃ المزمل آیت نمبر ۴ ۔ [3] صحیح بخاری ۔ ج ۱ ۔ ص ۱ ۔

[4] زاد المعاد ابن القیم ج ۱ ۔ ص ۲۵ ۔

آوازوں کا تسلسل ہوتا اور نہ پیشانی سے پسینہ بہتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ملاقاتی (جبریل امین) کے مابین صُوری مشابہت و مماثلت حضرت جبریل اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے کام میں آسانی پیدا کر دیا کرتی تھی۔

وحی کی دونوں صورتوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی کوشش یہ ہوتی کہ پیغامِ خداوندی کو اچھی طرح ازبر اور ذہن نشین کر لیں۔ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ آنحضورؐ کے اعتراف سے واضح ہوتا ہے کہ وحی سے قبل و بعد آپ کے ہوش و حواس بالکل بجا ہوتے تھے نیز یہ کہ حالتِ وحی میں بھی آپ کے فہم و ادراک میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وحی کیسی بھی ہو۔

اس کامل احساس و شعور کے باوصف جتنی مدت آپ پر قرآن کریم نازل ہوتا رہا آپ نے اپنی شخصیت کو بحیثیت ایک مامور انسان ہونے کے جو وحی سے استفادہ کر رہا تھا وحی کے آمر اور بلند پایہ شخصیت کے ساتھ مخلوط نہ ہونے دیا یہ احساس ہر وقت آپ کے ذہن و قلب پر چھایا رہا کہ خدا کے سامنے آپ ایک کمزور مخلوق ہیں اور اس بات سے خائف اور ہراساں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور ان کے دل کے مابین حائل نہ ہو جائے۔ آپ بڑے عجز و نیاز کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں دعا فرمایا کرتے تھے۔

"اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنی عبادت کی طرف موڑ دے۔ اے دلوں کو موڑنے والے خدا میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ"

جب پہلے پہل آپ پر وحی نازل ہوئی تو آیت کے کچھ حصہ کے ضائع ہو جانے کے خوف سے وحی مکمل ہونے سے پہلے ہی آپ جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ اور اپنی زبان مبارک اور لبوں کو ہلاتے جاتے تھے تاکہ وہ الفاظ بھول نہ جائیں۔ جبریل جو لفظ پڑھاتے آپ ان کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے[1] اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو مختلف الفاظ

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر و کتاب التوحید۔

میں تقسیم کر کے اس کا یاد کرنا آپ پر آسان کر دیا[1] اور آپ سے مندرجہ ذیل وعدہ کر کے آپ کو مطمئن کر دیا۔ قرآن کریم میں فرمایا :۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ط اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔[2]

قرآن کے ساتھ جلدی کرنے کے لیے اپنی زبان نہ ہلائیں۔ اس کو (آپ کے سینہ میں) جمع کرنا اور پڑھانا اور پھر اس کو واضح کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جلد بازی سے جس کی کوئی وجہ نہ تھی منع کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۔[3]

قرآن کریم کی وحی کی تکمیل سے پہلے اس کے ساتھ جلدی نہ کیجیے اور یوں کہیے کہ اے میرے پروردگار میرا علم بڑھا دے۔

جو شخص ایسی آیاتِ قرآنیہ تلاوت کرتا ہے جو خدا کے حضور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کمزور انسان کی حیثیت میں پیش کرتی ہیں۔ کہ آپ خدا سے طالبِ اعانت و ہدایت ہوتے مغفرت مانگتے خدا کے احکام کو واشگاف الفاظ میں لوگوں تک پہنچاتے اور بعض اوقات عتابِ الٰہی کو بھی گوارا کرتے ہیں۔ تو ایسا شخص اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ فیضِ وجدانی پائے گا جس کی بناء پر وہ خالق و مخلوق کے غیر متناہی فرق کو محسوس کرنے اور ان کی ذات و صفات کے فرق و امتیاز کو بخوبی سمجھنے لگے گا۔

قرآن کریم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اطاعت شعار اور وفاکیش بندے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ جو نافرمانی کرنے کی صورت میں عذاب خداوندی سے ڈرتا ہے

---

[1] النباء العظیم ص ۲۵-۲۶۔
[2] سورۃ القیامۃ آیت نمبر ۱۶-۱۹۔
[3] سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ۱۱۴۔

اس کی حدود کا پابند اور اس کی رحمت کا اُمیدوار ہے۔ وہ اس حد تک عاجز ہے کہ کتاب خداوندی کے ایک حرف کو بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :-

"جب ہماری روشن آیات اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے، کہتے ہیں اس کے سوا کوئی اَور قرآن لے آ، یا اس کو تبدیل کر دو۔ آپ فرما دیں میں اپنے طور پر اس کو تبدیل نہیں کر سکتا میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کے ذریعے بھیجی جاتی ہے۔ اور اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے روز قیامت کے عذاب کا ڈر ہے۔ آپ فرما دیں کہ اگر اللہ چاہتا تو میں نہ اُسے تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ اس کے معنی و مفہوم سے تم کو آگاہ کرتا میں قبل ازیں عرصہ دراز تک تم میں رہ چکا ہوں، کیا تم عقل و شعور نہیں رکھتے؟"[۱]

بشریتِ رسولؐ :

قرآنی آیات میں یہ مضمون بار بار دہرایا گیا ہے کہ خالق و مخلوقات کی صفات یکساں نہیں ہیں۔ قرآن میں صراحتہً بتایا گیا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان تھے اور آپ کا فرضِ منصبی صرف احکام خداوندی کو لوگوں تک پہنچانا تھا اور بس۔ آپ غیب دان تھے نہ خداوندی خزانوں کے مالک تھے۔ آپ اس بات کے بھی دعویدار نہ تھے کہ مجھ میں فرشتوں کے سے اوصاف پائے جاتے ہیں جو عام انسانوں میں نہیں ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	آپ فرما دیں کہ میں تو تمہاری طرح کا ایک
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ	انسان ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے اور

[۱] سورۂ یونس آیت ۱۵:۱۶۔

وَّاحِدٌ۔ — تمہارا معبود تو صرف ایک معبود ہے۔

نیز فرمایا:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ[۲]

آپ فرمادیں کہ میں اپنے آپ کے لیے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ تعا چاہے اور اگر میں غیب دان ہوتا تو بہت سا مال جمع کر لیتا اور مجھے تکلیف نہ پہنچتی

ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓى اِلَیَّ[۳]

آپ فرمادیں میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ میں غیب نہیں جانتا اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کے ذریعے میری طرف بھیجی جاتی ہے۔

مذکورہ صدر آیات کو "قل" (آپ فرمادیں) کے لفظ کے ساتھ شروع کر کے اس جانب اشارہ کیا کہ آپ یہ باتیں اپنی مرضی سے نہیں کہہ رہے۔ آپ مخاطب ہیں متکلم نہیں ہیں آپ کو تعلیم دی جارہی کہ آپ یوں فرمادیں۔ اس لیے آپ کی مرضی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں "قُل" کے لفظ کو تین سو سے بھی زیادہ مرتبہ دہرایا گیا ہے تاکہ قاری میں یہ احساس پیدا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کو خود نہیں بناتے بلکہ الفاظ آپ پر نازل کیے جاتے ہیں اور آپ ان کو دوسروں تک بلا کم و کاست پہنچا دیتے ہیں۔ اپنے ذاتی افکار و خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔

---

[۱] سورۃ الکہف آیت نمبر ۱۱۰۔ [۲] سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۸۸۔
[۳] سورۃ الانعام آیت نمبر ۵۰۔

انبیاء پر عتابِ خداوندی کا نزول:

جن آیاتِ مقدسہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر معمولی یا شدید عتاب کیا گیا ہے یا آپ کی غلطی سے عفو و درگزر کا ذکر کیا گیا ہے ان سے وحی کے نازل کرنے والے خدا اور وحی سے سبق حاصل کرنے والے رسول کا فرق بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ عتابِ خفیف کی مثال جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ سے معاف کر دیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چند صحابہ کو غزوۂ تبوک میں شامل نہ ہونے کی اجازت دینا تھا۔

قرآن میں فرمایا:-

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ	خدا نے آپ کو معاف کر دیا۔ آپ نے ان
لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ	کو کیوں اجازت دی۔ یہاں تک کہ آپ کے
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ	لیے وہ لوگ واضح ہو جاتے جنہوں نے سچ
الْكٰذِبِيْنَ ؁	بولا تھا اور آپ جھوٹوں کو بھی جان لیتے۔

اس آیت میں عفو کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عفو اور مغفرت یعنی معافی اور بخشش کسی گناہ ہی سے ہوتی ہے۔

سورۃ الفتح میں صراحتہً فرمایا گیا ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ	ہم نے آپ کو واضح فتح عطا کی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ
اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ؂	آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔

مذکورہ صدر قرآنی تصریح کے بعد حیرت ہے کہ بعض مفسرین ——— مثلاً امام رازی کہتے ہیں کہ عفو کے لیے گناہ کا ہونا ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر ترکِ اَولیٰ کی وجہ سے عتاب نازل کیا۔ بقول سید رشید رضا مفسرین کے اس تکلف کی وجہ یہ ہے کہ وہ

۱؎ التوبۃ آیت ۴۳۔

۲؎ سورۃ الفتح آیت ۱-۲-

اپنی مخترعہ اصطلاحات کو کسی قیمت پر ترک نہیں کرنا چاہتے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ "ذنب" (گناہ) نافرمانی کو کہتے ہیں اور نبی سے نافرمانی کا صدور نہیں ہو سکتا حالانکہ کتاب خداوندی میں ثابت کردہ امر کو چھوڑ کر اپنی اصطلاحات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا، خصوصاً جب کہ ان کی وضع کردہ اصطلاح قرآن کریم اور لغت دونوں کے خلاف ہے[1]

عتاب شدید کی مثال مذکورہ ذیل آیت ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ	نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں
أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ	جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح خونریزی نہ کرلیں
تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ	تم تو دنیا کا مال و اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ
يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ	آخرت کو چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست
حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ	بڑی حکمت والے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کا ایک نوشتہ
سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ	مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے
عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝[2]	اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔

مذکورہ بالا آیۃ الفداء شدید عتاب اور عذاب کی دھمکی پر مشتمل ہے۔ اس عتاب کے مخاطب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ صحابہ ہیں جنہوں نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کا مشورہ دیا۔ اور اس طرح نصرت دین کے بجائے دنیا کے فانی مال و متاع کو ترجیح دی تھی۔ غزوۂ بدر ظہور اسلام کے بعد کفر و اسلام کی اولین جنگ تھی۔ اس سے قبل ایسی خون ریزی کی نوبت نہیں آئی تھی اور بعد میں بھی کسی غزوہ کو اس جیسی شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں آنحضور کو مخاطب نہیں کیا گیا بلکہ ایک خاص انداز میں بتایا گیا ہے کہ اس فعل کا صدور

---

[1] تفسیر المنار ج ۱۰ ص ۴۶۵۔

[2] سورۃ الانفال آیت ۶۸۔ دیکھیے تفسیر سورۃ الانفال از مصطفیٰ زید ص ۱۵۵۔ ۱۵۹ نیز تفسیر المنار۔ ج ۱۰۔ ص ۸۳ ۔ ۱۰۰۔

کسی رسول و نبی سے بھی زیبا نہیں۔ اس طرح فدیہ لینے کے کام کی اہمیت میں بہت نمایاں اضافہ ہوگیا ہے۔

عتاب شدید کی مثال حسب ذیل آیت بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"پیشانی پر شکن پڑ گئے اور متوجہ نہ ہوئے۔ اس لیے کہ ان کے پاس اندھا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور جاتا۔ یا نصیحت قبول کرتا اور اس کو نصیحت کرنا فائدہ پہنچاتا۔ تو جو شخص بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی فکر میں پڑتے ہیں۔ حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے۔ اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اور وہ ڈرتا ہے۔ آپ اس سے بے پروائی کرتے ہیں۔ ہرگز ایسا نہ کیجیے۔ قرآن نصیحت کی چیز ہے"[۲]

مندرجہ ذیل آیت میں جو عتاب آنحضورؐ پر نازل کیا گیا ہے وہ انذار و تہدید کی شدید ترین قسم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ	اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بہت
تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا	ممکن تھا کہ آپ تھوڑا سا ان کی طرف جھک
لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ	جاتے پھر ہم آپ کو زندگی اور آخرت میں
الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا	دگنا عذاب چکھاتے اور آپ کوئی مددگار
نَصِيْرًا ۝	نہ پاتے جو ہمارے خلاف آپ کی مدد کرتا۔

ایک دوسری آیت میں یہ عتاب اپنے نقطہ عروج تک پہنچ جاتا ہے جس کے سامنے ہر تہدید اور وعید ماند پڑ جاتی ہے۔

---

[۱] تفسیر المنار - ج ۱۰ - ص ۳۷۳ - ۳۷۴ - نیز دیکھیے النباء العظیم ص ۱۷ - ۱۹ - از ڈاکٹر عبداللہ

[۲] سورۃ العبس آیت - ۱ - ۱۱ -

[۳] سورۃ الاسراء آیت ۷۴ - ۷۵ -

قرآن کریم میں فرمایا:۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ	اور اگر (ہمارا پیغمبر) کوئی بات اختراع کر
لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا	لیتا تو ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس
مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ	کی رگِ جان کاٹ دیتے اور تم میں سے
أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝[1]	کوئی بھی ہم کو اس سے روک نہ سکتا۔

علامہ زمخشری ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

"مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارا پیغمبر کوئی غلط بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم آپ کو باندھ کر ہلاک کر دیتے۔ جس طرح بادشاہ جھوٹ باندھنے والے سے انتقام لیا کرتے ہیں۔ قتل کی یہ صورت اس لیے ذکر کی کہ یہ زیادہ ہولناک[2] ہے وہ صورت یہ ہے کہ ــــ ہاتھ باندھ کر گردن اُڑا دی جائے۔"

مندرجہ بالا پُر از تہدید و انذار آیات اور ادب آموز عتابات سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ اور زبردست قوت و شوکت کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ضعیف مخلوق کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان آیات سے خداوند تعالیٰ کی ذاتِ آمر اور نبی کی مامور شخصیت کا فرق و امتیاز بھی واضح ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی نازل کردہ وحی اور اپنی الہام پر مبنی احادیث کا فرق بھی واضح فرمایا کرتے تھے آپ کے جی میں جو افکار و خیالات گردش کرتے رہتے تھے۔ وہ خالص بشری و انسانی تھے جن کے کلام ربانی سے مخلوط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے آغازِ اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے سوا دوسری چیزوں کے لکھنے کی ممانعت کر دی تھی[3] تاکہ قرآن اپنے کلام ربانی

---

[1] سورۃ الحاقۃ۔ آیت نمبر ۴۴۔ ۴۷۔ [2] سورۃ الکشاف۔ ج ۴۔ آیت ۱۳۷۔

[3] صحیح مسلم ج ۸۔ ص ۲۲۹ پر ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھ سے سن کر مت لکھو جس نے قرآن کے سوا مجھ سے سن کر کچھ لکھا ہو وہ اس کو مٹا دے۔ البتہ حدیثیں (باقی بر صفحہ ۴۹)

ہونے کی صفت کو اپنے لیے مخصوص کر سکے۔ اور کسی ایسی چیز سے مخلوط نہ ہو جو اس تقدس سے محروم ہو۔ دوسری طرف آپ کی یہ حالت تھی کہ اگر ایک آیت یا آیت کا کچھ حصہ بھی نازل ہوتا تو آپ کسی کاتب کو بلوا کر فوراً لکھوا دیتے [1]

قبل ازیں ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے بعض محققین کے نزدیک اس آیت کے مقابلہ میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا جس میں آپ کو جلدی جلدی قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ کہ وحی الٰہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ایک مستقل اور جداگانہ حیثیت رکھتی تھی اور آپ کے ذاتی و نفسی عوامل کے ساتھ اسے کوئی ربط و تعلق نہ تھا۔ اس کی حد یہ ہے کہ حفظ قرآن کے سلسلہ میں پیغمبر کو اس بات کی بھی اجازت نہ تھی کہ اپنی قوتِ حافظہ کو کام میں لائیں۔ بلکہ ذہنِ رسول میں اس کو محفوظ کرانے کی ضمانت بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی لے لی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم آمر و مامور کے فرق و امتیاز سے کس حد تک آگاہ تھے [2]

حالانکہ بعض احادیث نبویہ توقیفی ہیں۔ جن کا مضمون کلیتہً وحی سے ماخوذ و مستفاد ہوتا ہے۔ تاہم آنحضورؐ کے حکم سے کاتبینِ وحی نے ان احادیث کو کلامِ ربانی کے ساتھ مخلوط نہ ہونے دیا۔ حالانکہ وہ احادیث آیاتِ قرآنیہ کی مفسر و ترجمان تھیں اور دونوں کے مابین گہرا ربط و تعلق پایا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ احادیث کا معنی و مفہوم بے شک من جانب اللہ ہوتا ہے مگر وہ نبی کی ساختہ پرداختہ ہوتی ہیں اور آنحضورؐ ان کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے انداز و اسلوب کے ساتھ کسی دوسرے کے طرز و انداز کو مخلوط نہیں کیا جا سکتا۔

(بقیہ صفحہ ۴۸) بے شک بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے۔" دیکھیے ہماری کتاب علوم الحدیث ص ۸۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] البرھان۔ ج ۱۔ ص ۲۳۲۔ [2] الظاہرۃ القرآنیہ ص ۲۰۶۔

حدیث قدسی:

علماء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ احادیثِ قدسیہ کا معنی و مفہوم من جانب اللہ ہوتا ہے اکثر علماء کے نزدیک احادیثِ قدسیہ منزل من اللہ ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوصف ان کو قرآن سے الگ تھلگ رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن سے علٰحدہ رکھنے کے بے حد شائق تھے۔ حدیث قدسی کے نقطۂ آغاز میں آپ ایسے الفاظ فرمادیا کرتے تھے۔ جس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ آنحضورؐ خدا کے نازل کردہ مفہوم کو اپنے الفاظ کا لباس پہنا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ افصح البشر تھے تاہم آپ کا اسلوب و انداز قرآن کے نازل کرنے والے صاحب قوت و قدرت خداوند تعالیٰ کے مساوی نہیں ہو سکتا اس لیے علماء پر احتیاط لازم تھی کہ احادیث قدسیہ سے استشہاد کرتے وقت ان کے شروع میں ایسے الفاظ استعمال کرتے جن سے ان کا حدیث ہونا واضح ہوجاتا مثلاً:

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ فِی مَا یَرْوِیْہِ عَنْ رَبِّہٖ" یا "قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی مَا رَوَاہُ عَنہ رَسُوْلُہٗ" یا "قَالَ اللّٰہ تعالیٰ فی الحدیث القدسی"۔

ہم یہاں اعجاز القرآن کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتے۔ ہم نے کتاب ہٰذا کے آخری صفحات میں اس کے لیے ایک مستقل فصل باندھی ہے۔ ہمارا مقصد یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم اور حدیث کے فرق سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب یہ فرق واحتیاط احادیث قدسیہ میں بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا تو آنحضورؐ کے دنیوی امور سے متعلق افکار و نظریات میں یہ فرق اور بھی زیادہ نمایاں ہوگا۔

تابیرِ نخل کا واقعہ:

دُہرا جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس ضمن میں کھجور کے درختوں کو پیوند کرنے کا مشہور واقعہ ذکر کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ چند آدمی کھجور کے درختوں کو پیوند کر رہے ہیں۔ آپ نے دریافت کیا یہ کیا کرتے ہیں؟ لوگوں نے کہا کھجور کے درختوں کو

پیوند کر رہے ہیں۔ نر کھجور کا پیوند مادہ کو لگاتے ہیں اور وہ زیادہ پھل لاتی ہے۔ آپ نے فرمایا "میرے خیال میں یہ بے کار ہے" جب لوگوں کو پتہ چلا تو انھوں نے پیوند لگانا ترک کر دیا۔ یہ معلوم کر کے آپ نے فرمایا:۔

"اگر اس سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے تو پیوند کرتے رہیں میں نے تو ایک خیال کا اظہار کیا تھا جس پر عمل پیرا ہونا تمہارے لیے ضروری نہیں۔ البتہ جب میں تمہیں خدا کا کوئی حکم سناؤں تو اس پر عمل کیجیے۔ کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا"

امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کو جس باب میں درج کیا ہے اس کا عنوان یہ ہے کہ:۔

"جو باتیں آپ شرعی حیثیت سے فرمائیں وہ واجب التعمیل ہے اور دنیوی امور میں جس رائے کا اظہار کریں اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے[1]"

مذکورہ بالا حدیث کے ساتھ ایک روایت اور بھی ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"تم دنیوی امور کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو[2]"

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انسانی ظنی اور دنیوی تجربات اور دین کے قطعی و حتمی مسائل و احکام کے مابین قطعی فرق و امتیاز واضح کر دیا تھا۔ آپ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ صحابہ آپ کے دنیوی تجربات کی پیروی نہیں کریں گے۔ البتہ شرعی احکام پر دل و جان سے عامل ہوں گے۔ کیونکہ ایسے مسائل خود وضع کر کے آپ خدا پر جھوٹ نہیں باندھا کرتے تھے۔ اس حقیقت کو آپ نے اپنے اقوال و اعمال سے بخوبی واضح کر دیا تھا۔

مندرجۂ ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] دیکھیے صحیح مسلم مع شرح نووی ج ۱۳۔ ص ۱۱۶۔

[2] صحیح مسلم۔ ج ۱۳۔ ص ۱۱۸۔

(۱) آپ نے فرمایا "میں تمہاری طرح بشر ہوں۔ ظن صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔ جس بات کے بارے میں میں یوں کہوں کہ خدا نے اس طرح فرمایا ہے اس میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھوں گا۔" (ابن ماجہ۔ ج ۲۔ ص ۷۷، حدیث نمبر ۲۴۷۰)

(۲) ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ میں باہم جھگڑنے والے فریقین کے دل کی باتوں کو نہیں جانتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ جو شخص جھگڑا چکانے میرے پاس آتا ہے اس کے دل میں کیا بات ہے۔ اگرچہ وہ میرا ہم عصر ہو اور میرے ساتھ ایک ہی شہر میں رہتا ہو یا میرا عزیز ہو۔

آپ نے فرمایا:۔

"میں ایک انسان ہوں۔ تم میرے پاس مقدمات فیصل کرانے آتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک فریق اپنے نقطۂ نظر کو زیادہ اچھی طرح واضح کر سکتا ہو۔ اور میں اس کی بات سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ تو اس صورت میں اگر میں کسی کو اس کے بھائی کا حق دے دوں تو وہ اُسے ہرگز نہ لے اور یوں سمجھے کہ میں نے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر اُسے دے دیا۔"

(صحیح مسلم۔ ج ۱۲۔ ص ۴)

(۳) مشہور واقعہ ہے کہ چوری کے ایک واقعہ میں بنو اُبیرق نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غلط راستہ پر ڈالنا چاہا تھا۔ وہ چور کو بری ثابت کرنا چاہتے تھے۔ آنحضور صلعم نے بھی بڑی حد تک اس کو تسلیم کر لیا تھا۔ آپ نے قتادہ بن نعمان کو ڈانٹا تھا کہ اُس نے بے گناہ کو چوری سے کیوں متہم کیا؟ آپ نے فرمایا "قتادہ! تم نے ایک مسلمان اور پاکباز خاندان پر بلا دلیل چوری کی تہمت کیوں لگائی؟ پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

"آپ خیانت پیشہ لوگوں کی حمایت نہ کریں اور خدا سے معافی طلب کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورۃ النساء آیت ۱۱۲-۱۱۳)

اس آیت سے آپ کو معلوم ہوا کہ بنو اُبیرق نے ازراہ خیانت آپ کو غلط راستہ پر ڈالنا چاہا تھا۔ چنانچہ آپ نے قتادہ کو جو ڈانٹا تھا اس سے بارگاہ ایزدی میں معافی طلب کی۔

(ترمذی نیز اسباب النزول للسیوطی ص ۴۸)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کے شاہد وحید تھے کہ آپ پر وحی نازل ہوتی ہے آپ کا ذاتی یقین واطمینان اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ آپ اپنی ذات کو وحی کی تعلیمات میں مدغم نہیں کرتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت آنحضورؐ کے ذاتی ارادے اور انسانی خصائص معدوم ہو جایا کرتے تھے یہاں تک کہ قرآن کے نزول یا عدم نزول میں آپ کے اختیار کو کوئی دخل نہ تھا۔ بعض اوقات وحی اس کثرت سے نازل ہونے لگتی کہ آپ بیمار پڑ جاتے۔ اور بعض اوقات شدید ضرورت کے وقت وحی رُک جایا کرتی تھی۔

وحی ہمہ وقت آپ کے قلب مبارک پر نازل ہوتی رہتی تھی (کوئی وقت مستثنیٰ نہ تھا) آپ بستر پر لیٹے ہیں اور ابھی سو بھی نہ پائے تھے کہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ سر اُٹھا کر مسکرانے لگتے اور فرماتے ہیں کہ مجھ پر سورۂ کوثر نازل ہوئی ہے[۱]

گھر پر استراحت فرما ہیں۔ رات کا ایک تہائی حصہ باقی ہے کہ آپ پر سورۂ توبہ کی وہ آیت اتری جس میں غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے والے تین صحابہ کا ذکر تھا۔ ارشاد ہوا۔

"جب زمین کشادہ ہونے کے باوصف ان پر تنگ ہو گئی اور انہوں نے سمجھا کہ اب خدا کے سوا کہیں پناہ نہیں ملے گی تو اس نے ان کی توبہ قبول کر لی بے شک اللہ تعالیٰ بہت رجوع کرنے والا اور مہربان ہے[۲]"

تاریک رات ہو یا روشن دن۔ شدید سردی ہو یا انتہائی گرمی سفر کی بے قراری ہو۔

---

[۱] الاتقان ج ۱، ص ۳۸۔ نیز دیکھیے صحیح مسلم بروایت انس رضی اللہ عنہ۔
[۲] التوبۃ آیت نمبر ۱۱۸۔

یا حضر کا راحت و سکون بازار ہو یا میدانِ حرب و قتال وحی کا نزول ہر حال میں جاری رہتا تھا۔ یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ کے اسراء اور آسمانوں کی طرف عروج کرتے وقت بھی وحی کا سلسلہ جاری رہا[۵۱]

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ انتہائی ذوق و شوق کے باوجود وحی کا سلسلہ بند ہو جاتا۔ جب جبریل سورۂ العلق کی ابتدائی آیات لے کر نازل ہوئے تو وحی کا سلسلہ تین سال تک رُکا رہا۔ بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، آپ اس قدر غم زدہ ہوئے کہ پہاڑ پر چڑھ کر خودکشی کا ارادہ کیا۔ جب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر گرنا چاہا تو جبریل نے حاضر ہو کر کہا "آپ سچے رسول ہیں" یہ سن کر آپ مطمئن ہو گئے[۵۲]

ایک روز آپ پیدل جا رہے تھے تو آسمان سے ایک آواز سنی۔ آپ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ نظر آیا جو قبل ازیں آپ نے غار حرا میں دیکھا تھا۔ آپ پر خوف طاری ہو گیا۔ اور اپنی وفا شعار بیوی خدیجہؓ سے کہنے لگے "مجھے کمبل اڑھا دو"، تب سورۂ المدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہو گیا[۵۳] آپ خوش ہو گئے، اور آپ کا غم جاتا رہا۔ آپ سمجھ گئے کہ وحی الٰہی آپ کے ارادہ کے تابع نہیں، بلکہ مستقل بالذات ہے آپ کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ وحی کا مصدر و منبع ذاتِ الٰہی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ واقعۂ افک میں جب کہ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

---

۵۱ البرھان - ج ۱ - ص ۱۹۸ -

۵۲ صحیح بخاری - ج ۹ - ص ۳۰ کتاب التعبیر -

۵۳ صحیح بخاری ۶۵ - ۱۶۲ بعض علماء کا خیال ہے کہ وحی کے رک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۂ الضحیٰ نازل ہوئی مگر یہ درست نہیں۔ بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق سورۂ الضحیٰ کا شانِ نزول یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بیمار پڑ گئے اور دو تین راتوں میں تہجد کی نماز کے لیے نہ اٹھ سکے۔ ابولہب کی بیوی اُمّ جمیل نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہارا شیطان تم سے چل دیا وہ دو تین راتوں سے آپ کے پاس نہیں آیا" تب یہ سورت نازل ہوئی۔ دیکھیے اسباب النزول للسیوطی ص ۱۷۰ -

کو تسلیم کیا تھا۔ وحی کا سلسلہ کامل ایک ماہ تک بند رہا۔ نتیجہ کے طور پر آنحضورؐ کے دل میں بھی شک کا گزر ہو گیا تھا۔ آپ نے حضرت عائشہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "میں نے یہ بات سنی ہے اگر تمہارا دامن اس آلودگی سے پاک ہے تو اللہ تعالیٰ تمہاری براءت آسمان سے نازل کرے گا۔ اور تم نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو خدا سے معافی مانگو۔"

کسے معلوم نہیں کہ اس حادثۂ فاجعہ کے دوران پورے ایک ماہ تک وحی کا رک جانا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی سالوں سے بھی زیادہ گراں تھا۔ اس واقعہ کا یہ پہلو کتنا دردناک تھا کہ ایک طرف منافقین نے حضرتِ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تہمت سے ملوث کیا تھا اور دوسری طرف وحی کا سلسلہ منقطع تھا۔ آپ ایک ماہ تک شک و شبہ میں گرفتار رہے اور کامل خاموشی کے ساتھ وحی کا انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ سورۂ نور کی آیات حضرت عائشہؓ کی براءت میں نازل ہوئیں۔

یہاں طبعاً یہ سوال لوحِ ذہن پر ابھرتا ہے کہ آپ نے آسمانی امور میں کس لیے دخل نہ دیا؟ آپ کو چاہیے تھا کہ درویشوں کا لباس زیب تن کر کے جنتر منتر پڑھتے بخور جلاتے اور وا انکشاف الفاظ میں حضرت عائشہ کو پاک دامن قرار دیتے۔[1]

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دلی آرزو تھی کہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ کی جانب تبدیل ہو جائے۔ آپ اس کے لیے نہایت بے قرار رہتے تھے ۱۶ یا ۱۷[2] ماہ تک آپ مدینہ میں آسمان کی جانب سر اٹھائے وحی کا انتظار کرتے رہے۔ مگر خداوند تبارک و تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کے شدید ذوق و شوق کے باوجود تقریباً ڈیڑھ[3] سال سے پہلے تحویل قبلہ کا حکم نازل نہ کیا۔

ھ ۱ صحیح بخاری۔ ج ۶۔ ص ۱۰۱۔

ھ ۲ صحیح بخاری۔ ج ۶۔ ص ۲۱ کتاب التفسیر۔

ھ ۳ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی "ہم نے آسمان کی جانب چہرہ اٹھانے کو دیکھ لیا ہم آپ کو ایسے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں گے چنانچہ آپ اپنا چہرہ مسجد الحرام کی جانب پھیریں"

(اسباب النزول للسیوطی ص ۱۲۔ ۱۳)

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے بروقت وحی طلب کر کے اپنی دلی آرزو کیوں نہ پوری کرلی آخر اس میں کیا رکاوٹ تھی؟

خلاصۂ کلام! وحی کا آنا اور اس کا رک جانا ذاتِ خداوندی کی صوابدید پر تھا۔ اگر ربِ محمدؐ چاہتا تو وحی جاری رہتی اور اگر چاہتا تو رک جاتی۔ اس ضمن میں تعویذ ہوں یا جنتر منتر سب بے کار ہیں۔ آنحضورؐ کے جذبات و احساسات آسمانی امور کو نہ آگے بڑھا سکتے اور نہ پیچھے دھکیل سکتے تھے۔

بہرکیف مادہ پرستوں کے نزدیک بھی خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین آنحضورؐ کی شخصیت اور وحی کے مابین واضح فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ یہ مفروضہ کسی طرح بھی درست نہیں کہ نبی کریمؐ کی شخصیت شعور و لاشعور کی صفاتِ متضادہ سے مرکب تھی دنیا کا کوئی منصف مزاج شخص ایسا عقیدہ رکھنے والے کو عقل و خرد سے بہرہ ور قرار نہیں دے سکتا۔

اہل عرب اس امر پر اظہارِ حیرت کر چکے تھے کہ وحی کے نازل کرنے والے اور نبی کریمؐ کے درمیان کس قسم کا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ جھوٹے گواہ کی طرح جو منہ میں آتا کہہ دیتے ان کے ذہن مشوش تھے۔ افکار و آراء میں تضاد پایا جاتا تھا۔ ان کے ذہن میں کوئی ایسی تاویل نہیں آتی تھی جو ان کے لیے موجب اطمینان ہو۔ ان کی حیرت کی منظر کشی قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے، ارشاد فرمایا۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ	بلکہ انہوں نے کہا کہ یہ بے ہودہ خوابیں ہیں۔
افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ[۱]	بلکہ اس (پیغمبر) نے خود یہ باتیں گھڑ لی ہیں۔ بلکہ یہ (پیغمبر) شاعر ہے۔

مذکورہ صدر آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل عرب نے بے کار خوابوں، مجنونوں کی دور از عقل باتوں، من گھڑت افسانوں، شاعرانہ تخیلات اور ادیبانہ نقطہ آفرینیوں کو قرآن کا سرچشمہ قرار

۱؎ الانبیاء آیت نمبر ۲ نیز النباء العظیم ص ۶۹

دیا تھا۔ اس آیت میں " بَلْ " کو جو حرفِ اضراب ہے تین مرتبہ لا کر اس جانب اشارہ کیا کہ ان کے افکار و تخیلات میں تناقض و تضاد کی فراوانی تھی۔ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔

وحی ربانی کو سوئے ہوئے شخص کا خواب قرار دینا سراسر بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے باشعور اور تیز و تند حواس اور آپ کی بیدار و مستعد شخصیت تو راحت و آرام کے وقت بھی اس قسم کی باتوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

جب سے پہلی وحی " اِقْرَءْ " نازل ہوئی تھی یہ بیداری و مستعدی اس وقت سے آپ کے شامل حال تھی۔ جب آخری وحی نازل ہو چکی اور آپ عالم آخرت کو تشریف لے گئے تو اس وقت تک یہ صلاحیت بدرجۂ اتم آپ میں موجود رہی۔ یہاں بعض مفسرین اور ہمارے معاصر مصنفین کی وہ غلطی ہم پر واضح ہوتی ہے جس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی حسن نیت کسی شک و شبہ سے بالا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جب غار حرا میں پہلی مرتبہ آپ پر وحی نازل ہوئی تو اس وقت آپ محو خواب تھے۔ حالانکہ بخاری و مسلم کی روایت سے اس بات کا حتمی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ نزولِ وحی کے وقت آپ جاگتے اور ذکر الٰہی میں مشغول تھے۔ اسی لیے آپ ہانپتے کانپتے حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے۔ اور اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو بیدار ہونے پر آپ کا خوف زائل ہو جاتا۔ اسی لیے قرآن میں فرمایا۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝	دل نے جو دیکھا تھا اس میں جھوٹ نہیں بولا
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝	کیا تم آپ سے ان باتوں میں جھگڑتے ہو جو آپ نے ملاحظہ کیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آغاز وحی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں بھی اسی بیدار مغزی اور مستعدی کا وصف نمایاں ہے۔ آپ فرماتی ہیں :-

" رسول کریم پر وحی کا آغاز نیک خوابوں سے ہوا۔ آپ جو خواب دیکھتے اس

---

۵ سورہ النجم آیت نمبر ۱۱ - ۱۲

کی تعبیر صبح روشن کی طرح سامنے آجاتی۔ پھر آپ کو خلوت سے محبت ہو گئی۔ آپ غارِ حرا میں خلوت نشین رہ کر کئی کئی راتیں عبادت میں گزار دیتے۔ آپ زادِ سفر ہمراہ لے جاتے جب ختم ہو جاتا تو حضرت خدیجہؓ کے یہاں سے پھر لے جاتے۔ حتیٰ کہ غارِ حراء میں آپ پر فرشتہ نازل ہوا اور کہا "پڑھیے"! فرمایا "میں پڑھنا نہیں جانتا، پھر فرشتہ نے مجھے زور سے بھینچا اور کہا پڑھ! میں نے کہا میں پڑھنا نہیں جانتا، پھر فرشتہ نے مجھے پکڑ کر دوبارہ زور سے بھینچا۔ پھر چھوڑ کر کہا "پڑھیے"! میں نے کہا "میں پڑھنا نہیں جانتا" فرشتہ نے پکڑ کر تیسری مرتبہ زور سے دبایا اور مجھے چھوڑ کر کہا پڑھیے۔ اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ ______ آپ ترساں و لرزاں حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور فرمایا "مجھے کمبل اُڑھا دو" محترمہ نے کمبل اوڑھا دیا اور آپؐ کا خوف جاتا رہا۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے ماجرا بیان کیا اور فرمایا "مجھے اپنی جان کا خطرہ لاحق تھا" خدیجہ نے کہا "بخدا اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے لوگوں کا بوجھ برداشت کرتے، غریبوں کی امداد کرتے، مہمان نوازی کرتے اور مصیبت زدہ کے کام آتے ہیں"[۱]

یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ پر کپکپی طاری ہونے کی وجہ وحی کا ناگہانی اور غیر متوقع نزول تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ[۲]	اور آپ کو اس بات کی امید نہ تھی کہ آپ پر کتاب نازل کی جائے گی مگر اپنے پروردگار کی رحمت سے۔

نیز فرمایا:

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ	آپ نہیں جانتے تھے کہ ایمان کیا چیز ہے اور

---

[۱] صحیح بخاری۔ ج ۱۔ ص ۷۔ باب بدء الوحی۔

[۲] سورۃ القصص آیت نمبر ۸۶۔

وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ	کتاب کیا ہے، مگر ہم نے اس کو ایک نور
نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ	بنادیا تھا جس کے ساتھ ہم جس کو چاہتے
مِنْ عِبَادِنَا۔[1]	ہیں ہدایت دیتے ہیں۔

دل کی کپکپاہٹ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا جس سے معلوم ہو کہ آپ کے اعضاء سرد پڑ گئے تھے یا آپ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور دانت بجنے لگے تھے۔ بخلاف ازیں آپ کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا۔ چہرہ سرخ ہو جاتا اور آپ کو بخار آجایا کرتا تھا۔ جس سے آپ کی پیشانی پسینہ سے شرابور ہو جاتی اور جسم بوجھل ہو جایا کرتا تھا۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حالتِ وحی میں اگر آپ اپنے ہم نشین پر اپنی ران رکھ دیتے تو اس کی ران ٹوٹنے لگتی۔ آپ نے حضرت خدیجہ سے کپڑا اوڑھانے کی فرمائش اسی لیے کی تھی کہ آپ بستر پر آرام کر سکیں اور اس ہولناک منظر کا خوف آپ سے جاتا رہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ نزولِ وحی کے بعد آپ اٹھ کر دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کریں۔

قرآن میں فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ	اے کمبل پوش! اٹھ اور لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرا۔

پھر فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۔	اے کمبل اوڑھنے والے! رات کو اٹھ مگر تھوڑے حصہ میں (آرام کیجیے)

آغازِ وحی میں آپ پر وہی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی جو بعد میں طاری ہوتی رہی۔ آپ نزولِ وحی کے وقت بکمال ہوش و حواس نہایت چاک و چوبند اور چوکس ہوا کرتے تھے جب وحی آتی تو آپ نہ کسی عصبی تکلیف میں مبتلا ہوتے نہ بیماری کا دورہ پڑتا[2]

---

[1] الشوریٰ آیت نمبر ۵۲۔ [2] النباء العظیم ص ۷۱-۷۲۔

بے کار خوابوں کو عرب کے لوگ مجنون کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کو مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ[۱] کہہ کر پکارتے۔ وہ یوں بھی کہا کرتے تھے۔

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ — جو رسول تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، وہ

اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ — مجنون ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا:۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ — خدا کی عنایت سے تو مجنون نہیں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اہل عرب قرآن کو خود ساختہ اور ایک دروغ گو کا ظن و قیاس قرار دیتے تھے۔ تو اس کی تردید خود عربوں کی اس شہادت سے ہوتی ہے کہ وہ آپ کو صادق و امین تسلیم کرتے تھے۔ جھوٹ ایک ایسی چیز ہے جو چھپائے نہیں چھپتی بلکہ ظاہر ہو کر رہتی ہے سوال یہ ہے کہ آنحضورؐ نے کب جھوٹ بولا؟ آیا غیبی خبریں بتانے میں؟ ماضی کے واقعات کے کشف و اظہار میں یا آیندہ کے پوشیدہ اخبار و احوال کے بتانے میں؟ کیا اس دور کی عربی تہذیب و ثقافت اس امر کی اجازت دیتی تھی کہ عرب کسی کو صادق یا کاذب قرار دے سکتے؟ قرآن نے آغاز آفرینش کا ذکر کیا ہے اور انسانیت کے انجام پر بھی روشنی ڈالی ہے آخرت کے عذاب و ثواب کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ جہنم کے دروازوں اور ان کے محافظ فرشتوں کی تعداد بتائی ہے۔ یہ سب باتیں عربوں کو اس انداز اور ایسے حالات میں بتائیں کہ اہل کتاب بھی سُن اور سمجھ رہے تھے۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

"اور ہم نے فرشتوں کو جنّت کا محافظ مقرر کیا اور ان کی تعداد کو کفار کے لیے آزمائش کا باعث بنایا تاکہ اہلِ کتاب یقین کر لیں اور مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو[۲]"

اب سوال یہ ہے کہ اہل عرب کے جاہلانہ ماحول میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے

---

[۱] سورۃ الدخان آیت نمبر ۱۴۔ [۲] سورۃ المدثر آیت ۳۔

غیبی واقعات کیسے معلوم ہو سکتے تھے؟ کیا آسمان سے کوئی ستارہ گرا تھا جس نے یہ غیبی واقعات ان کو بتا دیے؟ یا شعریٰ نامی ستارے اور مشہور سیارے مریخ نے یہ اخبار و احوال آپ پر نچھاور کیے؟ کیا آپ نے بعثت سے قبل عربوں میں چالیس سال کا طویل عرصہ نہیں گزارا تھا؟ پھر اب کیسے گمراہ ہوگئے؟ کیا عرب آپ کو صادق و امین کہہ کر نہیں پکارتے تھے؟

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ	کیا انہوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں
لَهٗ مُنْكِرُوْنَ[۱] ۝	کہ وہ آپ کو اجنبی سمجھ رہے ہیں؟

قرآن میں فرمایا:۔

"آپ فرما دیں کہ اگر اللہ چاہتا تو میں آپ کو قرآن پڑھ کر نہ سناتا اور نہ اس کے مفہوم سے آگاہ کرتا میں قبل ازیں ایک عرصہ تک تم میں رہ چکا ہوں کیا تم عقل و شعور نہیں رکھتے؟[۲]"

قرآن کریم نے اُمم سابقہ کے اخبار و احوال پر روشنی ڈالی اور عصمتِ انبیاء سے متعلق کتبِ سابقہ میں بیان کردہ غلط واقعات کی تصحیح کی ہے۔ بعض تاریخی واقعات کی غلطی واضح کی اور آپ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ گویا آپ ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے اور ان لوگوں کے درمیان بود و باش رکھتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نوح علیہ السلام کے واقعہ سے آگاہ کرنے کے بعد فرمایا۔

"یہ غیب کی خبریں ہم آپ پر نازل کر رہے ہیں۔ قبل ازیں نہ آپ ان سے واقف تھے اور نہ آپ کی قوم صبر کیجیے، بے شک انجام متقیوں ہی کے لیے ہے[۳]"

---

[۱] سورۃ المومنون آیت نمبر ۶۹ - [۲] سورۃ یونس آیت نمبر ۱۶ -
[۳] سورۂ ہود آیت نمبر ۴۹ -

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان کرنے کے بعد فرمایا :-

"جب ہم نے موسیٰ کو حکم دیا تو آپ اس کے غربی جانب نہ تھے اور نہ ہی وہاں موجود تھے۔ لیکن ہم نے کئی قوموں کو پیدا کیا۔ ان پر بہت سی مدت گزر گئی اور آپ اہل مدین میں مقیم رہ کر ان کو ہماری آیات نہیں سناتے تھے، لیکن ہم ہی وحی بھیجنے والے ہیں"[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور زکریا علیہ السلام کی کفالتِ مریم کے ضمن میں فرمایا :-

"یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ پر نازل کر رہے ہیں جب وہ قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ کون مریم کا کفیل ہوگا۔ اور جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے تو آپ ان کے پاس موجود نہ تھے"[2]

حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا واقعہ تفصیلاً ذکر کرنے کے بعد فرمایا :-

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ[3] ۝	یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ پر نازل کر رہے ہیں جب انہوں (حضرت یوسف کے بھائیوں) نے پختہ عزم باندھا تو آپ ان کے پاس نہ تھے اور وہ پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے۔

قرآن کریم نے بہت سے آنے والے واقعات کا پردہ چاک کیا۔ وہ واقعات مشرکین مکہ کی زندگی میں پیش آئے اور انہوں نے بچشم خود انہیں ملاحظہ کیا۔ جب اہل مکہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تو آپ نے بددعا فرمائی کہ اے اللہ ان کو ایسے قحط میں مبتلا کر جیسا یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں آیا تھا۔ چنانچہ وہ اس حد تک قحط میں مبتلا ہوئے کہ ہڈیاں کھانے پر مجبور ہوئے۔ جب آسمان کی طرف دیکھتے تو بھوک سے دھواں سا نظر آتا[4]

---

[1] سورۃ القصص آیت ۴۴-۴۵۔ [2] آلِ عمران آیت نمبر ۴۴۔

[3] سورۃ یوسف آیت ۱۰۲۔ [4] صحیح بخاری بروایت ابن مسعود ج ۶ ص ۱۱۴

قرآن کریم میں فرمایا :-

"انتظار کیجیے جب آسمان پر ایک ظاہر دھواں نمودار ہوگا۔ اور یہ دردناک عذاب لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا" [۱]

قرآن کریم کی یہ پیش گوئی بھی حرف بحرف پوری ہوئی کہ رومی مغلوب ہونے کے بعد چند سالوں میں دوبارہ غلبہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

"رومی بہت قریبی علاقہ میں مغلوب ہو گئے اور وہ جلد ہی چند سالوں میں دوبارہ غالب آجائیں گے" [۲]

قرآن کریم میں فرمایا :-

سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ [۳] — لشکر بھاگ جائے گا اور وہ پیٹھ پھیر لیں گے۔

یہ پیشگوئی ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ بدر میں پوری ہوئی۔ یہ سورۂ قمر میں کی گئی تھی۔ جو مکی سورت ہے۔ مکہ میں ابھی تک اس لڑائی کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوا :-

"اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا خواب سچا کر دکھایا کہ اگر خدا نے چاہا تو تم مسجدِ حرام میں پورے امن و امان کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈاؤ گے اور اپنے بال کتراؤ گے تمہیں کسی کا ڈر نہ ہوگا" [۴]

خداوند کریم نے یہ وعدہ صلح حدیبیہ کے موقع پر کیا تھا۔ جو حرف بحرف پورا ہوا۔ مسلمانوں کا خوف دور ہوا اور وہ ۸ھ میں بڑے امن و اطمینان کے ساتھ فتح مکہ کے شادیانے بجاتے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔

---

[۱] سورۂ الدخان آیت نمبر ۱۰-۱۱-   [۲] سورۃ الروم آیت نمبر ۱-۳-

[۳] سورۂ القمر آیت نمبر ۴۵ نیز صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۲۵   [۴] سورۃ الفتح آیت نمبر ۲۷-

یہ بات کس قدر حیرت ناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی جسمانی حفاظت کی ذمہ داری اس وقت قبول کی جب اعداء نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں سے آپ کو گھیر رکھا تھا۔ مگر آسمانی وعدہ نے آپ کو مطمئن کر دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو گزند نہیں پہنچا سکتی۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ	اے رسول! جو چیز آپ کی طرف اتاری جاتی
إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ	ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیں اور اگر آپ نے
فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ط وَاللّٰهُ	ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کے پیغام کو پہنچایا
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ[1]۔	ہی نہیں اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ نے خیمہ سے سر نکال کر پہرہ داروں سے کہا:۔

"اے لوگو! جاؤ اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کا سامان کر لیا ہے"[2]

غزوۂ اُحد کے دن آپ دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اور موت جوتے کے تسمہ سے بھی قریب تر تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

"جب میدان جنگ میں زور کی لڑائی ہو رہی ہوتی تھی تو ہم آپ کے ذریعہ بچاؤ حاصل کیا کرتے تھے ہم میں سے کوئی بھی دشمن سے اتنا قریب نہ ہوتا تھا جتنے آپ قریب ہوتے تھے"

غزوۂ حُنین کے دن آپ خچر کو بھگاتے ہوئے دشمن کی طرف جا رہے تھے۔ جب دشمنوں نے آپ کو گھیر لیا تو آپ بھاگے نہیں بلکہ خچر سے اُتر پڑے۔ اور تیروں کی بارش کے ہوتے ہوئے فرمانے لگے:۔

---

[1] سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۶۷۔

[2] البرھان۔ ج ۱۔ ص ۱۹۸۔

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ   أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ[1]

(میں جھوٹا نبی نہیں ہوں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔)

غزوہ ذات الرقاع کا واقعہ ہے کہ آپ ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گئے اور اپنی تلوار درخت سے لٹکا دی۔ ایک مشرک آتا ہے اور تلوار پکڑ کر کہتا ہے کہ آپ مجھ سے ڈرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "نہیں" مشرک کہنے لگا اب آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ فرمایا "اللہ بچائے گا تلوار نیچے رکھ دو۔ وہ تلوار رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے[2] بعض روایات میں مذکور ہے کہ اس نے فی الفور مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

غیبی خبروں کو یا تو وہ شخص تسلیم کرتا ہے جو محض دل لگی کا خواہاں ہو۔ یا وہ شخص جس کا دل جذبۂ ایمان سے معمور ہو۔ ظاہر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلی قسم کے لوگوں میں سے نہ تھے آپ مفتری بھی نہیں تھے۔ لامحالہ آپ مومنین، صادقین میں سے ہوئے۔ عربوں کا ایک گروہ اس زعم فاسد میں مبتلا تھا۔ کہ کوئی انسان آپ کو قرآن سکھاتا ہے۔ گویا وہ ذاتِ محمدی کے سوا کسی دوسری جگہ وحی کا مصدر و مرکز تلاش کرتے تھے۔ مگر عرب کے وہ ان پڑھ لوگ اپنے اس دعوی کو ثابت نہ کر سکے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ جو خود جاہل ہو وہ کسی دوسرے کو تعلیم نہیں دے سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ اتنا بڑا معلّم اور مرکز علم و فضل ہستی کون سی تھی جو آپ کو تعلیم دیتی تھی؟ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جس کو آنحضورؐ کا معلم بنایا جاتا تھا وہ روم کا ایک عجمی اور نصرانی غلام تھا جو مکہ میں تلواریں بنایا کرتا تھا۔ وہ اگرچہ ایک عامی آدمی تھا۔ مگر کسی حد تک لکھنے پڑھنے سے واقف تھا۔ بعض اوقات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی صنعت گری دیکھنے کے لیے ٹھہر جاتے جس سے عرب کے جاہلوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ یہ آپ کا

---

[1] بخاری و مسلم نیز تفسیر طبری۔ ج ا۔ ص ۴۳۔

[2] صحیح مسلم بروایت جابر۔ ج ۱۵۔ ص ۴۴۔

استاد ہے۔ وہ کہا کرتے تھے :۔

اِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۔ اس کو ایک بشر تعلیم دیتا ہے۔

قرآن نے ان کی حماقت کا جواب ان الفاظ میں دیا :۔

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ۝ جس کی طرف (قرآن کو) منسوب کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ (قرآن) واضح عربی میں ہے۔

جب مشرکین مکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استاد کی تعیین سے قاصر رہے تو انہوں نے ایک نیا ڈھونگ رچایا وہ کہنے لگے :۔

أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ یہ پہلے لوگوں کے افسانے ہیں جو اس نے لکھوا لیے ہیں اور وہ اس پر صبح و شام پڑھے جاتے ہیں۔

یہ کہہ کر عرب کے جاہلوں نے آنے والے ملاحدہ اور نام نہاد تہذیب کے علم برداروں کے لیے راہ ہموار کر دی جنہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ایک خاص شخص نے دینی حقائق اور تاریخ کا فلسفہ آپ کو سکھایا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا نام بحیرا راہب بتایا جو توحید میں آریوس کا پیرو تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں جب اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ شام گئے تھے۔ تو بصریٰ کے مقام پر اس سے ملے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ورقہ بن نوفل عیسائی تھا جو حضرت خدیجہؓ کے اقارب میں سے تھا، اور پہلی وحی کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ملا تھا۔

ان دونوں اشخاص کے بارے میں صرف اتنی بات صحیح ہے کہ بحیرا سے آپ نو یا بارہ سال کی عمر میں ملے تھے۔ اس وقت آپ کے چچا ابوطالب بھی ہمراہ تھے۔ راہب نے آپ کے

۱؎ سورۃ النحل آیت نمبر ۱۰۳۔ ۲؎ سورۃ الفرقان آیت نمبر ۵۔

چچا سے کہا تھا۔ کہ آپ کا یہ بھتیجا بڑا آدمی بنے گا۔" ورقہ سے آپ کی ملاقات پہلی وحی کے بعد ہوئی تھی جب آپ نے حضرت خدیجہؓ کو غارِ حرا میں پیش آمدہ واقعہ سے آگاہ کیا اور وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بہت بوڑھا تھا اور اندھا ہو چکا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے ورقہ کو مخاطب کر کے کہا "میرے چچازاد بھائی! ذرا اپنے بھتیجے (نبی اکرمؐ) کی بات سنیے!" ورقہ نے کہا "بھتیجے! آپ کو کیا چیز نظر آتی ہے"؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماجرا کہہ سنایا۔ ورقہ نے کہا "یہ تو وہی ناموس (جبریل امین) ہے جو حضرت موسٰی پر نازل ہوا کرتا تھا" تھوڑے عرصہ بعد ورقہ نے وفات پائی[۱]

مذکورہ بالا دونوں بے بنیاد دعاوی کی تردید کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیرا اور ورقہ سے خلوت میں نہیں ملے تھے۔ جب آپ کی ملاقات بحیرا سے ہوئی تو اس واقعہ میں آپ کے چچا ابوطالب ہمراہ تھے، ورقہ سے ملتے وقت حضرت خدیجہؓ موجود تھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں ملاقاتوں میں آپ نے کون سے غیبی اور تاریخی علوم سیکھے؟ بعض مستشرقین نے اس ضمن میں جس مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے ہمیں اس کی تردید کی زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ خود ان کے درمیان ایسے منصف مزاج محقق موجود تھے جنہوں نے ہماری جانب سے ان کی تردید کا فریضہ ادا کر دیا ہے۔ انہوں نے پورے جزم و وثوق سے لکھا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات یہود و نصارٰی کے علماء و رہبان سے ثابت نہیں ہے۔ تو پھر آپ نے ان سے استفادہ کیوں کر کیا؟

جو لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا تھے۔ موسم سرما و گرما میں تجارتی سفر کرنے والوں اور اقوامِ سابقہ کے اخبار و احوال پر جو اعتراضات وارد کرتے تھے ان کا معاملہ چنداں اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ہمارے علم کی حد تک عرب کے تاجر علماء و رہبان کی ملاقات کے

---

[۱] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔ ج ۱۔ ص ۷۔

شائق نہ تھے؂

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام کی طرف صرف دو مرتبہ تشریف لے گئے تھے۔ پہلی مرتبہ اپنے چچا کی رفاقت میں جیسا کہ ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری مرتبہ عالم شباب میں حضرت خدیجہؓ کا تجارتی سامان لے کر شام گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی ہمراہ تھا۔ دونوں مرتبہ آپ بُصریٰ سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ حیرانی ہے کہ اصحابِ عقل و خرد کہاں بہکے جا رہے ہیں؟

جب اصل حقیقت وا شگاف ہو گئی اور اصحابِ دانش و بینش کے لیے شک و شبہ کی کوئی مجال باقی نہ رہی تو قرآن نے قطعی و حتمی الفاظ میں یہ فیصلہ صادر کیا:۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى	یہ قرآن خدا کے سوا کسی کا ساختہ پرداختہ نہیں
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ	ہے بلکہ سابقہ کتابوں کی تائید کرتا ہے اور
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ	اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کتاب کی تفصیل ب
لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ؂	جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

بعض عربوں نے شاعرانہ خیالات اور ادیبانہ افکار کو بھی رسول کریم کی جانب منسوب کیا تھا۔ جب قرآن نے ایک جیتے جاگتے اور بلند پایہ اندازِ بیان شاندار الفاظ شفا بخش فواصل اور شیریں لحن میں کلام ربانی کو پیش کرنا شروع کیا تو عربوں نے کہنا شروع کیا:۔

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ	یہ تو ایک شاعر ہے ہم اس پر حوادث کے
الْمَنُوْنِ ۔	نازل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

فصحاء عرب اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ قرآن کا شعر و شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔ نیز یہ کہ اس کا اسلوب و انداز غالب ہے مغلوب نہیں۔ اس لیے یہ انسانی کلام نہیں۔ عربی کے ایک مشہور ادیب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

؂ الوحی المحمدی ص ۸۶۔ ؂ سورۂ یونس آیت نمبر ۳۷۔

"قرآن میں شیرینی اور تروتازگی پائی جاتی ہے۔ اس کی بالائی جانب ثمور دبھرپور اور اس کا باطن پھلدار ہے۔ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔"

تاہم قرآن کریم عربوں کو مقابلہ و معارضہ کی دعوت دیتا رہا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے اپنی تشنگی صرف یہ کہہ کر بجھائی کہ:۔

شِعْرٌ اَوْ سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ قرآن کریم شعر یا ظاہر جادو ہے۔

قرآن نے سب سے پہلے عربوں کو چیلنج کیا کہ وہ پورے قرآن کی نظیر لائیں۔ چنانچہ سورۂ طور میں فرمایا:۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ آپ (محمدؐ) نے قرآن خود گھڑ لیا ہے بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے اگر وہ سچے ہیں تو وہ بھی اس قسم کا کلام لے آئیں

جب وہ پورے قرآن کی نظیر لانے سے قاصر رہے تو قرآنی سورتوں جیسی دس (۱۰) سورتیں لانے کے لیے کہا اگرچہ وہ سورتیں بے اصل و اساس ہوں اور ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

سورۂ ہود میں فرمایا:۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے قرآن خود بنا لیا ہے آپ فرما دیں کہ تم بھی اس جیسی دس (۱۰) سورتیں بنا کر لے آؤ، اور جس کو تم بلا سکو بلا لو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔

جب وہ دس (۱۰) سورتیں بھی نہ بنا سکے تو قرآن نے چیلنج کیا کہ ایک سورت ہی بنا لاؤ۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا:۔

"جو چیز ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے اگر تم اس کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو تو اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار

ہیں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا ——— اور تم ایسا کر بھی نہیں سکو گے ——— تو اس آگ سے ڈر جاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں اور جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے "

جب اہل عرب بایں ہمہ فصاحت و بلاغت قرآن کے مقابلہ میں ایک سورت بھی نہ لا سکے تو قرآن کی یہ آواز آفاق ارضی میں گونجنے لگی اور دنیا بھر کے لوگوں کو پورے جزم و وثوق کے ساتھ پکار کر کہا کہ :-

"آپ فرما دیں اگر جن و انس جمع ہو کر بھی قرآن کی مثال لانا چاہیں تو نہیں لا سکیں گے وہ ایک دوسرے کے معاون ہی کیوں نہ ہوں"

قرآن کریم نے آیاتِ احکام غیبی اخبار اور کلیاتِ کبریٰ کے نزول سے قبل اپنے سحر انگیز اور اعجاز خیز اسلوب و انداز سے عربوں کو مسحور و مخمور کر دیا تھا۔ اگر قرآنی وحی کے معاصرین کی قسمت میں ہماری طرح یہ بات مقدر ہوتی کہ وہ قرآن کے علمی و فلسفی پہلو پر غور و فکر کرتے اور تاریخی حقائق کا جائزہ لینے کی استطاعت سے بہرہ ور ہوتے تو دیگر با انصاف لوگوں کی طرح یہ حقیقت ان پر روشن ہو جاتی کہ دنیا کی کوئی طاقت قرآن کو مٹا نہیں سکتی۔ علاوہ ازیں وہ اس بات پر یقین کر لیتے کہ آفاق و انفس میں جو خداوندی نشانات پائے جاتے ہیں ان کے کشف و اظہار کے سلسلہ میں دنیا کے تمام علوم قرآن کے خادم ثابت ہوں گے۔

قرآن کریم میں فرمایا :-

"ہم ان کو اپنی آیات دکھائیں گے جو انفس میں بھی ہیں اور آفاق میں بھی تاکہ ان کے لیے یہ بات ظاہر ہو کہ قرآن حق ہے۔ کیا یہ بات تمہارے رب کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے ؟"

خلاصۂ کلام ! ہم وحیِ معجز پر اسی موثر انداز میں نقد و تبصرہ کرنے کے خواہاں تھے جو قرآن کا خود اپنا انداز ہے۔ اس لیے ہم نے طبعی و فطری طریقہ اختیار کیا اور اس کی روشنی میں بتایا کہ

خالق ومخلوق کے مابین کس قدر فرق وامتیاز پایا جاتا ہے۔ ہم نے امکانی حد تک پیچیدگی اور بے کار جدل ونزاع سے احتراز کیا ہے۔ مسمریزم کے ذریعہ جو غیبی خبریں معلوم کی جاتی ہیں۔ یا ہاتف اور لاسلکی کے واسطہ سے جن باتوں کی تشہیر واشاعت کی جاتی ہے، ہم نے ان سے دانستہ اعراض کیا ہے۔ کیونکہ اس سے کچھ فائدہ حاصل ہونے کی توقع نہیں۔ نیز یہ کہ یہ ایمان کی راہ نہیں ہے، ہمارا خیال ہے کہ ہمارا مقصد بڑی حد تک پورا ہو گیا ہے۔ قاری اس بات پر ہمارے ساتھ متفق ہے کہ نزول وحی کے وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حواس ومشاعر بالکل بجا ہوتے تھے اور آپ پورے فہم وادراک کے ساتھ وحی سے استفادہ فرمایا کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ یقین واذعان بھی آپ میں بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسولِ امین ہیں۔

فصل سوم

قرآن کا تدریجی نزول اور اس کے اسرار

حکمتِ ربانی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ وحی رفتہ رفتہ آپ پر نازل ہوتی اور ہر روز آپ کو ایک نئی چیز سکھاتی رہے۔ نیز آپ کو رشد و ہدایت سے بہرہ ور کرتی۔ اور آپ کے ثبات و اطمینان میں اضافہ کی موجب ہوتی رہے۔ اسی طرح صحابہ بھی وحیِ ربانی سے مستفید ہوتے۔ اور اس کی روشنی میں اپنے اخلاق و عادات اور حالات و واقعات کی اصلاح کرتے رہے۔ وحی کے احکام و مسائل ان پر یکایک اور غیر متوقع طور پر نہیں ٹھونسے جاتے تھے۔ اور اس طرح وحی ان کے حالات سے ہمیشہ یک رنگ و ہم آہنگ ہوا کرتی تھی۔ اس یگانگت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وحی رفتہ رفتہ اور حاجت و ضرورت کے موقع پر اترا کرتی تھی۔ کبھی پانچ آیتیں اترتیں۔ کبھی دس یا کم و بیش[1]۔ واقعہ افک میں دس آیات کا اترنا احادیث صحیحہ سے ثابت

---

[1] بعض علماء کے نزدیک قرآن کی پانچ پانچ آیتیں اترا کرتی تھیں تاکہ اس کے یاد کرنے میں آسانی رہے۔ وہ اس کے ثبوت میں چند روایات بھی پیش کرتے ہیں۔ محدث بیہقی نے خالد بن دینار سے روایت کیا ہے کہ ابوالعالیہ نے ہمیں کہا "قرآن کی پانچ پانچ آیتیں یاد کیا کرو۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جبریل سے پانچ پانچ آیات اخذ کیا کرتے تھے" ابن عساکر نے ابونضرہ سے جو روایت نقل کی ہے وہ بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب منسوب ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے "سورۃ الانعام کے سوا قرآن کی پانچ پانچ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ جو پانچ پانچ آیتیں یاد کرلے گا اسے کبھی نہ بھولیں گی" مگر سیوطی اس قول کو ضعیف قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ بشرطِ صحت اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جبریل آپ کو پانچ آیات سناتے جب یاد ہو جاتیں تو پھر اور پانچ آیات پڑھاتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جبریل ؑ صرف پانچ آیات لے کر نازل ہوا کرتے تھے۔

(الاتقان - ج ۱ - ص ۷۳)

ہے[1]۔ اسی طرح سورۃ المومنون کی ابتدائی دس آیات کا بہ یک وقت نازل ہونا دلائل سے ثابت ہے[2]۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک وحی میں صرف "غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ"[3] کے الفاظ نازل ہوئے۔ حالانکہ یہ مکمل آیت نہیں بلکہ آیت کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ "وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً" کے الفاظ تا آخر آیت نازل ہوئے۔ آیت کا ابتدائی حصہ قبل ازیں نازل ہو چکا تھا[4]۔

قرآن کریم اسی طرح بالاقساط نازل ہوتا رہا تاکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اس کو تدریجاً پڑھیں۔ جوں جوں حوادث و واقعات رُونما ہوتے رہے یا کوئی انفرادی و اجتماعی تقریب پیش آتی تو قرآن کریم کا کچھ حصہ اس موقع کی مناسبت سے نازل ہو جاتا۔ بقول صحیح تر تیئس سال تک نزول وحی کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ ایک قول کے مطابق آپ بعثت کے بعد مکہ میں تیرہ ۱۳ سال اقامت گزیں رہے۔ جہاں تک اقامتِ مدینہ کا تعلق ہے اس کی مدت باتفاقِ مورخین دس ۱۰ سال ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم چالیس ۴۰ سال کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ تیرہ ۱۳ سال مکہ میں مقیم رہے اور آپ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ پھر ہجرت کے بعد دس سال مدینہ میں سکونت گزیں رہے۔ تریسٹھ ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی[5]۔ بعض علماء نے نزولِ قرآن کی مدت بیس ۲۰ سال اور بعض نے پچیس ۲۵ سال بتائی ہے

---

[1] سورۂ نور میں یہ دس ۱۰ آیات از آیت نمبر ۱۱ تا ۲۱ ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی براءت اور پاک دامنی کا اعلان کیا تھا۔ واقعۂ افک کتب سیر و تفسیر میں مشہور ہے۔

[2] قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ سے لے کر اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ تک کل دس ۱۰ آیات ہیں۔

[3] سورۃ النساء آیت نمبر ۹۵ پوری آیت اس طرح ہے "لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔

[4] سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۲۸۔ آیت یوں ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔

[5] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۴۳۔ [6] صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۷۵۰۔

یہ اختلاف[1] اس امر پر مبنی ہے کہ آیا آپ بعثت کے بعد مکہ میں دس سال مقیم رہے یا پندرہ سال

بقول امام شعبی[2] نزولِ قرآن کا آغاز لیلۃ القدر میں ہوا۔ پھر اس کے بعد مختلف اوقات میں بالاقساط نازل ہوتا رہا[3]۔ آیتِ قرآنی "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ[4]" سے مفہوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم بقسطِ واحد شبِ قدر میں نازل ہوا۔ جب کہ دوسری آیت "وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُكْثٍ[5]" سے مستفاد ہوتا ہے کہ قرآن کا نزول تدریجی ہوا ہے۔ امام شعبی نے مذکورہ صدر قول میں ان دو بظاہر متضاد آیات میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ایک آیت میں فرمایا کہ "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ[6]"۔ دوسری میں فرمایا کہ "قرآن کو ماہِ رمضان میں اتارا[7]" اور تیسری آیت میں ارشاد ہوا کہ "ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتارا" مگر ہر سہ آیات میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ نزولِ قرآن کا آغاز شبِ قدر میں ہوا۔ اس کا نام "لیلۃ مبارکۃ" بھی ہے۔ یہ رات ماہِ رمضان میں پڑتی ہے۔ اس لیے تینوں آیات کا مفہوم ایک ہی ٹھہرا۔ آغازِ نزول کے بعد قرآن کریم حسبِ موقع و مقام و حسبِ حوادث و واقعات تدریجاً نازل ہوتا رہا۔

ہم اس رائے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں[8] کہ قرآن تین دفعہ نازل ہوا۔ اگرچہ

---

[1] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۳۲ نیز الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۶۸۔

[2] شعبی کا نام عامر بن شراحیل اور کنیت ابو عمرو ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کے اساتذہ میں سے تھے یہ حدیث و فقہ کے مسلّم امام تھے۔ امام شعبی نے حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، زید بن ثابت، جابر بن عبداللہ اور دیگر صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں پانچ صد صحابہ سے مل چکا ہوں۔ آپ سے اعمش، قتادہ، ابوالزناد اور دیگر رواۃ حدیث نے روایت کی ہے۔ آپ نے ۱۰۹ھ میں وفات پائی۔

[3] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۲۸۔

[4] سورۃ القدر آیت نمبر ۱۔

[5] سورۃ الاسراء آیت نمبر ۱۰۶۔

[6] سورۃ الدخان آیت ۳۔

[7] سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۵۔

[8] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۶۸۔ جمہور کا نقطۂ نظر یہی ہے۔ زرکشی البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۲۹۔ پر لکھتے ہیں کہ یہ رائے مشہور و صحیح تر ہے۔ اکثر علماء اسی کے قائل ہیں ابن حجر نے فتح الباری میں اس کو مسلک صحیح قرار دیا ہے مگر ہم نے اس کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ یہ خلاف قرآن ہے جیسا کہ ہم

اس رائے کی مؤید اسانید سب صحیح ہیں۔

(۱) قرآن کریم ایک دفعہ لوح محفوظ پر اترا۔

(۲) پھر لوح محفوظ سے پہلے آسمان پر بیت العزت میں نازل کیا گیا۔

(۳) پھر پہلے آسمان سے حسب موقع و مقام بالاقساط نازل ہوا۔

اس رائے کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے بارے میں قطعی و حتمی بات وہی ہو سکتی ہے جو کتاب و سنت سے ثابت ہو اور متواتر ہم تک پہنچی ہو اس لیے اس ضمن میں وجوبِ اعتقاد کے لیے صرف سند کی صحت ہی کافی نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ قرآن کا فتوے اس کے خلاف ہے۔

قرآن نے اپنے تدریجی نزول کا ذکر تو کیا ہے گو یکبارگی نزول کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس سے یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ کفار قریش نے قرآن کے قسط وار نزول ہی کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ اس لیے کہ وہ پورا قصیدہ ایک ہی دفعہ سننے کے عادی تھے۔ وہ یہود سے سن چکے تھے کہ تورات بہ یک وقت نازل ہوئی تھی۔ اس لیے وہ قرآن کے تدریجی نزول پر معترض ہوتے اور چاہتے تھے کہ یہ ایک ہی دفعہ نازل ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان میں ان کا اعتراض ذکر کر کے ان الفاظ میں اس کی تردید کی ہے

"اور کفار نے کہا آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ اسی طرح (ہم نے قرآن کو تدریجاً اُتارا ہے) تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کر دیں اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے۔ اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے اور اس کی عمدہ ترین تفسیر پیش کریں گے"[1]

تاہم جو علماء سہ بارہ نزولِ قرآن کے قائل ہیں وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کا تیسرا نزول بالاقساط اور حسبِ حوادث و واقعات ہوا تھا۔ وہ اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ

[1] سورۂ الفرقان آیت نمبر ۳۲ - ۳۳ -

تدریجی نزول لاتعداد فوائد و اسرار پر مشتمل ہے[1] یہ اسرار اس قدر واضح ہیں کہ ہر شخص ان سے آگاہ و آشنا ہے۔ اگر قرآن کا تدریجی نزول حِکَم و مصالح پر مشتمل نہ ہوتا تو دیگر کتب مقدسہ کی طرح اس کو بھی دفعتہً نازل کر دیا جاتا۔ مگر حکمتِ ربانی اس امر کی متقضی تھی۔ کہ قرآن کریم کو دیگر کتب سے ممتاز کیا جاتا۔ اس لیے قرآن کو دونوں اوصاف سے متصف کیا۔ اوّلاً اس کو (پہلے آسمان پر) دفعتہً نازل کیا۔ پھر وہاں سے بالاقساط تدریجاً اُتارا گیا۔ ان دونوں اوصاف کے اجتماع سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ قرآن کریم کا مقام و مرتبہ دیگر کتبِ مقدسہ کے مقابلہ میں اعلیٰ و اولیٰ ہے[2]۔

علماء نے قرآن کریم کے تدریجی نزول کے جو اسرار و رموز ذکر کیے ہیں ہمارے نزدیک وہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر ہمارے علماء نے بحث و تمحیص کا حق ادا کر دیا ہے اور اس کا کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا اور نہ بعد میں آنے والوں کے لیے کوئی کسر باقی چھوڑی ہے۔ ان کے نزدیک تدریجی نزول دو بڑی حکمتوں کو شامل ہے۔

---

[1] حکمت تدریج کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ قرآن متعدد مرتبہ اور مختلف مقامات پر نازل ہوا تو اس سے قرآن کے بارے میں پھیلے ہوئے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ متعدد مواقع پر نزولِ قرآن کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر مرتبہ اور ہر موقع پر اس کے وجود کو مان لیا جاتا ہے اور اس طرح اس کے وجود سے نفی و شک کا احتمال بڑی حد تک دور ہو جاتا ہے۔ جب کہ یکبارگی نزول میں یہ بات نہیں پائی جاتی (مناھل العرفان للزرقانی۔ ج ۱۔ ص ۳۹۔ ۴۰۔)

علامہ ابو شامہ نے اپنی کتاب "المرشد الوجیز" میں پہلے آسمان پر بیک قسط قرآن کے نازل ہونے کی حکمت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"اس میں قرآن کریم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی عظمت و فضیلت پائی جاتی ہے۔ اس سے ساکنان عالم بالا کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ آخری کتاب ہے جو آخری رسول پر نازل کی گئی ہے۔ (الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۶۹ نیز البرھان۔ ج ۱۔ ص ۲۳۰)

[2] دیکھیے الاتقان ج ۱۔ ص ۶۹۔ ۷۰، امام سیوطی نے اس قول کو ابو شامہ کی جانب منسوب کیا ہے زرکشی نے البرھان میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے (البرھان ج ۱۔ ص ۲۳۰)۔

(۱) وحی کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے موافقت و مطابقت۔

(۲) وحی کا مسلمانوں کے حالات کے ساتھ تطابق و توافق۔ اس ضمن میں اگرچہ علماء کے تعبیر و بیان میں فرق پایا جاتا ہے۔ مگر حاصل مطلب سب کا ایک ہے۔

وحی کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تطابق و توافق کے دو مطلب مُراد لیے جا سکتے ہیں:۔

(۱) ایک یہ کہ ہر واقعہ کے پیش آنے پر جب قرآن کریم نازل ہوتا تو آپ کا دل مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس طرح حفظ قرآن میں سہولت رہتی تھی۔

مشہور فقیہ ابو شامہ[۱] پہلی صورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اگر دریافت کیا جائے کہ قرآن کے تدریجی نزول میں کیا حکمت و مصلحت پائی جاتی ہے۔ اور دیگر کتب کی طرح اسے ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟

تو ہم اسکے جواب میں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"اور کفار نے کہا قرآن آپ پر ایک ہی مرتبہ کیوں نہیں نازل کیا جاتا؟ (یعنی جس طرح انبیائے سابقین پر کتابیں ایک دفعہ نازل کی جاتی تھیں) اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "ہم نے اس کو رفتہ رفتہ نازل کیا تاکہ آپ کے لیے وجہ اطمینان ہو اس لیے کہ ہر حادثہ کے وقوع کے وقت قرآن کا نازل ہونا آپ کے دل کی تقویت کا موجب تھا۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس ہستی پر قرآن اُتارا جا رہا ہے خدا کے یہاں اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ پھر بار بار فرشتے کا

[۱] ابو شامہ شافعی المسلک فقیہ تھے۔ نام و نسب عبدالرحمان بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن عثمان المقدسی ہے انکی تصنیف کا نام "المرشد الوجیز الی علوم تتعلق بالقرآن العزیز" ہے۔ موصوف نے الشاطبیہ کی ایک شرح بھی تحریر کی ہے ۶۶۵ھ میں وفات پائی۔ (شذرات الذہب ج ۵ - ص ۳۱۸)۔

آنا اور بعہد بہ عہد تازہ قرآن کا نزول اس حد تک موجب مسرت ہے کہ الفاظ اس کی ادائیگی سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہ رمضان[1] میں جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات جبریل کے ساتھ زیادہ ہوا کرتی تھی تو آپ پہلے سے زیادہ جود و کرم کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔[2]

قرآن کریم کے دلکش اندازِ بیان نے عربوں کو مسحور کر دیا تھا۔ اس میں انبیاء کے واقعات مذکور ہیں جو ان کی قوموں کے ساتھ پیش آئے یہ واقعات مختلف اور متعدد اسالیب و اطوار میں ذکر کیے گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کی تکرار بھی لطف و حلاوت سے خالی نہیں۔ اکثر جگہ یہ واقعات صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اطمینانِ قلب کے لیے ذکر کیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ[3]

اور ہم آپ کو رسولوں کے واقعات سناتے ہیں تاکہ آپ کے لیے وجہ تسلی ہوں۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ بار بار اور طرح طرح کے رسولوں کے واقعات سنا کر آپ کو قریش مکہ کے مظالم برداشت کرنے کی تلقین کی گئی اور آپ کے لیے سکون و اطمینان کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے۔ کیونکہ آپ کوئی نرالے رسول نہ تھے۔ باقی انبیاء پر بے شمار مظالم ڈھائے گئے۔ ان کو جھٹلایا گیا اور طرح طرح سے ستایا گیا۔

---

[1] بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ اور آپ سب سے زیادہ سخاوت کا مظاہرہ اس وقت کرتے جب رمضان میں جبریل سے ملتے اور ان کے ساتھ مل کر قرآن کا دور کرتے تھے۔ آپ اس وقت سخاوت کرنے میں تیز و تند آندھی سے بھی آگے ہوتے تھے

[2] الاتقان ۔ ج ۱ ۔ ص ۱، زرکشی اس کو ابوشامہ کی طرف منسوب نہیں کرتے (البرھان ج ۱ ۔ ص ۲۳۱ ۔) (ریاض الصالحین باب الجود ص ۲۵۴)

[3] سورۂ ہود آیت نمبر ۱۲۰ ۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ۔[1]	یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے تھے پکار اُٹھے کہ خدا کی امداد کب آئیگی؟

خلاصۂ کلام یہ کہ اسی طرح قرآن تدریجی طور پر نازل ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صبر و ثبات کا سامان بہم پہنچاتا اور انبیائے سابقین کی پیروی کا درس دیتا رہا۔ گاہے صریح الفاظ میں آپ کو صبر کی تلقین کرتا۔

قرآن میں فرمایا:۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ۔[2]	جو وہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے اور ان کو چھوڑنا بھی ہو تو مناسب طریقہ سے چھوڑیے

نیز فرمایا:۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ۔[3]	صبر کیجیے جیسے بڑے بڑے رسولوں نے صبر کیا۔

اظہارِ حزن و ملال سے صریح الفاظ میں منع فرمایا:۔

فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۔[4]	ان کی بات آپ کو غم زدہ نہ کردے ہم ان کی پوشیدہ اور ظاہر باتوں کو جانتے ہیں۔

نیز فرمایا:۔

وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔[5]	ان کا قول آپ کو غم زدہ نہ کردے بے شک سب عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

---

[1] سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۴۔ [2] سورۃ المزمل آیت نمبر ۱۰ [3] سورۃ الاحقاف آیت ۳۵
[4] سورۃ یٰسٓ آیت نمبر ۷۶۔ [5] سورۃ یونس آیت ۶۵۔ اسی مضمون کو سورۃ الحجر (باقی بر صفحہ ۸۱)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ کفار آپ کی ذات سے کوئی عناد نہیں رکھتے اور نہ ہی ذاتی عداوت کی وجہ سے آپ کو جھٹلاتے ہیں بلکہ ان کی اصلی عداوت حق کے ساتھ ہے۔

قرآن میں فرمایا :-

"ہم جانتے ہیں کہ آپ ان کی باتوں سے غم زدہ ہوتے ہیں مگر وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں"[1]

مذکورہ صدر آیت کی تفسیر میں محدث ابن کثیر فرماتے ہیں :-

"جب کفار مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلّی دینے کے لیے یہ آیت نازل کی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی باتیں سن کر غم زدہ ہوتے ہیں۔ ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں اسی طرح دوسری آیت میں فرمایا" ان پر افسوس مت فرمائیے"

ایک اور جگہ فرمایا :-

"شاید آپ اپنی جان کو اس لیے ہلاک کر دیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"

نیز فرمایا :-

"یہ لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں کو تسلیم نہیں کرتے، یعنی حق سے عداوت رکھتے ہیں اور اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں"[2]

قرآن کریم میں انبیائے سابقین کے جو واقعات بار بار بیان کیے گئے ہیں ان میں یہی حکمت مضمر ہے کہ آپ حضرات انبیاء کے اُسوۂ حسنہ پر گامزن رہیں اور صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اگر مشرکین کے مظالم کا سلسلہ جاری رہتا اور وحی جو آپ کے لیے موجب

(بقیہ صفحہ ۸۰) آیت ۸۸ سورۃ النحل آیت ۱۲۷۔ اور سورۃ النمل آیت ۷۰ میں دہرایا۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] سورۃ الانعام آیت نمبر ۳۳۔

[2] تفسیر ابن کثیر ج ۲۔ ص ۱۲۹ السید رشید رضا نے یہ عبارت تفسیر المنار۔ ج ۷ ص ۳۷۲ پر نقل کی ہے

سکون و اطمینان بھی بند ہو جاتی تو آپ بتقاضائے بشریت مایوسی اور حزن و ملال کا شکار ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم و غم حسرت و افسوس اور تنگدلی سے اس لیے روکا تھا کہ آپ دیگر بنی نوعِ آدم کی طرح ایک انسان تھے۔ اس لیے ان نفسی تاثرات کی استعداد آپ کی طبیعت میں پوری طرح موجود تھی۔ سید رشید رضا نے مذکورہ ذیل آیت کی تفسیر میں یہ حقائق بیان کیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ؕ[۵۱]	آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا اور انہوں نے تکذیب پر صبر سے کام لیا اور انہیں ستایا گیا حتیٰ کہ ان کے پاس ہماری امداد آگئی۔

سید رشید رضا مذکورہ صدر آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

"یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وجہ اطمینان و سکون ہے۔ اس آیت میں آپ کو آگاہ کیا گیا ہے کہ خدا کی سنت حضرات انبیاءؑ کے بارے میں کیا رہی ہے۔ یا یوں کہیے کہ آپ کو یہ سنت یاد دلائی گئی اور اس کی پیروی کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ آیت اس مضمون کی پہلی آیت نہ تھی جو اس ضمن میں نازل ہوئی۔ اگر یہ انسانی فطرت نہ ہوتی کہ ایک غم سے دوسرا غم زائل ہو جاتا ہے تو سکون و اطمینان کے سلسلہ میں متعدد و مکرر آیات کے نازل ہونے کی کوئی حکمت سمجھ میں نہ آتی ظاہر ہے کہ آپ رات کی نماز میں قرآنِ کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ بعض اوقات آپ ایک سورت تلاوت فرماتے اور چند دنوں کے بعد پھر اس کی تلاوت کی باری آتی۔ اس لیے آپ کو بار بار تسلی دلانے اور صبر کی تلقین کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ جب حزن و ملال کے

۵۱؎ سورۃ البقرۃ آیت ۲۱۴۔

اسباب متکرر ہوتے تو ان کے ساتھ دوبارہ غم کا ظہور بھی ناگزیر تھا۔ اور غم کا سبب یہ تھا کہ جب آپ کفار کے حالات ان کی جدل و نزاع اور انذار و تخویف کے بیانات پر مشتمل آیات تلاوت کرتے تو غم زدہ ہو جاتے تھے[1]

وحی کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تطابق و توافق کی دوسری صورت یہ تھی کہ قرآن کے بالاقساط نازل ہونے سے اس کو یاد کرنا آپ کے لیے آسان ہو گیا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں "اطمینان قلب" کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے آپ کے سینہ میں قرآن کا محفوظ کرنا مراد ہے۔ کیونکہ آپ اُمّی ہونے کے باعث لکھنے پڑھنے سے واقف نہ تھے اس لیے قرآن کو تدریجاً نازل کیا تاکہ آپ آسانی سے یاد کر سکیں۔ بخلاف ازیں دیگر انبیاء لکھے پڑھے ہوتے تھے۔ اس لیے وہ ایک ہی مرتبہ نازل شدہ کتاب کو یاد کر سکتے تھے[2]

محدّث ابن فورک[3] اس پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تورات بیک وقت اس لیے اُتاری گئی تھی کہ وہ حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی جو پڑھے لکھے تھے۔ اور قرآن کو تدریجی طور پر غیر مکتوب صورت میں اس لیے نازل کیا کہ وہ نبی اُمّی پر نازل کیا گیا تھا"[4]

عہد رسالت میں قرآن کے مسلمانوں کے حالات سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہونے کی متعدد صورتیں ہیں۔ مگر غرض و غایت سب کی ایک ہے اور وہ یہ کہ مخاطبین کے حالات کو ملحوظ رکھا جائے۔ ان کے جدید و ترقی پذیر معاشرہ میں ان کی ضروریات و حاجات کو نظر انداز نہ کیا جائے

---

[1] تفسیر المنار۔ ج ۷۔ ص ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ [2] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۳۱۔

[3] ابن فورک کا نام و نسب محمد بن حسن بن فورک اور کنیت ابوبکر ہے۔ بڑے مشہور متکلم اور اصولی تھے۔ تفسیر قرآن اور اصول فقہ کے موضوع پر آپ نے ایک صد سے زائد کتب تصنیف کیں ۴۰۶ھ میں وفات پائی۔ دیکھیے (انباہ الرواۃ ج ۳۔ ص ۱۱۰۔ نیز شذرات الذہب ج ۳۔ ص ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ و ابن خلکان۔ ج ۱۔ ص ۴۸۲)۔

[4] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۴۱۔ بحوالہ البرہان ج ۱۔ ص ۲۳۱۔

ان پر یکایک ایسے احکام و اخلاق نہ ٹھونسے جائیں جن کے وہ خوگر نہ ہوں۔

علامہ مکی[1] اپنی کتاب ناسخ و منسوخ میں رقم طراز ہیں۔

"قرآن کا تدریجی نزول اس کے یکایک نازل ہونے کی نسبت ادعیٰ الی القبول ہے اگر قرآن بیک وقت نازل ہوتا تو اس میں بہت سے احکام و مناہی ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جو حدیث روایت کی ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے[2]۔ فرمایا سب سے پہلے ایک سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا ذکر تھا۔ جب لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگ گئے تو پھر حلال و حرام سے متعلق احکام اترنے لگے۔ اور اگر شروع ہی میں شراب کی حرمت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ کہتے "ہم شراب کو ترک نہیں کریں گے" اور اگر زنا کی ممانعت نازل ہوتی تو لوگ اس کو ماننے سے انکار کر دیتے[3]

حضرت عائشہ صدیقہ رض کے قول سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ شاید زنا کی حرمت بھی شراب کی طرح تدریجی طور پر نازل ہوئی۔ حالانکہ حضرت عائشہ رض کا مقصد یہ نہیں تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ زنا کی حرمت ایک ہی دفعہ نازل ہوئی تھی۔

قرآن میں فرمایا گیا تھا۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ[4] اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک وہ بے حیائی

---

[1] مکی بن ابی طالب قیسی مشہور قاری تھے کنیت ابو محمد ہے۔ دراصل قیروان کے رہنے والے تھے۔ آپ نے علوم القرآن اور عربیت پر بہت سی کتابیں تالیف کیں۔ قرطبہ میں سکونت گزین تھے۔ دو دفعہ مصر آئے ۴۳۷ھ میں وفات پائی۔ ایک کتاب الناسخ والمنسوخ ان کی طرف منسوب ہے۔ امام سیوطی نے یہ عبارت اس سے اخذ کی ہے۔ القفطی نے ان کی متعدد تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ان کی ایک کتاب، انتخاب کتاب الجرجانی فی نظم القرآن بھی دیکھیے انباہ الرواۃ۔ ج ۳۔ ص ۳۱۳۔ ۳۱۹ وشذرات الذہب ج ۳۔ ص ۲۶۰۔ ۲۶۱ نیز وفیات الاعیان۔ ج ۲ ص ۱۲۰

[2] صحیح بخاری۔ ج ۶۔ ص ۱۸۵۔ [3] الاتقان جلد ۱۔ ص ۷۳۔ [4] سورۃ الاسراء آیت نمبر ۳۲۔

فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا ۔ کا کام ہے اور بہت بُرا راستہ ہے ۔

محترمہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ آغاز اسلام میں سب سے پہلے کون سے احکام نازل ہوئے ۔ خلاصہ یہ کہ آغاز نزول کے وقت حلال و حرام کے مسائل نہیں اُترے تھے بلکہ سب سے پہلے اصولِ ایمان بیان فرمائے ۔ چنانچہ آغازِ وحی میں زنا کی حرمت نازل نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی حرمت عرصۂ دراز کے بعد نازل ہوئی تھی ۔ اس لیے کہ زنا کی حرمت بالاتفاق مکہ میں نازل ہو چکی تھی ۔ نیز یہ کہ اس میں شراب کی طرح مختلف مراحل و ادوار پیش نہیں آئے تھے ۔ بلکہ اس قبیح فعل کو بہ یک جنبشِ قلم حرام ٹھہرایا گیا تھا ۔ شراب اور جُوا کو تدریجاً اس لیے حرام ٹھہرایا گیا تھا کہ گناہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ فوائد بھی ہیں ۔ مگر زنا میں صرف قباحت کا پہلو ہی پایا جاتا ہے ۔ اس لیے زنا اور سِفاح (بدکاری) کی کوئی صورت بھی شرعاً روا نہیں ہے ، یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام نے تمام ظاہری باطنی فواحش و منکرات کو حرام ٹھہرایا اسی طرح زنا کو قطعی و حتمی طور پر ممنوع قرار دیا ہے ۔

اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ اسلام نے فرد اور معاشرہ کی گہرائی اور سطحیت کو یکساں قرار نہیں دیا ، بلکہ ان میں فرق کیا ہے ۔ ہر وہ معاملہ جو بنی نوعِ انسان کے نفوس کی گہرائی میں اتر کر ایک شعوری عادت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہو یا وہ معاملہ جو معاشرہ کی گہرائی میں اتر کر ایک اجتماعی رسم یا ایک سرکاری رواج کی صورت اختیار کرے ۔ اسلام اس کے بارے میں مہلت اور تاخیر سے کام لیتا ہے ۔ اسلام کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ وہ تاخیر جس میں نظم و ضبط پایا جاتا ہو اس عجلت سے بہتر ہے جس میں ربط و ضبط کا فقدان ہو ۔

ہر وہ سطحی معاملہ جو کسی فرد یا معاشرہ پر اثر انداز ہو کر اس کی پاکیزہ فطرت کو تبدیل کر دے تو وہ انسانی زندگی میں ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے جس سے خاموشی اختیار کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے ۔ ایسے معاملات کے بارے میں اسلام دوٹوک فیصلہ صادر کرتا ہے ۔ اور جدل و نزاع کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا ۔ ایسے امور میں جدل و نزاع وہی شخص اختیار کرتا

ہے جو فطرت سے بغاوت اختیار کرکے انسانی عزو وقار سے محروم ہو چکا ہو۔[1]

مندرجہ بالا بیان کے پیش نظر اسلام نے آفاق و انفس اور فرد و معاشرہ کے عُمق و سطحیت میں فرق روا رکھا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے قتل و چوری چھین جھپٹ حرام خوری اور معاملات میں فریب دہی کے تمام اقسام کو بہ یک دفعہ اسی طرح حرام ٹھہرایا جس طرح زنا کو۔ ان تمام امور کو ایسے قطعی اور صریح الفاظ میں حرام ٹھہرایا جن میں تساہل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ مذکورہ صدر امور و اشیاء کی حرمت بتاخیر نازل ہوئی بلکہ اکثر اشیاء کو ہجرت کے بعد مدینہ میں حرام ٹھہرایا گیا۔ مگر علی الاطلاق یوں کہنا درست نہیں کہ ان کو تدریجی طور پر حرام قرار دیا گیا تھا۔ بخلاف ازیں حق بات یہ ہے کہ جس طرح زنا کو آیت "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی"[2] میں دو ٹوک الفاظ میں حرام ٹھہرایا۔ اسی طرح قتل کو آیت "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ" کے ذریعہ ممنوع اور ناروا قرار دیا۔

جب حکمت ربانی نے سرقہ کو حرام ٹھہرانا چاہا تو بڑے واضح اور کھرے انداز میں فرمایا:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا۔[3]

اور چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کے کیئے کا بدلہ ہے۔

پھر اسی وضاحت و صراحت کے ساتھ بلا وجہ مال کی چھین جھپٹ سے منع فرمایا۔

"اور اپنے مال باہم ناروا طریقہ سے مت کھاؤ اور ان کو حکام کے پاس اس لیے نہ لے جاؤ کہ گناہ کے ساتھ لوگوں کے مال کے ایک حصہ کو کھا جاؤ گے جب کہ تم جانتے بھی ہو۔"[4]

---

[1] تفسیر ظلال القرآن ۔ج ۲۔ص ۹۰۔۹۱
[2] سورۃ النساء آیت ۹۲۔
[3] المائدہ آیت نمبر ۴۱۔
[4] سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۸۔

باہمی معاملات میں ہر قسم کے دھوکہ اور فریب کو قرآن کریم میں اسی طرح کے واضح انداز میں حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ ایسے معاملات کی حرمت اگر کتاب اللہ میں نہیں تو سُنّت مطہرہ میں ضرور موجود ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اسلام شرعی احکام کے تدریجی نزول کا کس قدر بھی خواہاں ہو مگر وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وقتِ ضرورت تک تاخیر بیان اور احکام کے تدریجی نزول کو باہم خلط ملط کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ دو چیزیں ہیں نہ کہ ایک۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کے متعلق بعض احکام اور بعض اوامر ونواہی کو بتاخیر بیان کیا۔ مگر جب ان کو بیان کرنا چاہا تو فی الفور دو ٹوک فیصلہ صادر کر دیا اور اس میں تدریج کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دی اور مسلمانوں کو اپنے اس فیصلہ سے اس لیے آگاہ کر دیا کہ وہ دینی اوامر کی تعمیل شروع کر دیں اور اس ضمن میں شرعی ذمہ داریاں برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مثلاً فی الفور مسلمانوں کو نماز صدقات اور ماہ رمضان کے روزوں کا حکم دیا۔

البتہ نماز شروع میں مطلق تھی اس میں رکعات کی تعداد معیّن نہ تھی اور نمازیں بھی صرف دو تھیں ایک فجر اور دوسری مغرب کی۔ پھر ہجرت سے ایک سال پہلے رکعات کی تعداد معیّن کی گئی۔ اسی طرح آغاز اسلام میں صدقہ وصیام کا حکم مطلق اور بلا قید وشرط تھا۔ زکوٰۃ کی شرح اور روزوں کی تفصیلات ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوئیں یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسلام بڑا آسان مذہب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ[1] (دین میں تم پر کوئی تنگی اور تکلیف نہیں ڈالی،

نیز فرمایا:۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ[2] اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے تنگی

---

[1] سورۃ الحج آیت نمبر ۷۸۔ [2] سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۸۵۔

بِکُمُ الْعُسْرَ۔ | نہیں چاہتا۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ نرمی کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ بندوں کو زیادہ مسائل پوچھنے سے منع کرتا ہے تاکہ وہ مزید نئی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب نہ جائیں۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔[1]	اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت پوچھو کہ اگر تم پر ان کا انکشاف کیا جائے تو تمہیں ناگوار ہو۔

مذکورہ بالا تمام مثالیں "تاخیر بیان تا وقت ضرورت" سے متعلق ہیں اور تدریج سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان احکام کا رابطہ دراصل ان انسانی اخلاق و عادات کے ساتھ ہے جو انسانی فطرت میں راسخ نہیں ہوتیں بلکہ افراد و اقوام کے نفوس میں سطحی طور پر موجود ہوتی ہیں (یعنی نفس انسانی کی گہرائی میں اتری ہوئیں اور اس میں راسخ نہیں ہوتیں)، یہی وجہ ہے کہ زنا، چوری قتل اور حرام خوری کو تدریجاً حرام نہیں ٹھہرایا گیا۔ تدریج کی ضرورت شراب و قمار جیسی چیزوں میں ہوتی ہے۔ جو یا تو شعوری عادات کی حیثیت رکھتی ہوں یا نفسانی امراض کی یا جہاں معاشرہ کو قومی رسم و رواج اور سرکاری رسوم سے چھڑانا مقصود ہو۔

شراب کی تدریجی تحریم

شعوری عادت کے تحت انسان کو نشہ کی جو لت پڑ جاتی ہے اس کی تدریجی حرمت کے بارے میں ہم قرآن کے فیصلہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔ فرمایا:۔

"لوگ آپ سے شراب و قمار کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیں کہ

[1] سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۱۰۱، نیز اسباب النزول للواحدی ص ۱۵۷۔

ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں مگر ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے[۱]"

جو لوگ نشہ کے خوگر تھے اس آیت میں ان کو بتایا گیا ہے کہ حرمت کا انحصار شر کے غلبہ پر ہے۔ یہ درست ہے کہ شراب میں فائدہ بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کی تجارت سے مالی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ شراب پینے سے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ اس کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔ شراب میں ایک قومی و اجتماعی فائدہ بھی ہے کہ شراب کے نشہ میں مخمور ہو کر آدمی فیاضی اور جرأت و جلاوت کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ تاہم ان فوائد کے مقابلہ میں شراب کی مضرت کا پہلو غالب ہے اور وہ یہ کہ شراب بذاتِ خود ایک مرض ہے۔ اور یہی چیز اس کی حرمت کے لیے کافی ہے۔

یہ شراب کی حرمت کی جانب پہلا قدم تھا۔ اس سے مسلمانوں کے دل میں طبعاً شراب کی قباحت کا احساس پیدا ہوا۔ دوسرے مرحلہ پر یہ آیت اتری۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا	اے ایمان والو! جب تم پر نشہ کی کیفیت
الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى	طاری ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں
تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ[۲] ۔	تک کہ تم جاننے لگو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

اس آیت سے شراب نوشی کے مواقع بڑی حد تک گھٹ گئے۔ اس لیے کہ پانچ نمازوں کے اوقات باہم قریب قریب ہیں اور ان میں اتنی مہلت نہیں پائی جاتی کہ شراب کا نشہ دور ہو سکے اس کے بعد قطعی وحتمی الفاظ میں شراب کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ	اے ایمان والو! اس میں شبہ نہیں کہ شراب
وَالْمَيْسِرُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ	قمار اور تھان اور تیر پلید اور شیطانی کام
عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ	ہیں ان سے پرہیز کرو تاکہ تم فلاح پاسکو۔

[۱] البقرۃ۔ نیز تفسیر المنار ج ۲۔ ص ۲۱۹؛ ج ۷ ص ۴۹۔ [۲] سورۃ النساء آیت ۴۳۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ[۱]

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے باعث تم میں بغض و عداوت پیدا کردے اور تمہیں خدا کے ذکر اور نماز سے روک دے کیا تم باز آؤ گے؟

صحابہ نے یہ آیت سن کر فی الفور کہا "اِنْتَهَيْنَا" (ہم باز آگئے) اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فی الواقع شراب نوشی سے باز آگئے۔ جب صبح ہوئی تو صحابہ انتظار کرنے لگے کہ اب جو شخص شراب نوشی کا مرتکب ہوگا اس پر شرعی حد قائم کی جائے گی۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر ہم نے شراب نوشی کا ارتکاب کیا تو لوگوں کو پتہ چل جائے گا اور پھر ہم پر شرعی حد قائم کی جائے گی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قرآن رفتہ رفتہ اتر کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بقول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ" (قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا) یعنی آپ قرآنی اخلاق و عادات کے خوگر بن گئے۔ قرآن نے صحابہ کرام کے دلوں کو ایمان خالص مخلصانہ عبادت اور اخلاقِ جمیلہ کے زیور سے اس وقت آراستہ کیا۔ جب پہلے ان کے رسوم باطلہ اور عقائدِ فاسدہ پر کاری ضرب لگا کر ان کا استیصال کر دیا۔ تدریجی نزول کا فائدہ یہ ہوا کہ صحابہ اس کو اپنے سینوں میں محفوظ کرتے چلے گئے۔ قرآن نے صحابہ کے عزائم میں اس حد تک استحکام پیدا کیا کہ وہ اُن کا علمی و عملی دستور بن گیا۔ قرآن صحابہ کے لیے ایک عظیم درس گاہ تھی جس کے فارغ التحصیل قومی ہیرو بن گئے۔ آیتِ کریمہ "وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ[۲]" کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں[۳] "قرآن کو جبریل نے بندوں کے کلام اور اعمال کے جواب میں اُتارا" غالباً ترجمانِ قرآن حضرت ابن عباسؓ کا اشارہ اسی

---

[۱] سورۃ المائدہ آیت نمبر ۹۱۔ [۲] سورۃ الفرقان آیت ۳۳۔

[۳] طبرانی اور بزار نے اس کو ایک سند سے اور ابن ابی حاتم نے دوسری سند سے روایت کیا ہے (الاتقان ج ۱۔ ص ۸۱ نیز ج ۱۔ ص ۷۱) اس کا مفصل بیان آگے آئے گا۔

جانب ہے کہ قرآن کے تدریجی اور حسب ضرورت اور بروقت نزول نے صحابہ کی عمدہ تربیت کا سامان بہم پہنچا دیا۔

قرآن کریم نے نازل ہوکر جاہلی عصبیت اور فخر بالآباء کو مٹا دیا اور اس کی جگہ تقویٰ کو دے دی۔ اس ضمن میں سازگار فضا پیدا کرنے کے لیے اس نے زر خرید غلاموں کو آقا کی مسند پر فائز کر دیا۔ تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ سیاہ فام بلال حبشی رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے دن کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیتے ہیں۔ مشرکین مکہ اس پر اظہار حیرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"کیا یہ سیاہ فام غلام کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیتا ہے؟"

کفار کا یہ طعن سن کر آیت قرآنی نازل ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اشخاص و رجال کی قدر و قیمت کا معیار و مدار کیا چیز ہے؟

ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ[1]	"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔ اس میں شبہ نہیں، کہ اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔"

[1] سورۃ الحجرات آیت ۱۳۔ نیز اسباب النزول للسیوطی ص ۱۲۲۔

رہبانیت کا عدمِ جواز :

جہاں تک اجتماعی صلاح وفلاح کا تعلق ہے اسلام نے چاہا کہ امتِ مسلمہ کا اعتدال و توازن برقرار رہے۔ اور یہ امّت عقائد و اخلاق اور عبادات و معاملات میں اعتدال کی راہ پر گامزن رہے۔ چنانچہ اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے اسلام نے عبادات و اخلاق کے پیمانوں کو درست کیا اور امّت کو ایسی باتوں کو دعوت دی جن سے دینی زندگی جلا پائے اور دینی عقائد و معاملات کا احساس قلب وضمیر میں تابندہ و درخشندہ ہو۔

چنانچہ جب صحابہ کی ایک جماعت نے نسل کشی اور عورتوں سے علٰحدگی کا عزم کیا اور یہ ارادہ باندھا کہ وہ گوشت اور گھی نہیں کھائیں گے۔ موٹا جھوٹا پہنیں گے۔ صرف اسی قدر کھائیں گے جس سے زندہ رہ سکیں۔ زمین میں تارک الدنیا درویشوں کی طرح چلیں پھریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ انسانی فطرت سے بغاوت اور انحراف تھا۔ اس کو سیدھا کرنے کے لیے یہ آیت کریمہ اتری

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ؁	اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان میں لذیذ چیزوں کو حرام مت کرو اور حدود سے آگے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

عجیب بات یہ ہے کہ فطرتِ انسانی سے صحابہ کے انحراف کو قرآن نے "اعتداء و عدوان" (حق سے تجاوز) قرار دیا ہے۔

باقی رہا فرد کا معاملہ تو قرآن ایک ایک فرد کو جداگانہ طور پر مخاطب کرتا ہے۔ وہ انسان کے تمام باطنی امور و اسرار پر ایک ہمہ گیر نگاہ ڈالتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں صرف ایک بات پر اکتفا کرتے ہیں۔ آغاز اسلام میں صحابہ پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑے گئے اور ان کو بڑی

؁ سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۸۷ - ۸۸ - نیز اسباب النزول ص ۵۷ -

بڑی مشکلات میں مبتلا کیا گیا تھا۔ مگر صحابہ نے بکمالِ صبر و شکر ان کو برداشت کیا۔ مگر جب آیتِ قرآنی :-

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ	اور اگر تم اپنے جی کی باتوں کو ظاہر کرو، یا
اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ؕ[1]	انہیں چھپاؤ تو خدا تم سے حساب لے گا۔

نازل ہوئی تو صحابہ اس عظیم ذمہ داری کو برداشت نہ کر سکے اور اس کو اپنی استطاعت سے بالاقرار دینے لگے۔ صحابہ حیران تھے کہ ان کے دلی خیالات پر کیسے گرفت کی جائے گی جب کہ انہوں نے ابھی ان خیالات کو عملی جامہ پہنایا ہی نہیں۔ صحابہ نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کی :-

"اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل کی ہے مگر ہم اس کی تعمیل سے قاصر ہیں"

یہ سُن کر بارگاہِ ربانی سے جبریل نازل ہوئے اور یہ آیت کریمہ لائے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا	اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ
وُسْعَھَا لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ	تکلیف نہیں دیتے۔ انسان کو وہی ملے گا
عَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ ؕ[2]	جو اس نے کیا اور اس کام پر سزا دی جائے
	گی جس کا وہ مرتکب ہوا۔)

اس آیت کے نازل ہونے سے بڑی سہولت پیدا ہوئی اور صحابہ کا خطرہ دُور ہو گیا۔

تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کا نزول آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صادق ہونے کی وجدانی دلیل ہے، تو بخدا وحی کا نذریجی نزول اس بات کا منطقی ثبوت اور اس امر کی برھانِ قاطع ہے کہ قرآن کریم خداوندِ علیم و حکیم کا کلامِ مقدس ہے جو اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہدایت و موعظت اور تفہیم و تبیین کے لیے اتارا۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۸۴۔

[2] سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۶ نیز اسباب النزول ص ۲۶۔ امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اس آیت نے سابقہ آیت کو منسوخ کر دیا۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کو منسوخ قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ آگے چل کر ان سخ والمنسوخ کی ...

بابِ دوم

تاریخ القرآن

فصلِ اوّل

قرآن کی جمع وتدوین

جمع قرآن کا مفہوم :

جمع قرآن کے دو معنی ہیں، اور دونوں کے دلائل موجود ہیں :

(۱) جمع کے ایک معنی ہیں قرآن کو حفظ کرنا اور سینہ میں جگہ دینا۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ قرآن کو آپ کے سینہ میں محفوظ کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اسی معنی کے اعتبار سے حُفاظ قرآن کو جماعِ قرآن بھی کہتے ہیں۔

(۲) جمع کے دوسرے معنی قرآن کو لکھنے کے ہیں۔ پھر لکھنے کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً :

(۱) قرآن کی آیتوں اور سورتوں کو علیحدہ علیحدہ لکھنا۔

(۲) ایک سورت کی آیات کو بالترتیب ایک صحیفہ میں لکھنا۔

(۳) قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کو بالترتیب مختلف صحیفوں میں لکھ کر ان کو کتابی صورت میں ایک جگہ جمع کر دینا۔

جہاں تک جمع کے پہلے معنی کا تعلق ہے یہ وصف دیگر صحابہ سے قبل آپ کی ذات میں موجود تھا۔ بلکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سید الحفاظ تھے۔ عہدِ رسالت میں بہت سے صحابہ کو پورا قرآن یاد تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے صحابہ قلیل التعداد نہ تھے۔ بقول امام قرطبی بئرمعونہ کے واقعہ میں ستّر قاری شہید ہوئے تھے۔ اسی قدر حفاظ قرآن صحابہ رضہ عہدِ رسالت میں شہید کیے گئے تھے[۱]۔

[۱] الاتقان، ص ۱۲۲۔

اور اگر ہم ظاہری روایات پر عمل کریں جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کی ہیں تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں حفاظِ قرآن کی تعداد سات[1] سے زیادہ نہ تھی۔ یہ صحیح بخاری کی کسی ایک روایت میں ان سات صحابہ کے نام یکجا نہیں ملتے۔ بلکہ تین روایات کو جمع اور مکرر اسما، کو حذف کرنے سے سات حفاظِ قرآن کے نام پورے ہوتے ہیں[2]۔ اسی لیے مشہور مستشرق بلاشیر (BLACHERE) کہتا ہے کہ حدیث نبوی سے صرف سات حفاظِ قرآن صحابہ کا پتہ چلتا ہے۔ مگر محدثین نے ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حصر و عدد پر مشتمل الفاظ صحیح معلوم نہیں ہوتے۔ وہ اس کی بہت عمدہ تاویل کرتے ہیں جو بلاشیر کے علم میں نہیں ہے۔

امام ماوردی[3] لکھتے ہیں:

"یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ قرآن کو صرف چار[4] صحابہ نے مکمل کیا۔ حالانکہ

---

[1] امام سیوطی نے الاتقان ج ۱ ص ۱۲۱۔ النوع العشرون کو بخاری کی مذکورہ صدر تین روایات کے ساتھ شروع کیا ہے۔ ہر سہ احادیث حسب ذیل ہیں:

(۱) عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ چار صحابہ سے قرآن سیکھو۔ یعنی عبداللہ بن مسعود، سالم، معاذ بن جبل اور اُبَی بن کعب سے۔

(۲) قتادہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک سے پوچھا عہدِ رسالت میں قرآن کس نے جمع کیا تھا؟ کہا چار انصاریوں نے۔ یعنی اُبَیّ بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید نے۔ میں نے کہا کونسا ابو زید؟ انس نے کہا وہ میرے چچا تھے۔

(۳) حضرت ثابت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے وفات پائی۔ اس سے قبل چار صحابہ کے سوا کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا تھا۔ یعنی ابوالدرداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید۔ (دیکھیے ان حفاظِ قرآن کے نام صحیح بخاری، باب ۱۷ کتاب مناقب الانصار)۔

[2] وہ سات صحابہ یہ ہیں: عبداللہؓ بن مسعود، سالمؓ بن معقل مولیٰ ابی حذیفہ۔ معاذؓ بن جبل۔ اُبَیؓ بن کعب۔ زیدؓ بن ثابت۔ ابوزیدؓ۔ ابوالدرداءؓ۔ مگر بلاشیر نے دوسری جگہ سعید بن عُبَید کا نام بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ قاری تھے۔ (الاصابۃ لابن حجر ج ۲، ص ۴۸؛ نمبر ۳۱۶۷)

[3] الماوردی کا نام علی بن حبیب اور کنیت ابوالحسن ہے۔ آپ شافعی المذہب تھے (باقی بر صفحہ آئندہ)

صحابہ مختلف بلاد و امصار میں منتشر ہو چکے تھے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ قرآن کو صرف چار صحابہ نے جمع کیا تھا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ سیکڑوں صحابہ نے قرآن کے پورے اجزاء کو اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا تھا۔ شیخ فرماتے ہیں کہ امام ابو عُبَید قاسم بن سلّام[۱] نے کتاب القراءات کے آغاز میں قاری صحابہ کے اسماء ذکر کیے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے کافی صحابہ کے نام گنائے ہیں[۲]۔

امام سیوطی نے ابو عبید کی کتاب القراءات سے نقل کر کے اپنی کتاب الاتقان میں قاری صحابہ کے نام ذکر کیے ہیں۔ اسماء مذکورہ کی ترتیب یوں ہے:

مہاجرین صحابہ:

حضرت ابوبکرؓ۔ عمر فاروقؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ طلحہؓ۔ سعدؓ۔ ابن مسعودؓ۔ حذیفہؓ۔ سالمؓ۔ ابوہریرہؓ۔ عبداللہ بن سائبؓ۔ عبادلہ اربعہ[۳] (یعنی عبداللہؓ بن عباس۔ عبداللہؓ بن عمرو بن العاص عبداللہؓ بن عمر۔ عبداللہؓ بن زبیر) عائشہؓ۔ حفصہؓ۔ امّ سلمہؓ۔

انصار:

عُبادہؓ بن صامت۔ معاذؓ ابو حلیمہ۔ مجمعؓ بن جاریہ۔ فضالہؓ بن عُبید۔ مسلمہؓ بن مخلد۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) ان کی تصانیف میں "الاحکام السلطانیہ" اور "ادب الدنیا والدین" بہت مشہور ہیں۔ ۴۵۰ھ میں وفات پائی (شذرات الذہب ج ۳۔ ص ۲۸۵-۲۸۶)

[ک] چار صحابہ اس لیے کہا کہ بخاری کی ہر سہ روایات میں صرف چار صحابہ کے اسماء مذکور ہیں جیسا کہ ہم قبل ازیں حاشیہ میں بیان کر چکے ہیں۔

[۱] قاسم بن سلّام ہَرَوی اَزدی خُزاعی ان کی کنیت ابو عُبَید ہے۔ یہ حدیث و فقہ اور ادب کے کبار ائمہ میں سے تھے۔ آپ کی مشہور ترین تصنیف "الغریب المصنف" ہے جو ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ آپ کی کتاب "الاموال" بھی بہت مشہور ہے۔ وہ طبع ہو چکی ہے ۲۲۴ھ میں فوت ہوئے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ ص ۵۔ نیز تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۱۵)

[۲] البرہان ج ۱۔ ص ۲۴۲۔ [۳] عبادلہ یعنی چاروں عبداللہ جو صحابہ میں مفتی ہونے کے اعتبار سے

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ مذکورہ صدر صحابہ میں سے بعض نے آنحضورؐ کی وفات کے بعد حفظِ قرآن کی تکمیل کی۔[1]

جن مہاجرین و انصار صحابہ اور اُمّہات المومنین کے اسماء گرامی قاسم بن سلاّم نے ذکر کیے ہیں انھوں نے قرآن کریم کو یاد کیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تھا اور اس طرح وہ نبی کریمؐ کے براہِ راست شاگرد اور آپ ان کے استاذ محترم تھے۔ جن صحابہ نے قرآن یاد کیا مگر آپ کو سنا نہ سکے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً جب کہ ہم ان کے زمرہ میں ان صحابہ کو بھی شامل کر دیں جنہوں نے حفظِ قرآن کی تکمیل سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کی۔ حافظ ذہبی[2] طبقات[3] القراء کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

"یہ ان لوگوں کی تعداد ہے جنہوں نے قرآن کریم یاد کر کے آنحضورؐ کو سنایا تھا اور ان کی اسانید ہم تک پہنچ چکی ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن حفظ تو کیا مگر ان کی سند ہم تک نہیں پہنچی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے"۔[4]

عہدِ رسالت میں حفّاظِ قرآن کی تعداد کتنی بھی زیادہ ہو اس میں شبہ نہیں کہ ان سب کو قرآن کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا، وہ شغف کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ قرآن کریم کا پڑھنا اور سننا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بخاری اور مسلم نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب اشعری (حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ہم قبیلہ) لوگ رات کو اپنے

---

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۲۴

[2] حافظ شمس الدین الذہبی کا نام محمد بن احمد بن عثمان بن قائماز ہے۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم محدث تھے۔ علم حدیث میں آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے ۷۴۸ھ میں وفات پائی (الدرر الکامنۃ ج ۲ ص ۲۹۸)

[3] پروفیسر محمد ابوالفضل ابراہیم نے ذکر کیا ہے کہ دار الکتب المصریۃ میں طبقات القراء کا ایک عکسی نسخہ موجود ہے۔ اس کا نمبر ۱۵۳۷ ہے۔ (البرہان ج ۱ ص ۲۴۲۔ حاشیہ نمبر ۲) علامہ زرکشی نے اس کتاب کا نام "معرفۃ القراء" بتایا ہے۔

[4] البرہان ج ۱ ص ۲۴۲

گھروں میں داخل ہوتے ہیں تو میں ان کی آواز پہچان لیتا ہوں۔ وہ رات کے وقت جب اپنے گھروں میں قرآن پڑھتے ہیں تو میں ان کے گھروں کو پہچان لیتا ہوں اگرچہ دن کے وقت میں ان کے یہاں کبھی نہیں گیا۔"[۱]

صحابہ ایک دوسرے کو قرآن کریم سناتے اور یاد کرتے تھے۔ تاکہ فرضی اور نفلی نمازوں میں شب و روز سرًا و جہرًا روانی سے اس کی تلاوت کر سکیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس ضمن میں ان کی امداد کرتے، حوصلہ افزائی فرماتے اور ترغیب دیتے تھے۔ جس کو زیادہ قرآن یاد ہوتا اس کو مامور فرماتے کہ وہ اپنے بھائیوں کو قرآن پڑھائے۔ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مدینہ پہنچتا تو آنحضورؐ اس کو کسی صحابی کے سپرد کر دیتے جو اسے قرآن پڑھاتا۔ مسجد نبوی میں تلاوت قرآن کا یہ عالم تھا کہ مسجد گونج جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آپ نے آہستہ تلاوت کا حکم دیا تاکہ ایک دوسرے کی تلاوت میں خلل اندازی نہ ہو۔[۲]

قرآن کریم پڑھانے میں صحابہ کرام میں سے سات حضرات نے خصوصی نام پایا تھا۔ ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

عثمانؓ بن عفان۔ علیؓ بن ابی طالب۔ اُبیؓ بن کعب۔ زیدؓ بن ثابت۔ عبداللہؓ بن مسعود۔ ابوالدرداءؓ۔ ابوموسیٰؓ اشعری رضی اللہ عنہم۔

حضرت اُبی بن کعبؓ سے صحابہ کی کثیر تعداد نے قرآن کریم پڑھا۔ ان میں سے ابوہریرہؓ ابن عباس اور عبداللہ بن سائب کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے زید بن ثابتؓ سے بھی استفادہ کیا۔ پھر ان صحابہ سے کثیر تابعینؒ نے قرآن پڑھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عہد رسالت میں قرآن کی حفظ و تلاوت کے لیے گویا ایک درس گاہ عالم وجود میں آگئی تھی۔[۳]

---

[۱] مناہل العرفان للزرقانی ج ۱ ص ۲۱۳۔ [۲] حوالہ مذکور ج ۱ ص ۲۳۴

[۳] الاتقان ج ۱ ص ۱۲۵۔ سیوطی نے یہ معلومات ذہبی کی کتاب "القراء" سے اخذ کیے اور اس طرف اشارہ

ابن الجزری[1] پورے جزم و وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ قرآن کی نقل واشاعت کے سلسلہ میں کتابت کے بجائے قلب وصدر پر اعتماد امتِ محمدی کی عظیم خصوصیت ہے، وہ اس کی دلیل میں ایک صحیح حدیث پیش کرتے ہیں جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرے رب نے مجھے حکم دیا کہ اُٹھ کر قریش کو تبلیغ کیجیے میں نے کہا اے باری تعالیٰ! تب تو قریش میرا سر پھاڑ دیں گے۔ فرمایا میں تجھے آزمانا چاہتا ہوں اور تیری وجہ سے دوسروں کو بھی آزماؤں گا۔ اور تجھ پر ایسی کتاب نازل کروں گا جسے پانی بھی نہیں دھو سکے گا۔ آپ سوتے اور جاگتے اس کی تلاوت کریں گے"۔[2]

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایسی کتاب ہے جو حافظہ کی مدد سے پڑھی جا سکتی ہے۔ حافظِ قرآن کو اس بات کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی کہ وہ اوراق پر سیاہی سے لکھا ہوا قرآن پڑھے جو مٹ بھی سکتا ہے اور دھونے سے اس کے حروف زائل بھی ہو سکتے ہیں۔

اگر قرآن کے جمع کرنے سے اس کی کتابت مراد لی جائے تو صدرِ اول کے تین ادوار میں اس کی تین صورتیں ملتی ہیں:

(۱) عہدِ رسالت۔

(۲) خلافتِ صدیقی

(۳) خلافتِ عثمانی

۱۔ عہدِ رسالت میں کتابتِ قرآن:

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل صحابہ کو کاتبِ وحی مقرر فرمایا تھا:

[1] محمد بن محمد بن محمد ابوالخیر شمس الدین الجزری اپنے زمانہ کے شیخ القراء تھے۔ آپ کی مشہور کتاب "النشر فی القراءات العشر" ہے۔ ۸۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ (الاعلام ج ۳۔ ص ۹۷۸)

[2] مناہل العرفان للزرقانی ج ۱ ص ۲۳۵

حضرت ابوبکرؓ۔ عمر فاروقؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ معاویہؓ۔ زیدؓ بن ثابت۔ اُبَیّؓ بن کعب۔ خالدؓ بن ولید۔ ثابتؓ بن قیس۔ رضی اللہ عنہم۔

قرآن کا جو حصہ نازل ہوتا آپ صحابہ کو مامور فرماتے کہ اسے تحریر کریں۔ یہاں تک کہ کتابت کے پہلو بہ پہلو قرآن کریم کو سینوں میں بھی محفوظ کر لیا گیا[1]۔

محدث حاکم نے مستدرک میں زید بن ثابت سے بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق روایت کیا ہے کہ زید بن ثابت نے کہا ہم عہدِ رسالت میں "رِقاع"[2] (ٹکڑوں) سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔

مذکورہ صدر حدیث میں "رقاع" کا جو لفظ وارد ہوا ہے یہ رقعہ (ٹکڑا) کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق چمڑے، کپڑے اور کاغذ کے ٹکڑے پر کیا جاتا ہے۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ کاتبینِ وحی عہدِ رسالت میں کتابت کے لیے کس قسم کا سامان استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ نازل شدہ قرآن کریم کو پتھر کی باریک اور چوڑی سلوں، کھجور کی ٹہنیوں، اونٹ یا بکری کے شانہ کی ہڈیوں، اُونٹ کے کجاوہ کی لکڑیوں اور چمڑہ کے ٹکڑوں پر تحریر کیا جاتا تھا[3]۔

ترتیب سُوَر و آیات:

حضرت زید کی روایت میں مختلف اشیاء کے ٹکڑوں سے قرآن جمع کرنے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹکڑوں سے نقل کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق قرآنی آیات و سُوَر کو مرتب کیا جاتا تھا۔ اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ ہر سورت کی آیات کی ترتیب اور ان سے پہلے بسم اللہ کی تحریر ایک توقیفی امر ہے جو آنحضورؐ کے حکم سے

---

[1] مشہور مستشرق بلاشیر (BLACHERE) نے کاتبینِ وحی صحابہ کی تعداد چالیس بتائی ہے۔ دیگر مستشرقین مثلاً شفالی ہیں اور کازانوفا کا زاویۂ نگاہ بھی یہی ہے۔ موخر الذکر نے اس ضمن میں طبقات ابن سعد، طبری، نووی اور سیرت حلبی پر اعتماد کیا ہے۔

[2] الاتقان ج ۱ ص ۹۹۔ نیز البرہان ج ۱ ص ۲۳۷۔

[3] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۱۔

کیا گیا ہے اور اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ترتیب کا عکس جائز نہیں[1]۔

اس کی دلیل میں صحیح بخاری کی وہ حدیث پیش کی جاتی ہے جو عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آیتِ قرآنی "وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا[2] کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ پھر آپ نے اس کو قرآن کریم کے نسخہ میں باقی کیوں رہنے دیا ہے"؟ حضرت عثمان نے فرمایا "بھتیجے! میں قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا[3]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کو معلوم تھا کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے مگر تاہم اس آیت کو اس کی جگہ سے تبدیل نہ کر سکے۔

کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ حضرت جبریل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ترتیب قرآن سے آگاہ کر چکے ہیں۔ اس لیے اب کوئی شخص اس میں تبدیلی کا مجاز نہیں ہے رسول کریم نے صحابہ کو بھی خداوندی ترتیب سے آگاہ کر دیا تھا۔

---

[1] دیکھیے البرہان للزرکشی ج ۱ ص ۲۵۶۔ امام سیوطی نے ترتیب آیات کے توقیفی ہونے کے بارے میں زرکشی کے نقل کردہ اجماع کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد اس ضمن میں موصوف نے ابوجعفر بن زبیر کی "کتاب المناسبات" سے نقل کیا ہے کہ "قرآنی سورتوں میں آیات کی ترتیب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قائم کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا" (الاتقان ج ۱۔ ص ۶۴)۔ باقی رہا زرکشی کا یہ قول کہ "اس ترتیب کا عکس جائز نہیں" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آیات کی اس توقیفی ترتیب پر عمل ضروری ہے اور اس میں تقدیم و تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ اس امر کی وضاحت زرکشی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"بعض علماء نے "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا" کی تفسیر یوں کی ہے کہ "قرآن کو اسی ترتیب کے مطابق بلا تقدیم و تاخیر پڑھیے۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ مورد الزام ہے۔

[2] سورۃ البقرہ، آیت ۲۳۴

[3] صحیح بخاری ج ۶ ص ۲۹۔ نیز الاتقان ج ۱ ص ۱۰۵

امام احمد نے اسنادِ حسن کے ساتھ عثمان بن ابی العاص سے روایت کی ہے کہ میں ایک روز بارگاہِ نبوی میں بیٹھا تھا۔ آپ نے نگاہ اُٹھائی اور پھر نیچے کر کے فرمایا "میرے پاس جبریل آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آیتِ کریمہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی کو فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھیے"۔[1]

کتبِ حدیث میں ایسی لاتعداد روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کاتبینِ وحی صحابہ کو قرآن مجید لکھواتے اور ان کو آیات کی ترتیب سے آگاہ کیا کرتے تھے۔[2] احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے قرآن کریم کی متعدد سورتیں نماز کے دوران یا خطبۂ جمعہ میں ترتیبِ آیات کے ساتھ صحابہ کرام کی موجودگی میں تلاوت کیں۔ یہ اس امر کی صریح دلیل ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ صحابہ کسی سورت کی آیات کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب کے خلاف تلاوت کریں۔ نظر بریں ثابت ہوا کہ آیات کی ترتیب تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہے۔[3]

ترتیبِ سُوَر توقیفی ہے:

جہاں تک سورتوں کی ترتیب کا تعلق ہے وہ بھی توقیفی (بحکم خداوندی اور اس کے آگاہ کرنے پر موقوف و مبنی) ہے۔ آنحضورؐ کی زندگی میں یہ ترتیب معلوم تھی۔ اس کے خلاف کوئی دلیل ہمارے علم میں نہیں۔ ہم اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کے اجتہاد پر مبنی ہے۔ ہم اس بات کو بھی صحیح تصور نہیں کرتے کہ بعض سورتوں کی ترتیب اجتہادی اور بعض کی توقیفی ہے۔

نظر بریں علامہ زرکشی کا یہ قول قابلِ تسلیم نہیں کہ:

---

[1] الاتقان ج ۱۔ ص ۱۰۴۔

[2] صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن باب ۱۸ و کتاب الاحکام باب ۹۷ و مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۰ و ج ۴ ص ۳۸۱۔

[3] الاتقان ج ۱۔ ص ۱۰۵۔

"بعض سورتوں کی ترتیب خدا کی واجب کردہ نہیں بلکہ صحابہ کے اجتہاد پر مبنی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے ہر نسخہ کی ترتیب جداگانہ ہے[۱]"

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ نے اپنے اجتہاد کے مطابق قرآن کریم کے جو ذاتی نسخے مرتب کیے تھے وہ ان کا ایک ذاتی فعل تھا۔ اور انھوں نے کسی دوسرے کو اس کا پابند بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صحابہ نے کبھی یہ نہ کہا کہ ان کی ذاتی ترتیب کی مخالفت حرام ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے قرآن کے یہ نسخے اپنے لیے مرتب کیے تھے لوگوں کے لیے نہیں۔ جب پوری اُمتِ مسلمہ حضرت عثمان کے مرتب کردہ نسخہ پر متفق ہوگئی تو صحابہ نے بھی اس سے اظہارِ اتفاق کیا اور اپنے ذاتی نسخے ترک کر دیے۔ اور اگر وہ ترتیبِ آیات و سُوَر کے معاملہ کو اپنے اجتہاد پر مبنی تصور کرتے تو اپنے ذاتی نسخوں پر قائم رہتے اور حضرت عثمان کے نسخہ سے متفق نہ ہوتے۔

اس پر طرہ یہ کہ زرکشی خود مانتے ہیں کہ جو لوگ سورتوں کی ترتیب کو مبنی بر اجتہاد تسلیم کرتے ہیں ان کے اور قائلین توقیف کے مابین صرف نزاع لفظی پایا جاتا ہے۔ وہ اس کی دلیل میں امام مالک کا قول پیش کرتے ہیں۔

امام مالک فرماتے ہیں:

"صحابہ نے جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا تھا اسی طرح اس کو مرتب کر دیا۔"

اس کے ساتھ ساتھ امام مالک یہ بھی فرماتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کے اجتہاد پر مبنی ہے۔ اب اس میں اختلاف رونما ہوا کہ آیا آنحضورؐ نے بذاتِ خود اس ترتیب کا حکم دیا تھا یا فعلاً اس ترتیب کو (بوقتِ تلاوت) ملحوظ رکھا تھا[۲]۔

جہاں تک اس نظریہ کا تعلق ہے کہ ترتیب کی دو قسمیں ہیں (۱) توقیفی (۲) اجتہادی۔ تو اس تقسیم میں دوسری قسم یعنی اجتہادی ترتیب کسی صحیح دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے

---

[۱] البرہان ج ۱ ص ۲۶۲ — [۲] البرہان ج ۱ ص ۲۵۷

یہ ایک کمزور قسم ہے اور اعتماد کے لائق نہیں۔ قاضی ابو محمد بن عطیہ لکھتے ہیں:

"بہت سی سورتوں کی ترتیب عہد رسالت میں معلوم تھی۔ مثلاً سبع طُوَل[1] (سات طویل سورتیں جو قرآن کے شروع میں ہیں) اور حوامیم اور مفصل سورتیں[2]۔"

ابو جعفر بن زبیر[3] فرماتے ہیں:

"توقیفی قسم مقابلۃً بڑی ہے۔ بخلاف ازیں اجتہادی قسم اس سے چھوٹی ہے"۔

وہ مزید فرماتے ہیں:

"ابن عطیہ نے جن سورتوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان کی ترتیب عہد رسالت میں معروف تھی، آثار و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی سورتوں کی تعداد ابن عطیہ کی بیان کردہ سورتوں سے زیادہ ہے۔ بہت کم سورتیں ایسی ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہے[4]"۔

جن قلیل التعداد سورتوں میں اختلاف کی گنجائش ہے ان کی اصل و اساس ایک ضعیف بلکہ بے بنیاد روایت پر رکھی گئی ہے۔ اس کا راوی یزید الفارسی اس حدیث کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے۔ امام بخاری نے اس کو ضعیف راویوں کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ اس لیے اس کی منفرد روایت قابلِ قبول نہیں ہے۔ بصورتِ قبول یہ حدیث قرآن کریم کی ان سورتوں میں تشکیک کی موجب ہوگی جو قراءۃً سماعاً اور مصاحف میں لکھے جانے کی

---

[1] دیکھیے البرہان۔ طُوَل بضم الطاء و فتح الواو۔ عام لوگ طِوال بکسر الطاء کہتے ہیں۔ زرکشی کا قول ہے کہ طُول بضم الطاء کا واحد طُولیٰ ہے۔ جیسے کُبَر کا واحد کُبریٰ ہے۔ ابو حیان توحیدی کا قول ہے کہ طِوال بکسر الطاء غلط ہے۔ (البرہان ج ۱۔ ص ۲۴۴)۔

[2] البرہان ج ۱۔ ص ۲۵۷

[3] ان کا نام نامی احمد بن ابراہیم بن زبیر اندلسی ہے۔ موصوف نے کتاب "الصلۃ" کا ضمیمہ تیار کیا ہے۔ آپ بہت بڑے حافظ حدیث اور نحو دان تھے۔ ۸۰۸ھ میں وفات پائی۔ (الدرر الکامنہ ج ۱۔ ص ۸۴۔ ۸۶)

[4] برہان ج ۱ ص ۲۰۰۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

رو سے تواتر قطعی کے ساتھ ثابت ہیں۔ سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ کی تحریر بھی اس حدیث کی رو سے مشکوک ٹھہرے گی۔ گویا حضرت عثمان اس کی نفی بھی کرتے تھے اور اثبات بھی۔ حالانکہ حضرت عثمان کا دامن اس (دو عملی) سے پاک ہے۔ لہٰذا اس حدیث کو بے اصل قرار دینے میں کوئی حرج نہیں[۱]۔ اس حدیث کو ذکر کر کے اپنے بیان کو طوالت دینا بھی غیر ضروری ہے۔

یہاں قابلِ ذکر وہ جواب ہے جو حضرت عثمان نے ابن عباس کو دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ سورۂ انفال کو سورۃ التوبۃ کے ساتھ بسم اللہ کے بغیر کس لیے ملا دیا گیا ہے؟ سورۂ انفال آغاز ہجرت میں نازل ہوئی تھی۔ جب کہ سورۃ التوبۃ آنحضور کی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین باہم ملتے جلتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور آپ نے یہ نہ بتایا کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی ہیں۔ اس سبب میں (حضرت عثمان) نے دونوں (سورۂ انفال و توبہ) کو ملا دیا[۲]۔

اس ضمن میں راجح اور مختار مذہب یہ ہے کہ قرآنی سورتوں کی موجودہ ترتیب اسی طرح توقیفی اور غیر اجتہادی ہے جس طرح آیات کی موجودہ ترتیب۔ مگر بایں ہمہ توقیف سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو ہر سورت کی آیات کو علیحدہ علیحدہ صحیفوں میں جمع کر سکے، اور نہ ہی آپ کو پورے قرآن کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کا موقع ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کے حافظ و قاری بکثرت موجود تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی قرآن کے باقی ماندہ حصہ کے نزول کا انتظار تھا۔ علاوہ ازیں اس امر کا بھی احتمال تھا کہ بعض نئے احکام نازل ہوں جو سابقہ احکام کو منسوخ کر دیں[۳]۔

بقیہ سابقہ [۵] دیکھیے حدیث مذکور پر حاشیہ علامہ احمد محمد شاکر نمبر ۳۹۹ مسند احمد ج ۱ ص ۳۲۹۔

[۱] دیکھیے حاشیہ بر حدیث مذکور مسند احمد ج ۱ ص ۳۳۰۔ یہ حاشیہ تمام و کمال پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

[۲] مسند احمد طبع شاکر ج ۱ ص ۳۳۱۔ حدیث نمبر ۳۹۹۔ نیز مسند طبع قدیم ج ۱ ص ۵۷

[۳] الاتقان ج ۱ ص ۹۰۔ نیز البرہان ج ۱ ص ۲۳۵

خلاصہ یہ کہ پورا قرآن مجید عہدِ رسالت میں لکھا جا چکا تھا۔ مگر اس کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ کیونکہ قرآن صحابہ کے سینوں میں اسی طرح محفوظ تھا جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکمِ خداوندی ان کو آگاہ و آشنا کیا تھا۔

امام زرکشی لکھتے ہیں:

"عہدِ رسالت میں قرآن کو ایک مصحف میں اس لیے نہ لکھا گیا تاکہ اس کو بار بار تبدیل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس لیے قرآن کی کتابت کو اس وقت تک ملتوی رکھا گیا جب کہ آنحضورؐ کی وفات کی وجہ سے نزولِ قرآن کی تکمیل ہو گئی۔"[1]

اکثر علماء کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ عہدِ رسالت میں قرآن کو جمع کرتے وقت ان سات قراءتوں کو ملحوظ رکھا گیا تھا جن میں قرآن نازل ہوا تھا۔ ہم حروفِ سبعہ کی فصل میں اس پر تفصیلی بحث کریں گے۔

قرآن کریم کا جو حصہ تحریر کیا جاتا تھا اس کو آپ کے گھر میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ جو لوگ لکھنا جانتے تھے اس سے اپنے لیے ایک نسخہ نقل کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف لکھنے والوں کے یہ ذاتی نسخے، دوسری جانب وہ صحیفے جو آپ کے گھر میں محفوظ تھے۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو اُمّی اور غیر اُمّی صحابہ کا حافظہ قرآن کریم کی حفاظت و صیانت میں ممد و معاون اور اس آیت کا مصداق ثابت ہوئے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝	بے شک ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔[2]

---

[1] البرہان ج ۱ ص ۲۶۲۔

[2] سورۃ الحجر، آیت ۹۔

۲۔ تدوینِ قرآن اور حضرت ابوبکر صدیق:

پورا قرآن عہدِ رسالت میں لکھا جا چکا تھا مگر اس کی آیتیں اور سورتیں یکجا نہ تھیں۔ اولیں شخص جس نے رسول کریم کی ترتیب کے مطابق اس کو مختلف صحیفوں میں جمع کیا وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔

ابو عبداللہ[1] محاسبی اپنی کتاب "فہم السنن" میں رقمطراز ہیں:

"قرآن کی کتابت کوئی نئی چیز نہ تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اس کے لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ البتہ وہ کاغذ کے ٹکڑوں، شانہ کی ہڈیوں اور کھجور کی ٹہنیوں پر بکھرا پڑا تھا۔ حضرت ابوبکر نے متفرق جگہوں سے اس کو یکجا کرنے کا حکم دیا۔ یہ سب اشیاء یوں تھیں جیسے آنحضور کے گھر میں اوراق منتشر پڑے ہوں اور ان میں قرآن لکھا ہوا ہو۔ ایک جمع کرنے والے (حضرت ابوبکرؓ) نے ان اوراق کو جمع کر کے ایک دھاگے سے باندھ دیا تاکہ ان میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہونے پائے۔"[2]

حضرت ابوبکرؓ نے تدوینِ قرآن کا آغاز جنگِ یمامہ کے بعد ۱۲ھ میں کیا۔ یہ جنگ اہلِ اسلام اور مسیلمہ کذاب کے متبعین کے مابین ہوئی تھی۔ اس میں ستر حفاظِ قرآن صحابہ نے شہادت پائی۔ حضرت عمرؓ اس سے بہت خوفزدہ ہوئے اور بارگاہِ صدیقی میں حاضر ہو کر قرآن جمع کرنے کا مطالبہ کیا۔ صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنگِ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق نے مجھے بلا بھیجا۔ حضرت فاروق بھی تشریف فرما تھے

[1] حارث بن اسد محاسبی کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ آپ اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ آپ فقہ و اصول کے بہت بڑے عالم تھے۔ اپنے عصر و عہد میں یہ اہلِ بغداد کے مشہور استاد تھے۔ آپ نے بغداد میں ۲۴۳ھ میں وفات پائی۔ (الاعلام للزرکلی ج ۲ ص ۱۵۳)۔

[2] البرہان ج ۱ ص ۲۳۸۔ نیز الاتقان ج ۱ ص ۱۰۱

حضرت صدیق نے فرمایا جناب فاروق میرے یہاں آئے اور کہا "جنگِ یمامہ میں کثیر حفاظِ قرآن نے شہادت پائی ہے۔ اگر حفاظِ قرآن کی شہادت کا یہی عالم رہا تو قرآن کا کافی حصہ ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے، اس لیے قرآن کو یکجا کر لینا چاہیے"۔ میں نے عمر سے کہا "ہم وہ کام کیسے کر سکتے ہیں جو رسول اللہ نے نہیں کیا؟" عمر نے کہا "بخدا یہ بہتر کام ہے"۔ عمرؓ مجھ سے بار بار مطالبہ کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں مجھے شرح صدر سے نوازا۔ آپ ایک دانشمند نوجوان ہیں۔ ہمیں آپ پر کوئی بدگمانی نہیں۔ آپ عہدِ رسالت میں کاتبِ وحی رہ چکے ہیں۔ اس لیے قرآن کو ہوش کر کے جمع کیجیے"۔ حضرت زید کا بیان ہے کہ "بخدا اگر جناب صدیق مجھے کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے نقل کرنے کا حکم دیتے تو وہ میرے لیے اس ذمہ داری کی نسبت آسان تر ہوتا۔ میں نے کہا آخر آپ ایسا کام کیوں کر کریں گے جو آنحضورؐ نے نہیں کیا؟ حضرت ابوبکر نے کہا "بخدا یہ بہتر ہے"۔ پھر حضرت ابوبکر مجھ سے بتاکید یہی بات کہتے رہے حتیٰ کہ ابوبکر و عمر کی طرح مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں شرح صدر عطا کیا۔ میں نے قرآن کو پتھر کی باریک سلوں، کھجور کی ٹہنیوں اور آدمیوں کے سینوں سے تلاش کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سورۂ توبہ کا آخری حصہ مجھے ابوخزیمہؓ انصاری کے پاس ملا۔ کسی اور سے نہ مل سکا۔ وہ آیت یہ تھی: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ سورۂ توبہ کے آخر تک۔ میرے تحریر کردہ صحیفے حضرت ابوبکر کی وفات تک ان کے پاس رہے۔ پھر حضرت عمر کے پاس رہے۔ ان کی شہادت کے بعد یہ صحیفے حضرت حفصہؓ کی تحویل میں آ گئے[1]۔

---

[1] ایک روایت میں یوں ہے کہ سورۂ توبہ کا آخری جزو میں نے ابوخزیمہ انصاری کے پاس پایا تھا جن کی شہادت کو سرورِ کائنات نے دو آدمیوں کی شہادت کے مساوی قرار دیا تھا (البرہان، ج ۱، ص ۲۳۴)۔ مگر تہذیب التہذیب ج ۳، ص ۱۴۰ پر مرقوم ہے کہ جس شخص کی شہادت کو آپ نے دو آدمیوں کی شہادت کے مساوی قرار دیا تھا وہ خزیمہ بن ثابت انصاری تھے نہ کہ ابوخزیمہ انصاری۔ گویا خزیمہ بن ثابت انصاری اور ہیں اور ابوخزیمہ انصاری شخصے دیگر۔ صحیح بخاری میں ہے کہ زید نے خزیمہ بن ثابت کے پاس سورۂ احزاب کی آیت پائی تھی۔ ممکن ہے کہ رواۃِ حدیث اور مؤرخین کو اس معاملہ میں غلطی لگی ہو۔ ([2] آئندہ صفحہ پر دیکھیں)

ممکن ہے کہ مذکورہ صدر واقعہ پڑھ کر قاری اس اشکال میں مبتلا ہو کہ حضرت زید کو یہ آیت دیگر صحابہ کے پاس کیوں نہ ملی ؟ مگر یہ اشکال جلد ہی زائل ہو جائے گا جب قاری کو معلوم ہو گا کہ حضرت زید کا مقصد یہ بتانا تھا کہ وہ آیت کسی اور صحابی کے پاس[1] لکھی ہوئی نہ تھی۔ جب ابو خزیمہ انصاری کے پاس وہ آیت تحریر شدہ صورت میں مل گئی تو حضرت زید نے اسے قبول کر لیا۔ اس لیے[2] کہ بہت سے صحابہ بلکہ خود حضرت زید کو بھی یہ آیت زبانی یاد تھی۔ مگر وہ بنا بر ورع و تقویٰ یہ چاہتے تھے کہ یہ آیت تحریری صورت میں بھی مل جائے۔ تاکہ حفظ و کتابت کے مل جانے سے اس میں مزید پختگی اور استحکام پیدا ہو جائے۔ حضرت ابوبکر کے حکم سے جو قرآن حضرت زید نے جمع کیا تھا وہ اس میں اسی راہ پر گام زن رہے۔ ہر آیت یا چند آیات کو قبول کرنے کے لیے دو گواہوں کی ضرورت تھی۔ اور وہ تھے —— حفظ اور کتابت ——

حضرت ابوبکرؓ نے عمر فاروقؓ اور زید بن ثابت سے کہا تھا کہ "مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جائیے اور جو شخص کتاب اللہ کے کسی حصہ پر دو گواہ پیش کرے تو وہ حصہ لکھ لیا کرو۔"[3]

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ دو گواہوں سے حفظ اور کتابت مراد ہیں۔

یہ حدیث منقطع ہے۔ اس کو ابن ابی داؤدؒ نے بطریق ہشام بن عروہ از والد خود روایت کیا ہے۔ مگر اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی مذکورہ صدر توجیہ سے مستفاد

بقیہ صفحہ سابقہ [3] صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن باب سوم و چہارم۔ نیز کتاب الاحکام باب ۳۷۔ نیز مسند احمد ج ۱ ص ۱۳۔ مسند احمد طبع شاکر ج ۱ ص ۸۵ ا حدیث نمبر ۷۶ و طبقات ابن سعد ج ۳ ق ۱ ص ۲۰۱۔

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۱۔ امام سیوطی ابو شامہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ کسی اور کے پاس نہ پانے کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے پاس یہ آیت تحریر شدہ صورت میں نہ تھی۔

[2] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۰۔

[3] عبداللہ بن سلیمان بن اشعث ازدی سجستانی کی کنیت ابوبکر ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

المصاحف۔ المسند۔ السنن۔ التفسیر۔ القراءات۔ الناسخ والمنسوخ (الاعلام ج ۴ ص ۲۲۴)

ہوتا ہے کہ ایک گواہ حفظ کے لیے اور ایک کتابت کے ضمن میں کافی ہے۔ بخلاف ازیں جمہور کے نزدیک دو عادل گواہ حفظ کے لیے اور دو کتابت کے لیے یعنی کل چار گواہ ضروری ہیں۔

جمہور علماء اس کی دلیل میں ابن ابی داؤد کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جو انہوں نے بطریق یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ تشریف لائے اور فرمایا کہ جس نے قرآن کا کچھ حصہ آنحضورؐ سے سُن کر یاد کیا ہو وہ پیش کرے۔ لوگ ان دنوں قرآن کریم کی آیات کو صحیفوں، تختیوں اور کھجور کی چوڑی ٹہنیوں پر لکھا کرتے تھے۔ جب تک دو گواہ شہادت نہ دیتے تب تک آپ کسی کی پیش کردہ آیات کو قبول نہیں کیا کرتے تھے[1]۔ سخاوی اپنی کتاب جمال القراء میں رقم طراز ہیں:

"مقصد یہ ہے کہ دو گواہ اس بات کی شہادت دیں کہ یہ آیات آنحضورؐ کے سامنے تحریر کی گئی تھیں[2]۔"

سُورۂ توبہ کی آخری آیات کو اس قاعدہ سے اس لیے مستثنیٰ کیا گیا تھا کہ اکثر صحابہ کو یہ آیات زبانی یاد تھیں۔ اس لیے ان کی نقل در روایت تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ تو گویا یہ متواتر نقل و روایت دو گواہوں کے قائم مقام تھی کہ سورۂ توبہ کا یہ آخری حصہ آنحضورؐ کی موجودگی میں تحریر کیا گیا ہے۔

باقی رہا زید بن ثابت کا یہ قول کہ "میں نے ان آیات کو صرف ابو خزیمہ کے پاس پایا" تو اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ خبر واحد کے ساتھ قرآن کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ حضرت زیدؓ بذاتِ خود یہ آیات آنحضورؐ سے سُنی تھیں۔ اور ان کو معلوم تھا کہ یہ آیات کہاں اور کس سُورت سے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں صحابہ کی تلاش تائید و تقویت کے لیے تھی۔ اس لیے نہیں کہ آپ قبل ازیں ان آیات سے آگاہ نہ تھے[3]۔

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۰۔ [2] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۰۔ [3] البرہان ج ۱ ص ۲۳۴

حضرت ابو بکرؓ کے اہتمام سے جمع و تدوین قرآن کا کام ایک سال کی مدت میں تکمیل پذیر ہوا۔ اس لیے کہ آپ نے حضرت زید کو اس خدمت پر جنگِ یمامہ کے بعد مامور فرمایا تھا جنگ یمامہ اور حضرت صدیق کی وفات کے درمیان صرف ایک سال کی مدت تھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کو کس طرح کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کی ٹہنیوں، پتھر کی سلوں چمڑے کے ٹکڑوں اور کجاوہ کی لکڑیوں سے فراہم کیا گیا تھا تو ہمیں صحابہ کے بلند پایہ عزم اور عالی ہمتی کی داد دینی پڑتی ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حضرت علی کا مقولہ دہرانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ ابو بکر پر رحم فرمائے وہ اولین شخص تھے جس نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع کیا۔"[1]

جہاں تک حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے وہ تدوینِ قرآن کے نظریہ کے مُوجد تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نظریہ کی عملی تکمیل کی سعادت حضرت زید بن ثابتؓ کے لیے مقدّر تھی۔

امام بخاری نے جو روایت حضرت زید سے نقل کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ جن صحیفوں میں قرآن جمع کیا گیا تھا وہ پہلے حضرت ابو بکرؓ کے پاس رہے۔ جب آپ نے وفات پائی تو خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ ان کی حفاظت کرتے رہے۔ آپ کی شہادت کے بعد یہ صحیفے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان کے پاس نہیں بلکہ اُمّ المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ کی تحویل میں رہے یہاں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نویس نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ آیا یہ امر زیادہ موزون نہ تھا کہ ان صحیفوں کو حضرت عثمان کی حفاظت میں دیا جاتا۔"[2]

ہم اس سوال کے جواب میں عرض پرداز ہیں کہ ان صحیفوں کا حضرت حفصہؓ کے زیر حفاظت رہنا

[1] البرہان ج ۱ ص ۲۳۹۔ نیز المصاحف لابن ابی داؤد۔

[2] دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۲۔ ص ۱۱۳۰۔

موزوں نہ تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے وصیت کی تھی کہ ان صحیفوں کو حضرت حفصہ کی تحویل میں رکھا جائے۔ اس لیے کہ محترمہ موصوفہ ام المومنین ہونے کے علاوہ حافظ قرآن بھی تھیں۔ پورا قرآن آپ کے سینہ میں محفوظ تھا اور آپ اس کی قراءت و کتابت میں پوری مہارت رکھتی تھیں۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے اپنے جانشین کا معاملہ شوریٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ بنائے جانے سے قبل یہ امانت حضرت عثمان کو کیسے تفویض کی جا سکتی تھی؟

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کو "مصحف" کا نام سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں دیا گیا تھا۔ ابن اشتہ[1] نے اپنی کتاب "المصاحف" میں بطریق موسیٰ بن عقبہ از ابن شہاب روایت کیا ہے کہ جب قرآن کو جمع کر کے اوراق پر لکھا گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "اس کا کوئی نام مقرر کیجیے"۔ بعض نے "السِفر" (پیغامات) تجویز کیا۔ آپ نے فرمایا یہ یہود کا تجویز کردہ نام ہے۔ بعض لوگوں نے "المصحف" نام رکھنے کی تجویز پیش کی۔ یہ نام حبشہ میں رائج تھا۔ اسی پر اتفاق ہو گیا اور قرآن کریم کو "المصحف" کہا جانے لگا۔[2]

حضرت ابوبکرؓ کے جمع کردہ قرآن پر پوری امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اس کو متواتر کا درجہ حاصل ہے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر نے قرآن کریم کو قراءت سبعہ کے مطابق مدوّن کیا جس طرح وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اس اعتبار سے حضرت صدیقؓ کے جمع کردہ قرآن اور عہدِ رسالت میں مرتب قرآن کے درمیان کامل یک رنگی و ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور دونوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

---

[1] محمد بن عبداللہ بن محمد بن اشتہ کی کنیت ابوبکر ہے۔ آپ بہت بڑے نحو دان محقق اور ثقہ راوی تھے۔ علوم القرآن کے ساتھ آپ کو شغف کے درجہ تک محبت تھی۔ آپ کی کتاب "المحبر" آپ کے وسیع العلم ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ آپ نے ۳۶۰ھ میں وفات پائی۔ (غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء ج ۲ ص ۱۸۴)

[2] الاتقان ج ۱۔ ص ۸۹۔

۴۔ عہد عثمان میں تدوینِ قرآن :

امام بخاری نے صحیح بخاری میں اپنی سند کے ساتھ ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ انس بن مالک نے انہیں بتایا کہ حذیفہ بن یمان حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ موصوف نے آرمینیہ اور آذربیجان کی جنگ میں شرکت کی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لوگ تلاوتِ قرآن میں بہت اختلاف کرنے لگے تھے۔ حذیفہ نے حضرت عثمان سے کہا امیر المومنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت کتاب الٰہی میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف کرنے لگے اس کو سنبھال لیجیے۔ یہ سُن کر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کو کہلا بھیجا کہ آپ کے پاس قرآن کے جو صحیفے پڑے ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجیے تاکہ ہم ان کو کتابی صورت میں جمع کریں۔ پھر ہم ان کو واپس کر دیں گے۔ محترمہ موصوفہ نے وہ صحیفے ارسال کر دیے۔

حضرت عثمان نے زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن زبیر، سعیدؓ بن العاص اور عبدالرحمٰنؓ بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو مامور کیا کہ وہ صحیفوں سے نقل کر کے قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کر دیں۔ حضرت عثمان نے تینوں قریشی صحابہ (حضرت زید بن ثابت کے علاوہ باقی تینوں صحابہ) سے کہا کہ جب تمہارے اور زید کے مابین قرآن کی کسی آیت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو تو قرآن کو قریش کی زبان میں لکھیے۔ کیونکہ یہ ان کی زبان میں نازل ہوا تھا۔ جب وہ تعمیل ارشاد کر چکے تو آپ نے وہ صحیفے حضرت حفصہ کو واپس کر دیے۔ حضرت عثمانؓ نے جمع کردہ قرآن کے نسخے اطرافِ ملک میں بھجوا دیے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کے جو حصے کسی صحیفہ یا مصحف میں لکھے گئے تھے اس کے بارے میں آپ نے حکم صادر کیا کہ ان کو نذرِ آتش کر دیا جائے[1]۔

مندرجہ بالا بیان سے پانچ باتیں ثابت ہوتی ہیں :

---

[1] صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن، باب دوم وسوم۔ نیز الاتقان ج ۱ ص ۱۰۲ والمصاحف لابن ابی داؤد ص ۱۸۔ وتفسیر طبری ج ۱ ص ۲۰-۲۱

(۱) اول یہ کہ مسلمانوں کے بیان قراءت قرآن کے بارے میں جو اختلاف رونما ہوا وہ حضرت عثمانؓ کے قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کرنے کا اساسی و اصولی سبب تھا۔ اس لیے بلاشیر وغیرہ مستشرقین نے جمع و تدوین قرآن کے بارے میں حضرت عثمانؓ کی نیت پر جو حملے کیے ہیں وہ قطعی طور پر بے بنیاد ہیں۔ مستشرقین کے اس بے بنیاد الزام کی ایک دلیل ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ذاتی غرض سے اپنی اور دیگر مہاجرین کی اہمیت جتانے کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا تھا[1]؟

یہ اتہام فقط مستشرقین کی الزام تراشی اور عبث قیاس آرائی کا آئینہ دار ہے۔ ورنہ کسی صحیح تاریخی روایت سے ان کے دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ کیا کوئی دانشمند آدمی اس امر کو گوارا کر سکتا ہے کہ امام بخاری جیسے محدث کے مقابلہ میں جو کہ ثقاہت و امانت اور حفظ و ضبط میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے مستشرقین کے عقلی ڈھکوسلوں کو تسلیم کیا جائے؟

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ جس کمیٹی کو یہ خدمت تفویض کی گئی تھی وہ چار آدمیوں پر مشتمل تھی[2]۔ اور اگر زید بن ثابت مدنی انصاری کو شمار نہ کیا جائے تو باقی تینوں حضرات مکہ کے رہنے والے

---

[1] دیکھیے بلاشیر (BLACHERE) ص ۵۷۔

[2] عجیب بات یہ ہے کہ محدث ابن ابی داؤد ایک ہی مسئلہ کے بارے میں مختلف روایات نقل کرنے کے شائق رہتے ہیں اگرچہ ان میں تضاد پایا جاتا ہو۔ مزید برآں طرہ یہ کہ وہ مسئلہ زیر بحث میں امام بخاری کی ذکر کردہ چار اشخاص پر مشتمل کمیٹی ہی کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اس ضمن میں نامزد شدہ دیگر کمیٹیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں مثلاً وہ ایک کمیٹی کا ذکر کرتے ہیں جو دو صحابہ زید بن ثابت اور سعید بن عاص پر مشتمل تھی۔ ایک کمیٹی بارہ صحابہ پر مشتمل تھی (کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۲۲، ۲۴، ۲۵۔ اس تضاد پر مستشرق شفالی (SCHWALLY) نے جرح و قدح کی ہے مستشرق بلاشیر اس پر اظہار حیرت و استعجاب کرتے ہیں کہ ابن ابی داؤد نے ایک کمیٹی کے ضمن میں ابی بن کعب کا ذکر بھی کیا ہے۔ حالانکہ وہ اس سے دو سال قبل وفات پا چکے تھے۔ یہ بلاشیر کی غلطی ہے۔ بلاشیر کے نظریہ کے مطابق کتابت قرآن سے متعلق کمیٹی کی تشکیل ۳۲ھ کے قریب قریب عمل میں آئی تھی۔ بخلاف ازیں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہ ۲۵ھ کا واقعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں جو لوگ اس کو ۳۰ھ کا واقعہ بتاتے ہیں اُن کا قول صحیح نہیں ہے (الاتقان ج ۱ ص ۱۰۲)

قریشی[1] تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ چاروں بزرگ ثقات اور افاضل صحابہ[2] میں شمار ہوتے تھے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ یہ چار صحابہ کی اس کمیٹی نے کتابتِ قرآن کے سلسلہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے صحیفوں کو اصل واساس قرار دیا تھا اور یہ صحیفے حضرت ابوبکرؓ سے منقول تھے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا تھا۔ تینوں قریشی صحابہ اور زید کے درمیان اختلاف رونما ہونے کی صورت میں اسی زبان کو ترجیح کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ زبان قریش میں قرآن کی کتابت اس کو حروف سبعہ کے مطابق تحریر کرنے کے منافی نہیں ہے۔ قرآن کریم کو حروفِ سبعہ کے مطابق نازل کیا گیا تھا۔

---

[1] یہاں مستشرق بلاشیر نے طرح طرح کی قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔ وہ پہلے تینوں قریشی صحابہؓ کو حضرت عثمان کی طرح طبقۂ امراء و خواص میں شمار کرتا ہے۔ یہ بات ہمارے فہم سے بالاتر ہے کہ اس نوزائیدہ اسلامی معاشرہ میں کون سی امارت پائی جاتی تھی۔ خصوصاً جبکہ اسلامی تعلیمات ابھی تازہ تھیں۔

پھر کہتا ہے کہ یہ تینوں مکی صحابہ حضرت عثمان کے رشتہ دار تھے اس لیے وہ ایک مشترکہ مصلحت کے سلسلہ میں متفق ہو گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے وطن مالوف مکہ کے سوا کسی اور جگہ کتابتِ قرآن کی تکمیل ہو۔ بلاشیر اس من گھڑت قصہ کی تکمیل یوں کرتا ہے کہ زید بن ثابت مدنی ان مکی صحابہ کے ہم خیال بن گئے تھے اور ان کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ زید جانتے تھے کہ وہ قریش مکہ کے طبقۂ خواص میں شامل نہیں ہیں اس لیے وہ ان صحابہ کی خوشامد کو قرینِ مصلحت خیال کرتے تھے۔

مستشرق بلاشیر کے یہ دوراز عقل و قیاس اور لایعنی خیالات تناقض و تضاد کا مجموعہ ہیں۔ بلاشیر نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے اس کے بطلان کے لیے یہی کافی ہے کہ بلاشیر نے حضرت زید کو تینوں مکی صحابہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کے سلسلہ میں بلا وجہ متہم کیا ہے جس کی عقلی و نقلی کوئی دلیل موجود نہیں۔

[2] مستشرقین نے اعتراف کیا ہے کہ اس کمیٹی کے ارکان حد درجہ متقی اور محتاط تھے۔ بلاشیر لکھتا ہے:

"اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ کمیٹی کے ارکان کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا اگرچہ وہ ان دنوں تنقید و تبصرہ کے طرز و انداز سے پوری طرح آشنا نہ تھے۔

اور لکھتے وقت اس پر نقطے اور اعراب نہیں لگائے گئے تھے۔ تمام صحیفوں میں حروف سبعہ کے طریق تلاوت کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ چاروں صحابہ نے جو قرآن کریم جمع کیا تھا حضرت عثمانؓ نے اس کی نقلیں اطراف ملک میں بھجوا دیں۔ جدل و نزاع کے استیصال کے لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ لوگوں کے پاس قرآن کریم کے جو ذاتی اور عمومی نسخے تھے ان کو نذر آتش کر دیا جائے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مسلمانوں کے اختلاف قراءت سے صرف حذیفہ ہی پریشان نہ تھے بلکہ عام صحابہ ملول اور غم زدہ تھے۔ جب حضرت عثمان کو اس کی اہمیت کا احساس ہوا تو آپ نے اس فتنہ کو فروغ پانے سے قبل ہی روک دینا چاہا۔ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں جہاں ابو قلابہ کی روایت کردہ حدیث ذکر کی ہے وہاں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

ابو قلابہ فرماتے ہیں:

"حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ایک معلم ایک طرح پڑھاتا اور دوسرا دوسری طرح۔ جب ان کے شاگرد باہم ملتے تو مختلف طریقوں سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے۔ یہاں تک کہ یہ معاملہ معلمین تک پہنچا اور وہ غلط قراءت کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔ جب حضرت عثمانؓ ان اختلافات سے آگاہ ہوئے تو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"جب تم میرے پاس ہوتے ہوئے باہم اختلاف کرتے اور قرآن کریم کو غلط طریقہ سے پڑھتے ہو تو جو لوگ مجھ سے دور دراز شہروں میں رہتے ہیں ان کا کیا حال ہوگا؟ اے اصحاب محمدؐ! اکٹھے ہو کر لوگوں کے لیے قرآن کا ایک نسخہ مرتب کر دو۔"

لہ تفسیر ابن جریر طبری ج ۱ ص ۲۱ - نیز الاتقان ج ۱ ص ۱۰۲-۱۰۳ بحوالہ کتاب المصاحف لابن اشتہ بطریق ایوب از قلابہ - پوری روایت یوں ہے: (ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

ان اختلافات میں اضافہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت حفصہؓ کے صحیفوں کے علاوہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور لوگوں کے پاس بھی اپنے لکھے ہوئے ذاتی مصاحف موجود تھے جو کافی مشہور بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے حضرت عثمان لوگوں کو ایک قرآن پر متفق کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں دو مصحف بہت مشہور ہوئے۔ یعنی (۱) مصحف ابی بن کعب اور (۲) مصحف عبداللہ بن مسعودؓ۔

مذکورہ صدر دونوں مصاحف کے علاوہ قرآن کے کچھ نسخے اور بھی موجود تھے اگرچہ وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے۔ چنانچہ ابن الندیم نے "الفہرست" میں ابن ابی داؤد اور ابن اشتہ نے اپنی اپنی "المصاحف" میں ان نسخہ ہائے قرآنی کا تذکرہ کیا ہے۔

اگرچہ ہمارا ذہنی رجحان ومیلان اس جانب ہے کہ ایسے مصاحف کی تعداد زیادہ نہ

(بقیہ صفحہ سابقہ) "انہوں نے جمع ہو کر قرآن کریم لکھنا شروع کر دیا۔ جب کسی آیت میں اختلاف پیدا ہوتا تو کہتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت فلاں شخص کو پڑھائی تھی۔ چنانچہ وہ شخص مدینہ سے باہر تین میل دور سکونت گزیں ہوتا۔ اس کو بلا کر دریافت کیا جاتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ آیت کیسے پڑھائی تھی؟ جب وہ بیان کرتا تو اسے لکھ دیا جاتا۔ اس کے لیے جگہ انہوں نے پہلے ہی خالی رکھی ہوتی تھی"۔ (کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۲۱ اور کتاب المقنع لابی عمرو الدانی ص ۸ پر بھی اسی قسم کا مواد ملتا ہے)۔

ؔ یہ دونوں بزرگ جلیل القدر اور فاضل صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت اُبی بن کعب کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ جب خلافتِ صدیقی میں قرآن کریم جمع کیا گیا تو حضرت اُبی لکھواتے جاتے اور دیگر صحابہ لکھتے جاتے تھے۔ لوگ ان پر حد درجہ اعتماد کرتے تھے (کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۹)

جہاں تک حضرت عبداللہ بن مسعود کا تعلق ہے وہ ان چار صحابہ میں شامل تھے جن سے قرآن سیکھنے کا حکم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"چار صحابہ سے قرآن سیکھو۔ یعنی عبداللہ بن مسعود سے، سالم مولیٰ ابی حذیفہ سے، معاذ بن جبل سے اور اُبیؓ بن کعب سے"۔ (بخاری ج ۲۔ ص ۱۸۹)

حضرت ابو موسیٰ اشعری اور مقداد بن عمرو کے مصاحف بھی شہرت میں مذکورہ بالا دونوں مصاحف کے لگ بھگ تھے۔

(طبقات ابن سعد، ج ۳۔ قسم اوّل۔ ص ۱۱۴۔ ۱۱۶)

تھی۔ اس لیے کہ ہمارے پاس اس امر کی کوئی قابلِ اعتماد دلیل موجود نہیں جس سے ان کی تعداد کا پتہ چل سکے۔[1]

اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ مصاحف ہم تک نہیں پہنچے۔ البتہ ان میں تحریر کردہ سُورتوں کی ترتیب اور بعض الفاظ کے تلفظ و قراءت کے بارے میں کچھ معلومات ضرور ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں مزید تحقیق و تجسس کی ضرورت ہے[2]۔ اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ حضرت عثمان نے ان نسخہ ہائے قرآنی کو جلانے کا جو حکم دیا تھا وہ حکمت و مصلحت پر مبنی تھا[3]۔ اس لیے کہ ان مصاحف کا وجود امت میں مزید شقاق و افتراق کا موجب بن سکتا تھا اور عہدِ رسالت سے جس قدر دوری ہوتی جاتی اسی قدر یہ مصاحف اُمت کے لیے زیادہ ضرر رساں ثابت ہوتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو لوگوں نے بڑی وقعت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا[4]۔ البتہ عبداللہ بن مسعودؓ نے ـــــ جن کے پاس اپنا ایک ذاتی مصحف تھا ـــــ

---

[1] ابن ابی داؤد کتاب المصاحف ص ۵ پر لکھتے ہیں کہ "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس بھی قرآن کریم کا ایک ذاتی نسخہ موجود تھا"۔
مستشرق شفالی نے بڑے مزے لے لے کر اس قسم کے نسخہ ہائے قرآنی کا ذکر کیا ہے۔ بخلاف ازیں بلاشیر کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ابن ابی داؤد کی ذکر کردہ روایات سے یہ حقیقت واضح نہیں ہوتی کہ حضرت عمرؓ کے پاس قرآن کریم کا کوئی ذاتی نسخہ موجود تھا۔ بلکہ صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ بعض الفاظ کو ایک خاص انداز سے پڑھنے کو پسند فرماتے تھے۔ دیکھیے (ENTRODUCTIONAN CORAN، 35) از بلاشیر۔

[2] بلاشیر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ان مصاحف کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نصوص صحیحہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

[3] جیسا کہ قبل ازیں ہم دیکھ چکے ہیں بخاری کی روایت میں ان نسخوں کے جلانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابن ابی داؤد اس ضمن میں مختلف اور متضاد روایات ذکر کرتے ہیں۔ کسی روایت میں جلانے کا حکم ہے، کسی میں پارہ پارہ کر کے نذر آب کرنے کا ذکر ہے (کتاب المصاحف ص ۱۳، ۱۴، ۲۰) (باقی بر صفحہ آئندہ)

اس کو بظاہر ناپسند کیا اور اپنا مصحف جلانے سے انکار کر دیا[۱]۔ پھر الہامِ ربانی کی ترغیب و تشویق سے وہ حضرت عثمان کی رائے سے متفق ہوئے جو دراصل پوری اُمت کی رائے تھی[۲]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کی شیرازہ بندی ہو گئی اور اسبابِ جدل و نزاع کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعمیلِ ارشاد میں ۲۵ھ میں ان چاروں صحابہ نے کام شروع کر دیا[۳]۔ یہ چاروں صحابہ حافظِ قرآن تھے۔ اس کے باوصف حضرت عثمانؓ نے ان کو حکم دیا کہ

(بقیہ صفحہ سابقہ) مگر ہم بخاری کی صحیح روایت کو ترجیح دیتے ہوئے جلانے کے واقعہ کو بلا تردد و تذبذب درست تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ نسخے جلائے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کو ان کے فتنہ سے بچا لیا تھا۔

۴ کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۱۲

۱ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جانب چند من گھڑت باتیں منسوب کی گئی ہیں جو انہوں نے زید بن ثابت سے کہیں۔ حالانکہ جب حضرت عبداللہ مشرف باسلام ہوئے تو اس وقت زید بن ثابت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے (ابن ابی داؤد ص ۱۷) جب حضرت عبداللہ نے ستر سے بھی زائد سورتیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر یاد کر لی تھیں تو اس وقت زید بن ثابت ابھی بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے (طبقات ابن سعد ج ۲ قسم ثانی ص ۵۔ و کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۱۵) ہمارے خیال میں ایسی باتوں کی نسبت حضرت عبداللہ کی جانب درست نہیں۔ بفرضِ محال اگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ باتیں کہی بھی تھیں تو اس وقت کہی ہوں گی جب آپ قرآن لکھنے والی کمیٹی سے الگ ہو گئے تھے اور اس کے زیرِ اثر ان سے ایسی باتیں صادر ہوئیں۔ مزید براں ابن ابی داؤد کا بیان ہے کہ آپ نے حضرت عثمان کی رائے کی طرف رجوع کر لیا تھا (کتاب المصاحف ص ۱۲)۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر بلاشیر کے لیے پہلی روایت کو تسلیم کرنا اور دوسری کو ٹھکرا دینا کہاں تک قرین عقل و قیاس ہے؟

۲ کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۱۲

۳ الاتقان ج ۱ ص ۱۰۲۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مستشرق بلاشیر کا یہ قول کہ "سعید بن العاص اس کمیٹی میں صرف رسمی طور پر شریک تھے عملاً ان کے ساتھ نہ تھے۔ کیونکہ اس کمیٹی نے کتابتِ قرآن کا کام ۳۰ھ میں شروع کیا تھا اور ان دنوں سعید کوفہ کے والی تھے" مبنی بر وہم ہے۔ ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ بلاشیر کا یہ قول غلط ہے۔ اس ضمن میں ہم نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے قول کو ترجیح دی ہے۔

حضرت حفصہ کے صحیفوں سے قرآن نقل کریں تاکہ ان کا تحریر کردہ قرآن حضرت ابوبکر کے جمع کردہ صحیفوں کے بالکل مطابق ہو۔ ظاہر ہے کہ خلافت صدیقی میں جمع کردہ صحیفے ان نسخہ ہائے قرآنی کے بالکل مطابق تھے جو عہد رسالت میں آنحضور ؐ کے حکم کے مطابق اور آپ کی موجودگی میں تحریر کیے گئے تھے۔ اس طرح قرآن کریم کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔

ابو عبداللہ محاسبی فرماتے ہیں:

"جن صحیفوں سے حضرت عثمان ؓ نے قرآن نقل کروایا تھا تا زیست حضرت ابوبکر کے پاس رہے اور ان کے بعد حضرت فاروق اعظم کی تحویل میں آئے۔ پھر آپ نے ام المومنین حضرت حفصہ ؓ کو سونپ دیئے۔ خلافت عثمانی میں جب لوگوں کو ایک قرآن پر جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حضرت عثمان ؓ نے ان صحیفوں کو ایک مصحف میں جمع کروا دیا۔"[1]

جب یہ صحیفے حضرت حفصہ کو واپس کر دیے گئے تو تا وفات ان کی تحویل میں رہے۔ مروان بن الحکم متوفی ۶۵ھ ہجری نے بڑی کوشش کی کہ یہ صحیفے حضرت حفصہ ؓ سے لے کر جلا ڈالے مگر موصوفہ نے ان کو صحیفے دینے سے انکار کر دیا۔ جب حضرت حفصہ ؓ نے وفات پائی تو مروان نے وہ صحیفے لے کر نذر آتش کر دیے اور کہا کہ:

"میں نے یہ کام اس لیے کیا ہے کہ ان صحیفوں میں جو کچھ لکھا تھا اسے "مصحف امام" (حضرت عثمان کا جمع کردہ قرآن) میں نقل اور محفوظ کر لیا گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ آگے چل کر کوئی شخص ان صحیفوں کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرنے لگے اس لیے میں نے ان کو جلا کر تلف کر دیا۔"[2]

اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت عثمان ؓ نے قرآن کریم کے جو نسخے اطراف ملک میں بھجوائے

---

[1] البرہان ج ۱۔ ص ۲۳۹۔

[2] کتاب المصاحف لابن ابی داؤد۔

تھے ان کی تعداد کیا تھی۔ امام ابو عمرو الدانی[1] المقنع میں رقمطراز ہیں:

"اکثر علماء کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے چار نسخے مرتب کروائے تھے۔ ان میں سے تین کوفہ بصرہ اور شام بھجوا دیئے اور ایک اپنے پاس رکھ لیا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آپ نے سات نسخے لکھوائے تھے جو کوفہ، بصرہ، شام، مکہ، یمن اور بحرین بھجوا دیے اور ایک اپنے پاس رکھ لیا۔ مگر پہلا قول صحیح تر ہے اور ائمہ کا مذہب بھی یہی ہے[2]"

امام سیوطی فرماتے ہیں:

"مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے پانچ نسخے لکھوائے تھے[3]"

اور اگر ان کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے ذاتی نسخہ "المصحف الامام" کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل چھ نسخے بن جاتے ہیں۔ اس طرح جس قول میں سات نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان میں سے آپ کے ذاتی نسخہ کو نکال دیا جائے تو چھ باقی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارا رجحان و میلان اس جانب ہے کہ صحابہ کی کمیٹی نے قرآن کریم کے سات نسخے مرتب کیے تھے۔ آپ نے چھ نسخے اطراف ملک میں بھجوا دیے اور ایک نسخہ اپنے پاس رکھ لیا۔ ہمارے خیال کو اس امر سے مزید تقویت ملی ہے کہ بعض افراد نے حضرت عثمان کے مصحف سے اپنے ذاتی استعمال کے لیے کچھ نسخے مرتب کر لیے تھے۔ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور ام سلمہؓ کے اسمائے گرامی ذکر کیے جاتے ہیں[4]۔ یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم دیتا کہ حضرت عثمانؓ نے

[1] عثمان بن سعید ابو عمرو الدانی قراءت کے بہت بڑے امام تھے۔ آپ کی مشہور ترین تصانیف "التیسیر فی القراءت السبع"، "المقنع فی رسم القرآن" اور "المحکم فی نقط المصاحف" ہیں۔ آپ نے ۴۴۴ھ میں وفات پائی (انباہ الرواۃ ج ۲۔ ص ۳۴۱-۳۴۲)

[2] البرہان ج ۱۔ ص ۲۴۰۔ نیز المقنع ص ۱۰

[3] الاتقان ج ۱۔ ص ۱۰۴۔

[4] کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۸۱، ۸۳، ۸۵، ۸۶

بعض بار سوخ حضرات کو سرکاری طور پر تحریر کردہ کچھ نسخے دے دیے ہوں اور بلادِ اسلامیہ میں ان کو بھجوانے اور پھیلانے میں بخل سے کام لیا ہو حالانکہ اُمّت کے شیرازہ کو متحد کرنے اور رفع جدل و نزاع کے لیے اس کی سخت ضرورت تھی۔ خصوصًا جب کہ یہ حقیقت ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ قراءتِ قرآن کے اختلافات کے زیرِ اثر ہی حضرت عثمانؓ نے کتابتِ قرآن کا بیڑا اُٹھایا تھا۔

بہر کیف عثمانی مصاحف کی صحیح تعداد کچھ بھی ہو یہ سب کے سب پورے قرآن پر مشتمل تھے۔ ان میں ایک سو چودہ سورتیں تھیں۔ نقطے اور اعراب کا وجود نہ تھا۔ سورتوں کے نام اور فواصل بھی مرقوم نہ تھے۔ اس لیے کہ حضرت ابو بکرؓ کے جمع کردہ نسخۂ قرآن میں یہ چیزیں موجود نہ تھیں۔ مزید براں عثمانی مصاحف الفاظِ قرآنی کے علاوہ شروح و تفاسیر سے خالی تھے۔ بعض صحابہ نے اپنے ذاتی نسخوں میں بعض آیات کی وہ تفسیر بھی رقم کی تھی جو انہوں نے بذاتِ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آیتِ قرآنی:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ" — تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے ذاتی نسخہ میں "فِیْ مَوَاسِمِ الْحَجِّ" کے الفاظ بڑھا لیے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ حج کے دنوں میں تجارت کر کے مالی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اضافہ ایضاح و تفسیر کے لیے کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے جس نسخہ پر اُمت کا اجماع منعقد ہوا ہے اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ ابن الجزری اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بعض اوقات تفسیری کلمات کو ایضاح و تبیین کے لیے قراءت میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ صحابہ نے بذاتِ خود آنحضورؐ سے قرآن سنا تھا۔ بنا بریں ان کو یہ خطرہ لاحق نہ تھا کہ تفسیری کلمات قرآنی الفاظ کے ساتھ مخلوط ہو جائیں گے۔ بعض صحابہ تفسیر پر مشتمل الفاظ کو اپنے ذاتی نسخوں میں لکھ لیا کرتے تھے۔[۱] مثلاً حضرت عائشہؓ نے

[۱] ۔ النقر ج ۱ ص ۳۲

ایسا ہی کیا تھا۔"

حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف جمع کروائے تھے وہ ان زیادات سے پاک تھے جن کو توضیح و تفسیر، تفصیل مجمل یا اثباتِ محذوف کے طور پر بڑھایا گیا تھا۔ انفرادی مصاحف میں جو شاذ کلمات تھے ان کو بھی خارج کر دیا گیا تھا۔ مصحفِ عثمانی میں آیتوں اور سورتوں کی ترتیب وہی تھی جو موجودہ قرآنی نسخوں میں ہے۔ چونکہ عثمانی مصاحف میں نقطے اور اعراب نہیں لگائے گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض الفاظ کو کئی طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا۔ مثلاً آیتِ قرآنی:

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا۔

اس کو "فَتَثَبَّتُوْا" (ثابت قدم رہو) بھی پڑھا گیا ہے۔

اسی طرح آیت "فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ" کو "فَتَلَقّٰۤى اٰدَمَ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٌ" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

دونوں طرح پڑھنے کے جواز کی قطعی دلیل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح پڑھنا منقول ہے۔ یا اس لیے کہ بعض صحابہؓ نے آپ کی موجودگی میں دونوں طرح پڑھا اور آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ جب کسی آیت کی متواتر قراءت کے سلسلہ میں کوئی دلیل موجود ہو تو اس سے وہ قراءت متعین ہو جاتی ہے اور دوسرے انداز قراءت کا جواز باقی نہیں رہتا۔ اگر کسی قراءت کا اثبات صرف خبر واحد سے ہوتا ہو اور اس ضمن میں کوئی متواتر روایت موجود نہ ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی قراءت کو شاذ قرار دیا جائے گا کیونکہ وہ ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف ہے۔ مثلاً یہ آیت:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا"

قراءتِ شاذہ میں اس کو یوں پڑھا گیا ہے:

۱؎ الاتقان ج ۱ ص ۳۳

"اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ۔"

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ قرآن کی وہ آیت جس کو ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنا دلیل متواتر سے ثابت نہ تھا اس کو ایک ہی طرح لکھ جاتا تھا۔ جس آیت کی قراءت متعدد وجوہ سے بدلیل متواتر ثابت ہوا اور قرآن کے ایک ہی نسخہ میں اس کو اس طرح نہ لکھا جا سکتا ہو کہ اس سے قراءت کے جملہ وجوہ کا اظہار ہو سکے تو کاتبین قرآن ایسی آیت کو ایک نسخہ میں ایک طرح اور دوسرے میں دوسری طرح لکھنے پر مجبور تھے۔

مثلاً یہ آیت قرآنی:

"وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ۔"

اس کی ایک قراءت صحیحہ حسب ذیل ہے:

"وَاَوْصٰى بِهَا۔"

یہی وجہ ہے کہ بعض نسخہ ہائے قرآنی میں اس کو "وَصّٰى" اور بعض میں "اَوْصٰى" لکھا گیا۔ مگر "اَوْصٰى" کی قراءت بے حد قلیل ہے۔ یہاں تک کہ بعض نسخوں میں صرف پہلی قراءت ہی مذکور ہے، دوسری کا ذکر ہی نہیں کیا گیا[1]۔

حضرت عثمان یہ چاہتے تھے کہ لوگ صرف تحریر کردہ قرآنی نسخوں ہی پر قانع نہ ہو جائیں بلکہ براہِ راست صحابہ کے منہ سے قرآن سُن کر اس کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیں۔ اس لیے حضرت عثمان جب کسی ملک میں قرآن کا کوئی نسخہ بھیجتے تو اس کے ساتھ ایک قاری بھی بھیجتے جو اسی لہجہ میں قرآن پڑھتا جس میں وہ نسخہ لکھا گیا ہوتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم کا جو نسخہ مدینہ میں رکھا گیا تھا۔

---

[1] امام سیوطی الاتقان ج ۲ ص ۲۸۹ پر رقمطراز ہیں:

"جہاں تک مشہور اور مختلف قراءتوں کا تعلق ہے مثلاً:

اَوْصٰى وَوَصّٰى، تَجْرِيْ تَحْتَهَا وَمِنْ تَحْتِهَا، سَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهَ وَلِلّٰهِ، وَمَا عَمِلَتْ اَيْدِيْهِمْ وَمَا عَمِلَتْهُ۔"

یہ سب قراءتیں حضرت عثمان کے جمع کردہ قرآن میں موجود تھیں۔

اس کے قاری حضرت زید بن ثابت تھے۔ مکی مصحف کے قاری عبداللہ بن سائب شامی کے مغیرہ بن شہاب، کوفی نسخہ کے قاری ابوعبدالرحمن سلمی اور بصری قرآن کے قاری عامر بن عبدالقیس[1] تھے۔

جہاں تک قرآن کریم کے انفرادی نسخوں کے جلانے کا تعلق ہے یہ اقدام آپ نے صحابہ کے مشورہ کے مطابق کیا تھا۔ حضرت سُوَید بن غفلہ کا قول ہے:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے عثمان کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ نہ کہو۔ بخدا آپ نے مصاحف کے بارے میں جو کچھ بھی کیا ہمارے مشورہ کے مطابق اور ہماری موجودگی میں کیا۔"[2]

حضرت علی کا ارشاد گرامی ہے:

"اگر حضرت عثمان کی جگہ میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوتا تو مصاحف کے ساتھ وہی سلوک کرتا جو عثمان نے کیا۔"[3]

ایک محقق شخص اس مرحلہ پر پوچھ سکتا ہے کہ اب عثمانی مصاحف کہاں گئے، بظاہر ہے

---

[1] مناہل العرفان للزرقانی ج ۱ ص ۳۹۶ ۔ ۳۹۷)

[2] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۳

[3] البرہان ج ۱ ص ۲۴۰ ۔ نیز کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۱۲ ۔ مگر مستشرق بلاشیر کا خیال ہے کہ حضرت علی نے یہ نہیں کہا تھا کہ حضرت عثمان قرآن کے انفرادی نسخوں کے جلانے میں حق بجانب ہیں بلکہ حضرت علی نے صرف یہ کہا تھا کہ عہد رسالت میں مختلف چیزوں پر قرآن کریم کی جو سورتیں لکھی گئی تھیں حضرت عثمان نے ان کو تلف کر کے بہت اچھا کام کیا ہے، اس لیے کہ حضرت عثمان نے الگ الگ تحریر کردہ ان قرآنی نسخوں کو تلف کر کے امت کو اختلاف و افتراق سے بچا لیا (BLACHERE. 9 N TR. 63.) بلاشیر کا مقصد اس سے واضح ہے۔ بلاشیر یہ چاہتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت عثمان کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا اس کو مشکوک بنا دیا جائے۔ اس لیے وہ عبارت سے وہ مفہوم مراد لیتا ہے جس کی وہ متحمل نہیں ہے۔ شیعہ کے یہاں ایسی روایات بکثرت ہیں جن سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت عثمان رض کے اس فعل پر اظہار خوشنودی کیا تھا۔ (دیکھیے فرانسیسی میں ڈاکٹر عبداللہ دراز کی کتاب در بارہ قرآن)۔

کہ اس سوال کا کوئی شافی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ قاہرہ کے دارالکتب میں اس وقت قرآن کریم کے جو نسخے موجود ہیں ان میں سے بعض پر زرکشی کا کام کیا گیا ہے۔ بعض کی سورتوں کے آخر میں فصل وامتیاز کے لیے نقش بنائے گئے ہیں۔ یا ہر دس آیات کے بعد ایک خاص نشان لگایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ عثمانی مصاحف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ عثمانی مصاحف ایسے نشانات سے خالی تھے۔ مزید براں بعض مستشرقین نے بہت سی تاریخی روایات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض علمائے سلف نے یہ مصاحف یا ان میں سے چند سورتیں خاص خاص بلادِ اسلامیہ میں ملاحظہ کی تھیں۔

مذکورہ صدر مستشرقین کے سرخیل پروفیسر کواتر میر (QUATRE MERE) ہیں جیسا کہ مستشرق برجشتراسر (BERGESTRASSER) اور پرتزل (PRETZEL) نے اپنی اپنی کتاب "مطالعۂ تاریخ قرآن" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مستشرق کازانوفا نے اپنے پیش رو پروفیسر کواترمیر کے دراسات پر اعتماد کر کے ان پر نظرِ ثانی کی اور ان میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں مصاحف عثمانی میں سے ایک نسخہ موجود تھا اور لوگ عام طور سے اس سے واقف تھے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بذاتِ خود قرآن کا ایک نسخہ یا اس کے کچھ حصے ملاحظہ کیے تھے جن کو عثمانی تصور کیا جاتا تھا۔ یہ نسخے ابن بطوطہ نے اپنے سفر کے دوران غرناطہ، مراکش، بصرہ اور بعض دوسرے شہروں میں دیکھے تھے۔

اس ضمن میں عجیب بات یہ ہے کہ مستشرق کازانوفا یہ عجیب وغریب اور مفید معلومات ذکر کرنے کے بعد ان کی تاریخی اہمیت کو گھٹانا چاہتا ہے۔ ہماری حیرت کی حد نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ کازانوفا کے قول کے مطابق حضرت عثمان کے قرآن کو جمع کرنے کا واقعہ ایک فرضی افسانہ ہے[1] جو خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہدِ خلافت میں اس لیے گھڑا گیا تاکہ قرآنی

[1] CASANOVA, OP, CIT, 130 - 139

رسم الخط کی آرائش وزیبائش کے سلسلہ میں خلیفہ مذکور کی خدمات کو سراہا جائے[1]۔

مستشرق کازانوفا نے ایک اس سے بھی انوکھی اور طفلانہ گپ ہانکی ہے جس کو دنیا کا کوئی سلیم العقل شخص تسلیم نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اس کے ہمنوا مستشرقین بھی اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں[2]۔ اور وہ یہ کہ حجاج بن یوسف قرآن کا اوّلین جامع[3] تھا۔ بلاشیر اس نظریہ کی تغلیط وتردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہم کازانوفا کے اس فاسد نظریہ کو درست تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ تاریخی حقائق اس کی تردید کرتے ہیں[4]"۔

یہ بات خاصی مشہور ہے کہ امام ابن کثیر نے جو آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں شمار ہوتے ہیں، حضرت عثمان کا جمع کردہ شامی مصحف دیکھا تھا۔ چنانچہ ابن کثیر[5] اپنی کتاب "فضائل القرآن" میں رقمطراز ہیں:

"حضرت عثمان کے جمع کردہ مصاحف میں سے مشہور تر وہ مصحف ہے جو آج کل ملک شام کی جامع دمشق میں رکن کے پاس مقصورہ کی مشرقی جانب موجود ہے۔ یہ مصحف پہلے طبریہ میں تھا ۵۱۸ھ میں اسے دمشق لایا گیا۔ یہ جلیل القدر کتاب نہایت دیدہ زیب ودلکش، کبیر الحجم اور نہایت حسین جلی خط میں مرقوم ہے۔ اس کی جلد بڑی مضبوط ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اونٹ کے چمڑے[6] سے باندھی

---

[1] CASANOVA, OP, CIT, 141

[2] (BLACHERE, INTR. COR, P. 92)

[3] CASANOVA OP. CIT. P. 127

[4] (BLACHERE, INTR. COR. P. 68)

[5] اسماعیل بن عمر بن کثیر عماد الدین ابو الفداء بڑے حافظ مورخ اور فقیہ تھے۔ ان کی تصانیف میں سے تفسیر ابن کثیر، تاریخ میں البدایۃ والنہایۃ اور بہت سی قابل قدر کتب شامل ہیں۔ ۷۷۴ھ میں فوت ہوئے (الاعلام ج ۱ ص ۱۰۹) تفسیر کی بحث میں ان کا مفصل ذکر آئے گا۔ [6] فضائل القرآن ص ۴۹ طبع المنار ۱۳۴۸ھ۔

گئی ہے۔"

ہمارے علم کی حد تک ابن الجزری مصنف "النشر فی القراءات العشر" اور ابن فضل اللہ العمری صاحب[1] "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" دونوں حضرات نے یہ شامی مصحف ملاحظہ کیا تھا۔ بعض محققین کا میلان اس جانب ہے کہ یہ قرآن کافی عرصہ تک لینن گراڈ کی ایک لائبریری میں قیصر روس کے زیر حفاظت رہا۔ پھر وہاں سے انگلینڈ لایا گیا[2]۔

بخلاف ازیں بعض علماء کی رائے میں یہ نسخہ جامع دمشق میں رہا اور ۱۳۱۰ھ میں اس کو نذر آتش کر دیا گیا[3]۔ بہرکیف اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں اور ہر منصف مزاج شخص اس بات کی تائید کرتا ہے کہ قرآن کے سوا دنیا کی کسی کتاب کی حفاظت کے لیے وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو قرآن کے حصہ میں آیا۔ نہ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب بطریق تواتر انسانوں تک پہنچی۔

مستشرق شفالی نے بجا طور پر کہا ہے کہ:

"قرآن انسانوں کی توقعات سے بھی زیادہ مکمل صورت میں ان کے پاس پہنچا"[4]

اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ قرآن میں سچ فرمایا:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ	باطل نہ اس کے آگے سے آ سکتا ہے نہ
لَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ	پیچھے سے۔ یہ خداوند عالم کا نازل کردہ
حَمِيدٍ ۝	ہے۔

---

[1] شہاب الدین احمد بن یحییٰ بن فضل اللہ القرشی العدوی العمری عظیم مؤرخ تھے۔ آپ کی مشہور ترین تصنیف "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" ہے۔ آپ نے ۷۴۹ھ میں وفات پائی (الاعلام ج ۱ ص ۸۵)

[2] جو شخص مصاحف مخطوطہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو وہ شوفان (CHAUVIN) کی کتاب کی دسویں جلد مطالعہ کرے۔

[3] خطط الشام ج ۵ ص ۲۷۹۔ رفیق محترم پروفیسر ڈاکٹر یوسف العش نے مجھے بتایا تھا قاضی عبدالمحسن اسطوانی کا بیان ہے کہ موصوف نے جلائے جانے سے قبل یہ مصحف شامی بذات خود ملاحظہ کیا تھا وہ حجرہ میں محفوظ تھا اور اس کی حفاظت کے لیے لکڑی کا ایک خانہ بنایا گیا تھا۔

[4] (DIE SAMMLUNG DES. GORANS ۲، ۱۱۹)

فصل دوّم

عثمانی مصاحف تجوید و تحسین کے دور میں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے جو نسخے لکھوائے تھے ان پر نقطے اور اعراب نہ تھے۔ اس لیے لوگ ان کو مختلف طریقوں سے پڑھتے تھے۔ حروف کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے وہ اعراب اور نقطوں سے بے نیاز تھے۔ بقول امام ابو احمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ جب خلیفہ عبدالملک کا زمانہ آیا تو اس وقت بھی لوگ حضرت عثمان کے جمع کردہ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآنی نسخوں کو مرتب کیے ہوئے چالیس سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دور میں غلطیاں عام ہو گئیں اور عراق میں کثرت سے پھیل گئیں[۱] ظن غالب یہ ہے کہ غلطیوں سے وہ التباس مراد ہے جس میں لوگ بعض حروف کی ادائگی کے وقت مبتلا ہو جایا کرتے تھے۔ یہ اس وقت ہوا جب عرب عام طور پر عجمیوں سے ملنے لگے اور عربی زبان پر عجمی اثرات نمودار ہوئے[۲] عبدالملک کی خلافت یعنی ۶۵ھ میں بعض اموی حکام نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اگر قرآن کریم پر اعراب اور نقطے نہ لگائے گئے تو ممکن ہے کہ اس کی عبارت میں تغیر و تبدل رونما ہو۔ اس لیے انہوں نے قرآنی الفاظ پر کچھ ایسے نشانات لگا دیے جن سے حروف کی صحیح ادائگی میں مدد ملتی ہے۔ اس ضمن میں عبیداللہ بن زیاد متوفی ۶۷ھ اور حجاج بن یوسف ثقفی متوفی ۹۵ھ کے نام قابل ذکر ہیں۔

---

[۱] وفیات الاعیان۔ ج ۱۔ ص ۱۲۷ طبع ۱۳۱۰ھ قاہرہ۔ ابو احمد عسکری کے تعارف کے سلسلہ میں دیکھیے بغیۃ الوعاۃ للسیوطی ص ۲۲۱ بروکلمان نے ابو احمد عسکری اور ابو ہلال عسکری کو اپنی کتاب "تاریخ ادب عرب" میں خلط ملط کر دیا ہے اور دونوں کے مابین فرق نہ کر سکا۔ پھر اس طرف متوجہ ہوا۔ اور ضمیمہ میں تصحیح کر دی۔

[۲] المحکم للدانی ص ۱۰۔۱۹۔

ابن ندیاد کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے ایک فارسی الاصل آدمی کو حکم دیا تھا کہ قرآن میں جہاں سے کوئی لفظ حذف کیا گیا ہو اس کی جگہ الف لکھ دے چنانچہ قرآن میں دو ہزار الفاظ اس قسم کے پائے گئے تھے جن کو درست کر دیا گیا۔ مثلاً قلت کی جگہ قالت اور کنت کے بجائے کانت لکھ گیا۔[۱] حجاج کے بارے میں مذکور ہے کہ اس نے قرآن کریم کے بعض مقامات کی تصحیح کی تھی جس سے ان کا پڑھنا اور سمجھنا آسان ہو گیا تھا[۲]۔ حضرت عثمانؓ کے مندرجہ ذیل قول کو اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو اس میں آپ نے املائی تحسینات ہی کی جانب اشارہ کیا تھا۔

آپ نے فرمایا:-

"مجھے قرآن میں کچھ غلطیاں دکھائی دیتی ہیں جن کو عرب درست کر دیں گے"[۳]

حضرت عثمان کے مذکورہ صدر مقولہ میں اغلاط اور تصحیفات سے وہی غلطیاں مراد ہیں جن کا تعلق رسم الخط کے ساتھ ہے ظاہر ہے کہ زمان و مکان اور ماحول کے زیر اثر ایسے الفاظ میں اغلاط کا ظہور و شیوع کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے۔ رسم الخط کے علاوہ جہاں تک نص قرآنی کا تعلق ہے اس میں غلطی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ علماء کے سینوں میں محفوظ تھا جو اس کو ایک دوسرے سے مل کر بالمشافہہ بطریق تواتر اخذ کرتے تھے۔

قرآنی رسم الخط کی تحسین و آرائش کا کام یکایک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا۔ بخلاف ازیں یہ کام تدریجی طور پر جاری رہا اور تیسری صدی ہجری کے آخر میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ صرف ابوالاسود الدؤلی قرآن کریم کے نقاط و حرکات کے واضع تھے۔ علماء اس میں شروع سے اختلاف کرتے چلے آئے ہیں کہ قرآن پر سب سے پہلے نقطے کس نے

---

[۱] المحکم ص ۲۳۔ میں ابوبکر بن مجاہد سے منقول ہے کہ مشکول و منقوط ایک ہی چیز ہے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ البتہ قاری کا فہم منقوط کی نسبت مشکول کی جانب جلدی منعطف ہوتا ہے

[۲] ابن ابی داؤد کتاب المصاحف ص ۱۱۰۔

[۳] حوالہ مذکور۔ [۴] کتاب مذکور۔ ص ۳۰۔

لگائے[1] اس ضمن میں تین نام لیے جاتے ہیں[2]

(۱) ابوالاسود الدؤلی اور ان ہی کا نام زیادہ مشہور ہے۔

(۲) یحییٰ بن یعمر[3]

(۳) نصر بن عاصم اللیثی[4]

ابوالاسود کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے حضرت علیؓ کے حکم سے نحو کے چند مسائل مرتب کیے تھے[5] ہمارا خیال ہے کہ اسی سبقت کے پیش نظر قرآن کریم پر نقطے لگانے کی نسبت ان کی

---

[1] امام ابو عمرو الدانی فرماتے ہیں کچھ عجب نہیں کہ صحابہ ہی نے قرآن کریم پر نقطے لگائے ہوں اور اسے پانچ سورہ اور دہ سورہ میں تقسیم کیا ہو۔ (المحکم۔ ۲)۔

[2] سیوطی الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۲۹۰ پر لکھتے ہیں کہ وہ چار اشخاص ہیں۔ وہ اس ضمن میں حضرت حسن بصری کا نام بھی ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ موصوف کو اس کام کے ساتھ چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اور کسی نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ البتہ وہ نقطوں کو دیگر علماء کی طرح بنظر کراہت نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ اس ضمن میں زیادہ تشدد بھی انہیں پسند نہ تھا۔ چنانچہ ابن ابی داؤد حسن اور ابن سیرین سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ "قرآن پر نقطے لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (الاتقان ج ۲۔ ص ۲۹۰) ممکن ہے حضرت حسن بصری کو قرآن پر نقطے لگانے والوں میں اسی لیے شمار کر لیا گیا ہو کہ آپ اس کام کو ناپسند نہیں کرتے تھے۔

[3] یحییٰ بن یعمر بمقام بصرہ ۴۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنی زندگی کا کچھ حصہ عراق میں بسر کیا پھر خراسان چلے گئے ان کا میلان شیعہ کی طرف تھا (وفیات الاعیان۔ ج ۲۔ ص ۲۲۷) شاید اسی لیے حجاج نے اس کو خراسان کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔ منقول ہے کہ اس نے نوجوانی میں حضرت ابن عباس و ابن عمر سے حدیثیں روایت کی تھیں۔ قتادہ نے اس سے روایت کی ہے۔ قتادہ ۱۱۸ھ میں فوت ہوئے۔ یحییٰ بن یعمر شہر مرو کے قاضی مقرر ہوئے تھے اور ۱۲۹ھ میں وہیں وفات پائی (وفیات الاعیان ج ۲۔ ص ۲۶۶۔) نیز غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء ص ۳۸۱ و بغیۃ الوعاۃ۔ ص ۴۱۷۔ سیر النبلاء میں مرقوم ہے کہ ان کی وفات ۹۰ھ سے قبل ہوئی۔

[4] نصر بن عاصم اللیثی بصرہ کے قاری تھے۔ ابوالاسود الدؤلی اور یحییٰ بن یعمر سے استفادہ کیا۔ ابو عمرو بن العلاء ان کے شاگرد تھے۔ ۸۹ھ میں فوت ہوئے۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۴۰۴ و طبقات القراء ص ۳۳۶)۔

[5] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۳۷۸۔

جانب کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ منقول ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ابوالاسود قرآن کی زبان کے سلسلہ میں کس حد تک غیور واقع ہوئے تھے۔ ابوالاسود نے سنا کہ ایک قاری قرآن کریم کی حسب ذیل آیت تلاوت کر رہا ہے: اِنَّ اللّٰہَ بَرِیۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ رَسُوۡلُہٗ۔

قاری نے اس آیت میں "رَسُوۡلِہٖ" لام کی جر (زیر) کے ساتھ پڑھا۔ ابوالاسود یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور کہا "خدا کی ذات اس سے پاک ہے کہ وہ اپنے رسول سے بیزار ہو۔"

پھر بصرہ کے والی زیاد کے پاس آئے اور کہا "میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی" زیاد نے ان سے قرآن پر علامات لگانے کی فرمائش کی تھی جس سے لوگ قرآن کو پہچان سکیں۔[۳] مگر ابوالاسود جلد اس کی تعمیل نہ کر سکے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو آپ سخت پریشان ہوئے اور معاملہ بڑی نازک صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے اجتہاد کے زیر اثر فتحہ کی علامت یہ مقرر کی کہ حرف کے اوپر نقطہ لگا دیا۔ ضمہ کی علامت یہ مقرر کی کہ حرف کے اجزاء کے درمیان نقطہ لگا دیا۔ سکون (جزم) کی علامت ۔۔۔ دو نقطے مقرر کی۔ (مناھل العرفان للزرقانی۔ ج ۱۔ ص ۴۰۱۔ نیز الایضاح لابن الانباری ۱/۱۶۔ ۱/۱۷)

بعض علماء کا خیال ہے کہ ابوالاسود نے خلیفہ عبدالملک کے حکم سے قرآن پر نقطے لگائے۔

(الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۲۹۰)

مذکورہ صدر مختلف روایات کی روشنی میں ہم ان محرکات کی تعیین نہیں کر سکتے جن کے پیش نظر ابوالاسود قرآن پر نقطے لگانے کے لیے آمادہ ہوئے۔ ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ آیا ابوالاسود بذات خود اس کام کے لیے تیار ہوئے یا کسی کی ترغیب و تشویق سے آپ نے ایک ایسے

---

[۱] امام زرکشی البرھان۔ ج ۱۔ ص ۲۵۰۔ پر المبرد سے نقل کرتے ہیں کہ ابوالاسود پہلا شخص ہے جس نے قرآن پر نقطے لگائے۔ المحکم ص ۶۔ پر بھی اسی طرح مرقوم ہے۔

[۲] سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۳۔

[۳] البرھان ج ۱۔ ص ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ابوالفرج ذکر کرتے ہیں کہ زیاد بن ابی سفیان نے ابوالاسود کو قرآن پر نقطے لگانے کا حکم دیا تھا۔

کام کا بیڑا اٹھایا جس کے بارے میں پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہمیں اس کارنامہ کی حقیقت بھی معلوم نہیں جو آپ نے انجام دیا تھا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے ایک عظیم ذمہ داری قبول کی۔ یہ وہ کم از کم بات ہے جس پر تمام روایات داخبار متحد ہیں عقل و منطق سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ ابوالاسود نے تنہا قرآن پر نقطے اور اعراب لگانے کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد بلکہ چند افراد و اقوام مل کر بھی باہم ایسے عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے ابوالاسود کے لیے یہی بخر کافی ہے کہ وہ قرآن پر نقطے لگانے اور اس کی کتابت کی تحسین و تجمیل کی اولین کڑی تھے[1]

اس ضمن میں ایک کڑی اور بھی ہے جس کو بعض علماء اولین کڑی قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یحیٰی بن یعمر[2] نے سب سے پہلے قرآن کریم پر نقطے لگائے۔ یہ ضروری بات ہے کہ یحیٰی بن یعمر نے قرآن کے نقطے لگانے میں کچھ پارٹ ضرور ادا کیا ہوگا۔ مگر ہمارے پاس اس امر کی کوئی دلیل موجود نہیں کہ یحیٰی نے سب سے پہلے قرآن پر نقطے لگائے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ موصوف نے یہ کام مرو کے شہر میں انجام دیا ہو۔ اس ضمن میں یحیٰی کی سبقت و اولیت کا واقعہ اپنے استحکام کی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بقول ابن خلکان ابن سیرین کے پاس قرآن کا ایک نسخہ تھا، جس پر نقطے لگے ہوئے تھے۔ وہ نقطے یحیٰی بن یعمر نے لگائے تھے[3] یہ بات معلوم ہے کہ ابن سیرین نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۱۱۰ھ سے پہلے قرآن کا ایک نسخہ ایسا موجود تھا۔ جس پر نقطے لگے ہوئے تھے۔ اور یہ نقطے حرکات کے قائم مقام تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ معمولی بات نہیں اور اس کا تسلیم کرنا بھی چنداں آسان نہیں ہے[4]

---

[1] (BLACH, INTR, P-80, NOTE 103)

[2] المصاحف ص ۱۴۱۔ ھارون بن موسیٰ کی رائے بھی یہی ہے (المحکم ۵) امام بخاری کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ دیکھیے غایۃ النہایۃ ج ۲۔ ص ۳۸۱

[3] وفیات الاعیان طبع ۱۳۱۰ھ ج ۱۔ ص ۲۲۲۔ نیز البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۵۰۔

[4] مستشرق بلاشیر بھی اسی کا قائل ہے۔

جہاں تک نصر بن عاصم اللیثی کا تعلق ہے کچھ بعید نہیں کہ اس کے اساتذہ یعنی ابوالاسود اور ابن یعمر نے جس کام کا آغاز کیا تھا اس نے اس کام کی تکمیل کر دی ہو۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ نصر نے ان دونوں سے استفادہ کیا تھا۔

ابو احمد عسکری نے ایک عجیب و غریب روایت ذکر کی ہے کہ جب حجاج نے کاتبوں سے کہا کہ قرآن کریم کے حروف متشابہہ پر کچھ نشان لگا دو تاکہ انہیں پہچانا جا سکے تو نصر بن عاصم نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس روایت سے مستفاد ہوتا ہے کہ نصر نے سب سے پہلے قرآن پر نقطے لگائے تھے[1] مگر اس ضعیف ترین روایت کی اساس پر اس ضمن میں کوئی قطعی اور یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔

اگرچہ علی الاطلاق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابوالاسود یا ابن یعمر یا نصر نے سب سے پہلے قرآن کریم پر نقطے لگائے تھے۔ مگر یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ ان سب نے قرآن کریم کے رسم الخط کی تحسین و تجمیل اور اس کی قراءت و تلاوت کو لوگوں کے لیے آسان بنانے میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ اس میں بھی شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ حجاج کے بارے میں لوگوں کی رائے کچھ بھی ہو اور اس نے کسی نیت سے بھی اس کام کا حکم دیا ہو۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اس نے قرآن کریم پر نقطے لگانے کا حکم دے کر ایک عظیم اسلامی خدمت انجام دی تھی۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

زمانہ جوں جوں گزرتا گیا لوگ قرآن کریم کے رسم الخط کو آسان تر بنانے کے لیے سرگرم

---

[1] کتاب التصحیف لابی احمد العسکری۔ ابن خلکان نے اس روایت کو الوفیات ج ۱ ص ۱۲۵:
طبع ۱۳۱۰ھ پر نقل کیا ہے۔

[2] جاحظ کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ البرھان۔ ج ۱۔ ص ۲۵۱ پر لکھا ہے۔
"جاحظ نے کتاب الامصار میں لکھا ہے کہ نصر بن عاصم پہلا شخص تھا جس نے قرآن پر نقطے لگائے" نیز دیکھیے المحکم ۶۔

عمل رہے۔ یہ سہولت ہر زمانہ میں ایک نئی صورت اختیار کرتی رہی۔ خلیل[1] اولین شخص تھا جس نے نقطے ایجاد کیے۔ ایک کتاب میں ان پر روشنی ڈالی اور ان کے علل و اسباب ذکر کیے[2] ہمزہ تشدید (شدّ) اور روم و اشمام[3] (علم صرف و تجوید کی دو اصطلاحات) کے موجد بھی خلیل ہی تھے۔

جب ابوحاتم نے اعراب اور نقطوں کے بارے میں اپنی کتاب مکمل کی اس وقت قرآن کریم کا رسم الخط اپنے اوج کمال پر فائز ہو چکا تھا۔

بعد ازاں جب تیسری صدی ہجری اختتام پذیر ہوئی اس وقت قرآن کریم کا رسم الخط حسن و جودت کے آخری نقطہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس دور میں لوگوں کا یہ حال تھا کہ عمدہ خط اختیار کرنے اور نئی نئی علاماتِ ممیّزہ وضع کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مشدّد حرف کی پہچان کے لیے انہوں نے کمان جیسی ایک علامت مقرر کی۔ اسی طرح الفِ وصل پر فتح کسرہ اور ضمّہ کے مطابق اوپر نیچے اور درمیان میں علامت مقرر کی۔

قرآنی رسم الخط کی آرائش و زیبائش میں لاتعداد مشکلات حائل تھیں۔ تیسری صدی ہجری کے اواخر تک علماء قرآن پر نقطے لگانے کے مسئلہ میں مختلف الرائے رہے۔ اس امر کو بنظر کراہت دیکھنے کا آغاز اس وقت ہوا جب جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا:۔

"قرآن کو خالص رہنے دو اور اس میں کسی چیز کو مت ملاؤ"[5]

تابعین میں ایسے لوگ بھی تھے جو قرآن کو خوشبو لگانے اور اس کے اوراق میں گلاب

---

[1] خلیل بن احمد فراھیدی اَزدی کی کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے۔ آپ اپنے زمانہ میں عربیت کے امام تھے۔ آپ نے علم عروض وضع کیا۔ آپ نے ۱۷۵ھ میں وفات پائی۔

[2] المحکم ص ۹۔ [3] کتاب النقط لابی عمرو الدانی ص ۱۳۳ نیز الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۲۹۰۔

[4] سہل بن محمد المعروف بابی حاتم السجستانی اپنے زمانہ کے مشہور لغوی تھے۔ ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔ ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں ابوحاتم کے متعدد اقوال قرآن کریم کے رسم الخط کے بارے میں ذکر کیے ہیں۔ دیکھیے کتاب مذکور ص ۱۴۴۔

[5] اس کو ابو عُبید نے روایت کیا ہے دیکھیے الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۹۰ نیز المحکم ص ۱۰۔

کی پتیاں رکھنے کو بھی پسند نہیں کرتے تھے[۱]۔ اتباعِ تابعین کے عصر و عہد میں امام مالکؒ[۲] تفصیل کے قائل تھے۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ جن نسخہ ہائے قرآنی سے علماء لوگوں کو قرآن پڑھاتے ہوں ان پہ نقطے لگانا جائز ہے دوسروں پر نہیں[۳]۔ علاوہ ازیں اعتدال پسند لوگ بھی نقطے لگانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی ایسے لوگ بھی معرضِ ظہور میں آتے جو نقطے لگانے اور ہر دس آیات کے بعد نشان لگانے میں فرق کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو اس امر سے آگاہ کرتے تھے کہ قرآن پر نقطے لگانا تجرید قرآن (قرآن کو حشو و زوائد سے پاک کرنا) کے منافی نہیں ہے۔

علامہ حلیمیؒ[۴] فرماتے ہیں:۔

"پانچ یا دس آیتوں کے بعد نشان لگانا، سورتوں کے نام لکھنا اور ان میں مشمولہ آیات کی تعداد ذکر کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کو حشو و زوائد سے پاک رکھو۔ البتہ نقطے لگانا جائز ہے۔ اس لیے کہ اس میں یہ خطرہ دامن گیر نہیں ہے کہ غیر قرآن کو قرآن سمجھ لیا جائے گا۔ نقطوں کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ پڑھے جانے والے لفظ کی شکل و صورت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس لیے جس شخص کو نقطوں کی ضرورت ہو۔ اسے ان سے کچھ ضرر نہیں پہنچتا[۵]۔"

تاہم نقطے لگانے اور دس آیات کے بعد علامت مقرر کرنے میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ وہ پانچویں صدی ہجری کے آغاز تک لوگوں کو اعراب و نقاط سے خالی نسخہ ہائے قرآنی کی تلاوت

۱ھ اس کے راوی مجاہد ہیں (المحکم ص ۱۵-)

۲ھ اہل مدینہ کے مشہور امام اور امیر المومنین فی الحدیث مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر اصبحی کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ آپ نے المؤطا چالیسؓ سال میں مرتب کی اور اس کو ستر فقہاءِ مدینہ کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

۳ھ کتاب النقط لابی عمرو الدانی ص ۱۴۳ و الاتقان ج ۲۔ ص ۲۹۱۔

۴ھ ابو عبداللہ حسین بن حسن حلیمی جرجانی کی مشہور ترین تصنیف "المنہاج" ہے آپ نے ۴۰۳ھ میں وفات پائی۔ ۵ھ الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۲۹۱۔

پر اصرار کرنے سے روک نہ سکا۔ یہ متشدّدین ان علامات کو بدعت قرار دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض علماء بقول علامہ الدانی حرکات کی جگہ نقطے استعمال کرنے میں سہل انگاری سے کام لیتے تھے۔ مگر وہ قرآن کو حرکات کے ساتھ مشکول کرنے کے حق میں نہ تھے۔ اگرچہ اکثر لوگ اس میں کچھ حرج نہیں سمجھتے تھے[1]۔

علامہ الدانی کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ الفاظِ قرآنی اور ان حرکات کو باہم ممتاز و ممیز رکھنا چاہیے جن کو توضیح و تشریح کے لیے قرآنی حروف پر لگایا جاتا ہے۔ وہ سیاہی سے نقطے لگانے کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اس سے رسم الخط تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ہی مصحف میں مختلف قراءتوں کو مختلف رنگوں کے ساتھ جمع کرنے کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ یہ حد درجہ کی آمیزش ہے۔ اور اس سے حروف کی شکل و صورت تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ حرکات تنوین تشدید (شدّ) سکون (جزم)، اور مدّ سُرخی کے ساتھ اور ہمزہ کو زردی کے ساتھ ظاہر کرنا چاہیے[2]۔

اس کے بعد ایک ایسا زمانہ بھی آیا جب لوگ حرکات و نقاط کو ناپسند کرنے کے بعد ان کو بنظر استحسان دیکھنے لگے۔ جس طرح پہلے ڈرتے تھے کہ نقطے اور اعراب لگانے سے کہیں قرآنی حروف تبدیل نہ ہو جائیں۔ اب یہ خطرہ دامنگیر ہوا کہ اگر قرآن پر نقطے اور اعراب نہ لگائے گئے تو جاہل لوگ اس کی تلاوت میں غلطیوں کے مرتکب ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ الفاظ قرآنی کی حفاظت پہلے نقاط و اعراب کی کراہت کی موجب تھی۔ اب وہی حفاظت نقطے اور اعراب لگانے کی محرک و باعث ثابت ہوئی۔

امام نووی[3] فرماتے ہیں:

"قرآن پر نقطے اور اعراب لگانا ایک پسندیدہ فعل ہے، کیونکہ اس طرح وہ اعرابی

---

[1] النقط للدانی۔ ص ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ [2] الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۲۹۱۔ نیز النقط للدانی ص ۱۳۳۔

[3] امام حافظ محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی عظیم محدّث تھے۔ علوم الحدیث پر ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب شرح صحیح مسلم ہے۔ آپ نے ۶۷۶ھ میں وفات پائی۔

غلطی اور تحریف سے محفوظ ہو جاتا ہے[۱]۔

جن بدعات کو علماء نے پہلے پہل نظر کراہت دیکھا اور پھر ان کے مباح یا مستحب ہونے کے قائل ہوئے ان میں سے چند امور یہ ہیں :-

(۱) ہر سورت کے شروع میں اس کا عنوان تحریر کرنا۔

(۲) آیات کے اواخر میں اختتامی علامت دینا۔

(۳) قرآن کو اجزاء میں تقسیم کرنا۔

(۴) پھر اجزاء کو احزاب میں اور احزاب کو ارباع میں بانٹنا۔

(۵) مذکورہ صدر جملہ امور کو خاص نشانات لگا کر واضح کرنا۔

آیات کے اواخر پر جو نشانات لگائے جاتے ہیں لوگوں نے ان کو بہت جلد قبول کر لیا کیونکہ انہیں تقسیم آیات کی پہچان کی ضرورت تھی۔ خصوصاً جب کہ اس امر پر اجماع منعقد ہو گیا تھا کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے[۲]۔ اختتام آیات کے اظہار کے لیے جو اشارات انہوں نے مقرر کیے تھے۔ وہ متباین و متعدد تھے۔ بعض اوقات وہ آیت کے آخر میں آیت نمبر لکھ دیتے اور بعض دفعہ نہ لکھتے۔ ہر دس آیات کے بعد "عشر" (دس) کا لفظ یا اس کے پہلے حرف "عین" کا سر لکھ دیتے۔ اسی طرح ہر پانچ آیات کے بعد "خمس" (پانچ) کا لفظ یا "الخاء" کا سر بنا دیتے

۱؎ الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۲۹۱۔ نیز مناہل العرفان للزرقانی۔ ج ۱۔ ص ۴۰۲ پر امام نووی کی یہ پوری عبارت نقل کی گئی ہے۔ امام موصوف اپنی کتاب "التبیان" میں فرماتے ہیں :-

"علماء کا قول ہے کہ قرآن پر نقطے اور اعراب لگانا ایک پسندیدہ فعل ہے۔ کیونکہ اس طرح قرآن غلطی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ امام شعبی اور نخعی نے اس زمانہ میں اس فعل کو اس لیے مذموم قرار دیا تھا کہ قرآن میں تغیر و تبدل رونما نہ ہو۔ اگر اس کو بدعت بھی قرار دیا جائے تو یہ بدعت حسنہ ہو گی اور یہ اسی طرح ممنوع نہ ہو گی جس طرح علمی کتب تصنیف کرنا، مدارس تعمیر کرنا، سرائے بنانا، اور اس قسم کے دیگر امور و افعال ممنوع نہیں ہیں۔"

۲؎ علماء [illegible] آیات کی تعداد میں بھی اختلاف کیا ہے۔ زرکشی البرہان [illegible]

اور اس میں کچھ حرج نہیں سمجھتے[1]

باقی رہے وہ عنوانات جو سورتوں کے آغاز میں لکھے جاتے تھے اور جن سے ان سورتوں کے اسماء کا اظہار بھی ہوتا تھا اور مکی مدنی آیات کی تفصیلات بھی مندرج کی جاتی تھیں تو یہ امر حد درجہ جدل و نزاع کا موجب بنتا تھا۔ اس لیے کہ بہت سے علماء بلکہ عوام تک یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ امور توقیفی نہیں ہیں۔ بلکہ صحابہ کے اجتہاد کو بھی ان میں دخل ہے۔ جب ہم سورتوں کی ترتیب کو اجتہاد پر مبنی قرار نہیں دیتے بلکہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے[2] تو ہمارے پاس اس بات کی کوئی قوی دلیل موجود نہیں ہے کہ سورتوں کے نام بھی توقیفی ہیں[3]

اسی طرح ہم سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں بھی اجماع کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ کسی مخصوص سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہ ہو[4] دراصل یہی اختلاف سورتوں کے آغاز میں عنوانات قائم کرنے کے ضمن میں جدل و نزاع کا موجب بنا

(بقیہ صفحہ ۱۳۹) ص ۲۵۱-۲۵۲ پر لکھتے ہیں :-

"اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کو آیات کے اختتام سے آگاہ کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر آیت کے خاتمہ پر وقف فرمایا کرتے تھے۔ جب صحابہ اواخر آیات سے آگاہ ہو گئے تو آپ آیات کو ملا دیتے جس سے سامع یہ خیال کرتا کہ شاید یہاں آیت ختم نہیں ہوتی"

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] البرھان - ج ۱ - ص ۲۵۱ پر لکھا ہے :-

"کہ دس آیات پر نشان لگانے کا حکم خلیفہ مامون عباسی اور بعض کے نزدیک حجاج نے دیا تھا"

[2] دیکھیے البرھان - ص ۶۹-۷۱ -

[3] زرکشی البرھان - ج ۱ - ص ۲۷۰ - پر رقم طراز ہیں :-

"سورتوں کے متعدد اسماء کے بارے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا وہ خداوندی حکم کے مطابق رکھے گئے ہیں یا کسی دوسری مناسبت کی وجہ سے؟ امر ثانی کی صورت میں ایک ذہین آدمی ہر سورت سے متعدد معانی نکال سکتا ہے جن سے ان سورتوں کے اسماء مشتق و ماخوذ ہوں گے۔ اور یہ بڑی بعید بات ہے" (الاتقان - ج ۱ - ص ۹۰)

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۴۱)

مگر جلد ہی اختلاف کی شدت و حدت کم ہوگئی۔ لوگوں نے ان عنوانات پر قناعت نہ کی۔ بلکہ وہ ان کی آرائش وزیبائش کا اس حد تک اہتمام کرنے لگے کہ جہال نے ان کو قرآن کا ایک ضروری جزو قرار دے لیا[۱]۔

جب لوگوں نے پہلے آیات کے اواخر پر نشانات لگائے۔ پھر سورتوں کے آغاز میں عنوانات لکھنے کی جراءت کی تو قرآن کریم کی تحسین وتجمیل میں مختلف طریقے اختیار کرتے سے ان کو رد کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ ان کو یہ بات سوجھی کہ قرآن کریم کو اجزا (پاروں) اور احزاب (منزلوں) میں تقسیم کرنا بھی ایک طرح کی آرائش ہے۔ پھر انہوں نے اس کے جواز میں احادیث و روایات کا سہارا تلاش کرنا چاہا۔ چنانچہ امام زرکشی کہتے ہیں :۔

"جہاں تک قرآن کریم کو منزلوں اور پاروں میں تقسیم کرنے کا تعلق ہے۔ تو اس ضمن میں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کو مدارس میں تیس ۳۰ پاروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ امام احمد نے مسند میں اور ابو داؤد و ابن ماجہ نے اپنے اپنے سنن میں اوس بن حذیفہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صحابہ سے دریافت کیا تھا کہ تم قرآن کو مختلف حصوں میں کس طرح تقسیم کرتے ہو؟ صحابہ نے کہا تین ۳ یا پانچ ۵ یا سات ۷ یا نو ۹ یا گیارہ ۱۱ یا تیرہ ۱۳ حصوں میں سورہ ق سے لے کر آخر تک ہم ایک منزل قرار دیتے ہیں[۲]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰) [۴] بعض سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف کے لیے دیکھیے ج ۱- ص ۱۸-۲۳- ہم آگے چل کر اس پر تفصیلی بحث کریں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] کتاب المصاحف لابن ابی داؤد ص ۱۵۸ پر سورتوں کے عنوانات کے بارے میں موافقین ومخالفین کے دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] البرھان۔ ج ۱ ص ۲۵۰- اسی طرح قرآن کریم کو تیس ۳۰ پاروں میں تقسیم کیا گیا اور زیر تعلیم بچوں کی سہولت کے لیے یہ پارے الگ الگ طبع کیے گئے۔ پھر ہر پارہ کو دو اور ہر منزل کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

قرآن کریم کی تحسین و تجمیل اور اس کی کتابت کی آرائش و زیبائش کے سلسلہ میں خطاطوں نے بھی بڑا اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ منقول ہے کہ خلیفہ ولید (از ۸۶ھ تا ۹۶ھ) نے قرآن کریم کی کتابت کے لیے خالد بن ابی الھیاج کو مقرر کیا۔ جو اس دور کا مشہور ترین کاتب تھا۔ وہ خالد ہی تھا جس نے مدینہ منورہ کی مسجد نبوی کے محراب پر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا تھا۔[1]

چوتھی صدی ہجری کے اواخر تک کاتب قرآن کریم خطِ کوفی میں لکھتے رہے۔[2] پانچویں صدی ہجری کے شروع میں اس کی جگہ خوبصورت اور دلکش خطِ نسخ میں اس وقت بھی وہ نقطے اور حرکات موجود تھیں جو آج کل ہیں۔[3]

طباعتِ قرآن کے مختلف ادوار:

مشیتِ ایزدی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ طباعت کے ذریعہ اس کی کتاب دنیا میں پھلے پھولے۔ قلمی کتابت کی طرح قرآن کریم کی طباعت پر بھی تحسین و تجمیل کے اعتبار سے کئی ادوار و مراحل گزرے۔ چنانچہ "البندقیہ" کے مقام پر پہلی مرتبہ قرآن کریم زیور طبع سے آراستہ ہو کر معرضِ ظہور میں آیا۔ مگر کلیسا کا غلبہ اسے برداشت نہ کر سکا اور فی الفور قرآنی نسخوں کو ضائع کرنے کا حکم دیا۔ پھر مستشرق ہنکلمان (HINKELMANN) نے ہینبوگ (HANBOUTG) میں ۱۶۹۴ء میں قرآن کریم طبع کیا۔ بعد ازاں مستشرق مراکی (MARRACCI) نے ۱۶۹۸ء میں پاڈو (PADOUE) میں قرآن کریم چھپوایا۔ مگر اسلامی دنیا میں ان طبعاتِ ثلاثہ کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔[4]

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۱۰۔ طبع فلوجل ۱۸۷۱ء۔

[2] قرآن کریم جس جس خط میں لکھا گیا تھا ان کی اشکال و صُوَر کے بارے میں دیکھیے موریٹز (MORITZ) کا مضمون در انسائیکلوپیڈیا آف اسلام صفحہ ۳۹۴۔

[3] BLACHERE, INTR. COR., P. 133

[4] حوالہ مذکور ص ۱۳۲۔

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ دالائی عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ (SAINT PETERSBOURG) میں ۱۷۸۷ء میں خالص اسلامی طباعت کے زیر اہتمام چھپوایا۔ اسی طرح قازان کے شہر میں بھی قرآن کریم کو طبع کیا گیا۔

۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر طہران میں قرآن کریم کو پتھر پر چھاپا گیا۔ اسی طرح ایران کے شہر تبریز میں ۱۲۴۸ھ میں قرآن کریم کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا۔ مستشرق فلوجل (FLUGEL) نے ۱۸۳۴ء میں بمقام لیپزگ (LEIPZIG) بڑے اہتمام سے قرآن کریم چھپوایا۔ اس نسخہ کو آسان ہونے کی وجہ سے یورپ میں بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔ مگر اسلامی ممالک میں یہ مقبول نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ہندوستان میں قرآن کریم کئی مرتبہ چھاپا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں ترکی کے شہر استنبول میں طباعتِ قرآن جیسے اہم کام کا بیڑا اٹھایا گیا۔

۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں جب قاہرہ میں شیخ الازہر کی زیر سرپرستی قرآن کریم کا حسین وجمیل نسخہ شائع کیا گیا تو اس واقعہ کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہوئی۔ شاہ فواد اول نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ قرآن کریم کا یہ نسخہ بروایت حفص از عاصم مرتب کیا گیا تھا۔ اس نسخہ کو اسلامی دنیا میں بڑی شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے لاکھوں نسخے ہر سال شائع کر کے اطرافِ عالم میں بھیجے جاتے تھے۔ مشرق ومغرب کے تمام علماء اس بات پر متفق تھے کہ اس نسخہ کی طباعت وکتابت ہر لحاظ سے کامل اور معیاری ہے۔

---

[1] اس ضمن میں ہم نے مستشرق بلاشیر کی تصنیفات پر اعتماد کیا ہے۔ دیکھیے حوالہ مذکور ص ۱۳۲

فصلِ سوم

حُرُوفِ سبعہ

حروفِ سبعہ کی حقیقت:

کتب حدیث میں مختلف طُرق و اسانید سے روایت کردہ احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ جن سے مستفاد ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بوضاحت ارشاد فرمایا تھا کہ قرآن کریم سات قراءتوں (حروف سبعہ) کے مطابق نازل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے واضح اور مفصل حدیث وہ ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور بلفظ بخاری کے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے عہدِ رسالت میں ہشام بن حکیم رضؓ کو سورۂ فرقان تلاوت کرتے سنا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہشام یہ سورت اُس طرح تلاوت نہیں کر رہے جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت مجھے پڑھائی تھی۔ میں نے نماز ہی میں ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ بمشکل صبر سے کام لیا۔ یہاں تک کہ موصوف نے سلام پھیرا۔ پھر میں نے ہشام کی یا اپنی چادر ان کے گلے میں ڈال کر پوچھا، یہ سُورت آپ کو کس نے پڑھائی ہے ہشام نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے" میں نے کہا آپ جھوٹ کہتے ہیں بخدا یہ سُورت مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود پڑھائی تھی" میں ہشام کو کھینچتا ہوا بارگاہِ نبوی میں لے گیا اور عرض پرداز ہوا کہ میں نے اس شخص کو اس طرح سورہ فرقان تلاوت کرتے سنا ہے جو آپ کی تلاوت سے مختلف ہے۔ حالانکہ یہ سورت مجھے آپ نے پڑھائی تھی۔ آپ نے فرمایا "عمر! اسے چھوڑ دو" پھر ہشام سے فرمایا "مجھے پڑھ کر سناؤ" ہشام نے اسی طرح وہ سورت سنادی۔ آپ نے فرمایا "یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی تھی" پھر فرمایا "یہ قرآن سات قرأتوں

کے مطابق نازل کیا گیا ہے جیسے آسان ہو پڑھ لیا کرو[۱]۔

اس میں شبہ نہیں کہ مذکورہ صدر حدیث صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہے جن کا شمار بہت دشوار ہے۔ حافظ ابو یعلیٰ[۲] کی مسند میں منقول ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بر سر منبر فرمایا:

"جس شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی ہو کہ قرآن سات قراءتوں پر اتارا گیا ہے، میں اسے قسم دیتا ہوں کہ کھڑا ہو کر اس بات کی شہادت دے، بے حد کر بے شمار صحابہ شہادت دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان کے ساتھ میں بھی اس بات کی شہادت دیتا ہوں[۳]۔"

کثیر التعداد صحابہ کی روایت کی بناء پر بعض محدثین نے ______ اس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے[۴]۔ مذکورہ صدر حدیث کو متواتر قرار دینے والوں کے سرخیل ابو عبید قاسم بن سلام ہیں۔ پچھلے طبقات میں یہ حدیث متواتر کے درجہ پر فائز نہ بھی ہو۔ تاہم

---

[۱] صحیح بخاری۔ ج ۶۔ ص ۱۸۵ و تفسیر ابن جریر طبری ۱/۱۰ و مسند احمد ۱/۲۴ نیز مسند بحاشیہ شاکر ج ۱ ص ۲۴۴ حدیث نمبر ۱۵۸ و برہان زرکشی ۱/۲۱۱۔

[۲] ان کا نام نامی احمد بن علی بن مثنیٰ تمیمی موصلی ہے۔ یہ بڑے حافظ حدیث اور ثقہ تھے۔ ابو یعلیٰ کے نام سے مشہور تھے۔ مسند صغیر و کبیر ان کی دو مشہور تصانیف ہیں۔ ۳۰۷ھ میں بمقام موصل وفات پائی۔ (الرسالۃ المستطرفۃ ۵۳-۵۴)

[۳] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۴۷۔

[۴] امام سیوطی نے اس ضمن میں جن صحابہ کے نام گنوائے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے روایت کنندگان کی تعداد کتنی وافر ہے۔ سیوطی فرماتے ہیں: [illegible]

"یہ حدیث صحابہ کی ایک کثیر جماعت سے منقول ہے۔ ان صحابہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

ابی بن کعب۔ انس۔ حذیفہ بن یمان۔ زید بن ارقم۔ سمرہ بن جندب۔ سلمان بن صرد۔ ابن عباس۔ ابن مسعود۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ عثمان بن عفان۔ عمر بن الخطاب۔ عمر بن ابی سلمہ۔ عمرو بن العاص۔ معاذ بن جبل۔ ہشام بن حکیم۔ ابو بکرہ۔ ابو جہم۔ ابو سعید خدری۔ ابو طلحہ انصاری۔ ابو ہریرہ۔ ابو ایوب یہ کل اکیس[illegible]

[illegible] الاتقان ۱۔ ص ۴۷

اس میں شبہ نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سابقہ ذکر کردہ ارشاد گرامی کی تائید و تقویت میں مستند احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں، وہ ہمارے لیے کافی ہیں۔

جمہور علماء کا رجحان و میلان اس جانب ہے کہ عثمانی مصاحف سات قراءتوں پر مشتمل تھے[1]

قاضی ابوبکر باقلانی اس رائے کو اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"صحیح بات یہ ہے کہ حروفِ سبعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول و مشہور ہیں۔ آئمہ حدیث نے ان کو ضبط کیا اور حضرت عثمان اور دیگر صحابہ نے ان کو مصحف میں درج کیا اور درست قرار دیا تھا۔ صرف اسی قراءت کو حذف کیا جس کا متواتر[2] ہونا ثابت نہ تھا۔"

حدیث میں "سبعۃ احرف" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اَحرف کا واحد حرف ہے جس کے مختلف معانی ہیں۔ حرف قراءت کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ابن الجزری کا یہ قول:۔

کَانَتِ الشَّامُ تقرءُ بحرف عامر[3] — اہل شام عامر کی قراءت کے مطابق پڑھا کرتے تھے

حرف معنی اور جہت کو بھی کہتے ہیں[4]۔ ابوجعفر محمد بن سعدان نحوی[5] کی یہی رائے ہے۔

جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ "احرف" سے قراءتیں مراد ہیں ——— جیساکہ خلیل بن احمد سے منقول ہے ——— یہ بلاشبہ ضعیف ترین قول ہے[6] خصوصاً جب "حروفِ سبعہ" سے سات قراءتیں مراد لی جائیں[7]

---

[1] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۸۵۔ [2] البرھان۔ ج ۱۔ ص ۲۲۳۔

[3] طبقات القراء از ابن الجزری۔ ج ۱۔ ص ۲۹۲۔ [4] البرھان۔ ج ۱۔ ص ۲۱۳۔

[5] یہ مشہور قاری تھے۔ پہلے حمزہ کی قراءت کے مطابق پڑھا کرتے تھے۔ پھر ایک مخصوص قراءت کا طریقہ ڈالا جو ان کی جانب منسوب ہے۔ ۲۳۱ھ میں وفات پائی (انباہ الرواۃ ج ۲۔ ص ۱۴۰ وطبقات القراء ج ۲۔ ص ۱۴۳۔ وبغیۃ الوعاۃ ص ۴۵)۔

[6] البرھان۔ ج ۱۔ ص ۲۱۲ ———

[7] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۸۰۔ امام سیوطی اس ضعیف رائے پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اس پر یہ

احرف سبعہ کے معنی ومفہوم کی تعیین کے بارے میں علماء نے مختلف ومتضاد افکار وآراء کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ بعض علماء نے اس ضمن میں پینتیس[1] اور بعض نے چالیس[2] اقوال ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے اکثر اقوال ایسے ہیں جن کی تائید نہ نقل صحیح سے ہوتی ہے اور نہ عقل سلیم سے۔ اختلاف آراء کی وجہ یہ ہے کہ علماء نے "احرف سبعہ" کی تعیین قطعی ویقینی طور پر کرنا چاہی ہے۔ حالاں کہ بقول ابن العربی اس حدیث کی توضیح وتشریح میں نہ کوئی نص وارد ہوئی ہے اور نہ کوئی اثر۔ اور اس کے معنی میں لوگوں کے یہاں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے[3]۔

علماء کے یہاں اس حدیث کے ضمن میں یہ بحثیں اٹھیں کہ آیا سات سے اس حدیث میں ایک خاص عدد مراد ہے؟ یا کوئی خاص عدد مراد نہیں بلکہ آپ کا مقصود قاری کے لیے سہولت پیدا کرنا ہے کہ جیسے پڑھ سکے پڑھ لے۔ جو لوگ سات سے ایک خاص عدد مراد نہیں لیتے وہ متواتر احادیث ..... کو ترک کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث میں سات کا عدد بصراحت مذکور ہے اور وہ غیر مقصود نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ اس عدد کا تذکرہ ایک ایسے معاملہ میں کیا گیا ہے جس کا تعلق براہِ راست وحی اور اس کے طریق نزول سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے امور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ ایک مبہم بات فرما سکتے تھے اور نہ ایک ایسا عدد ذکر کر سکتے تھے جس کا مفہوم مراد ہی نہ ہو۔ لہٰذا اہل علم صحابہ نے اس ضمن میں آپ سے جو کچھ نقل کیا ہے۔ اس کا اعتقاد کے ساتھ گہرا ربط ہے۔

مگر جو لوگ نصوص کی چنداں پرواہ نہیں کرتے اور ان کو ترک کرنے یا ان کی تاویل کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ان کا خیال ہے کہ سات سے ایک خاص عدد مراد نہیں بلکہ تلاوت وقراءت میں آسانی سہولت اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سات کا عدد بول کر کثرت فی الآحاد مراد لی جاتی ہے۔ جس طرح ستر کے عدد سے دھائیوں اور سات سو سے سوؤں کی کثرت مراد لی

[1] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۱۲۔ [2] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۴۸۔

[3] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۱۲۔

جاتی ہے۔ ان کے خیال میں سات یا ستر[1] یا سات سو[1] سے ایک خاص عدد مراد نہیں ہوتا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ قول قاضی عیاض[2] جیسے شخص کی جانب منسوب ہے جو حدیث صحیح کے مقابلہ میں کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتے۔ سیوطی نے بڑے زبردست دلائل کی روشنی میں اس قول کی تردید کی ہے[3]

سابقہ تصریحات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ سات کے لفظ سے کثرت نہیں بلکہ ایک خاص عدد مراد ہے۔ اکثر علماء کا زاویہ نگاہ یہی ہے۔ اور اس کے اثبات کے لیے انہوں نے بڑی محنت وکاوش سے کام لیا ہے۔ بقول محدث ابن حبان[4] "سبعہ" کا لفظ سات کے عدد میں محصور ہے[5]۔ مگر یہ امر متنازع فیہ ہے کہ وہ سات حروف کیا ہیں؟ اکثر علماء نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ قرین صحت وصواب نہیں ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حروف سبعہ سے سات قراءتیں مراد لینا درست نہیں بعض علماء نے حروف سے مختلف لہجے اور لغات مراد لی ہیں۔ مگر یہ قول بھی ضعیف ہے۔ یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں نہایت دقیق فرق پایا جاتا ہے۔ بعض علماء[6] کے نزدیک لہجہ کا فرق بہت معمولی چیز ہے۔ اور اس سے لفظ ومعنی میں چنداں تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اظہار وادغام روم واشمام تخفیف وتسہیل اور نقل وابدال (یہ سب علم صرف اور قراءت وتجوید کی اصطلاحات ہیں)۔ ایک ہی لفظ کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کی الگ الگ صورتیں ہیں۔ مگر ان سے اس

---

[1] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۴۷۔ نیز محاسن التاویل للقاسمی۔ ج ۱۔ ص ۲۸۷۔

[2] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۴۸۔ قاضی عیاض بہت بڑے عالم اور اپنے زمانہ کے امام الحدیث تھے۔ نام ونسب عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو یحصبی ہے۔ آپ "کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ" کے مصنف ہیں۔ ۵۴۴ھ میں وفات پائی (الاعلام۔ ج ۲۔ ص ۴۹۷)۔

[3] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۴۸۔

[4] حافظ محمد بن حبان بستی کی کنیت ابو حاتم ہے۔ یہ محدثین کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ ۳۵۴ھ میں وفات پائی (شذرات الذہب۔ ج ۳۔ ص ۱۶۔)

[5] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۲۱۲

[6] یعنی ابن الجزری دیکھیے الاتقان ج ۱۔ ص ۴۸۔

حرف کی حیثیت میں فرق نہیں آتا اور وہ ایک ہی لفظ رہتا ہے۔ مگر ہم اس قول کو اس وجہ سے ضعیف قرار نہیں دیتے۔ کیونکہ جب ایک ہی لفظ کو مختلف و متنوع طریقوں سے ادا کیا جائے تو وہ ایک لفظ نہیں رہتا۔ بخلاف ازیں ہمارے نزدیک اس کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی طرح پڑھنے کا کوئی جواز نہیں۔ جب کہ دوسرے وجوہ و طرق بھی موجود ہوں۔ چنانچہ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ایک طرف لہجہ کی تبدیلی سے ایک لفظ کی حیثیت میں صرف یہ فرق آتا ہے کہ اس سے صرف اس کے طریقِ اداء میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری جانب لغات کے اختلاف سے بعض اوقات دو لفظوں کے موضوع و مفہوم میں تباین و تخالف پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارے لیے یہ ممکن ہو کہ ہم عربی لغات کے باہمی اختلاف کو بلا کمی و بیشی سات میں محصور و محدود کر سکیں اور ہمارے حصر کو کسی شک و شبہ اور تعصب کا الزام لگائے بغیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یقیناً کسی جدل و نزاع کے بغیر حروفِ سبعہ سے لغاتِ سبعہ ہی مراد ہوں گی۔ مگر اس ضمن میں جس تکلّف و تعسّف سے کام لیا جاتا ہے وہ کسی دانشمند پر پوشیدہ نہیں۔ خواہ لغاتِ عرب سے قریش[۱] ۔ ہذیل[۲] ۔ تمیم[۳] ۔ ازد[۴] ۔ ربیعہ[۵] ۔ ہوازن اور سعد بن بکر کی بولی مراد لی جائے ۔ یا صرف قبائلِ مُضر یعنی ہذیل[۱] ۔ کنانہ[۲] ۔ قیس[۳] ۔ ضبّہ[۴] ۔ تیم الرباب[۵] ۔ اسد بن خزیمہ اور قریش[۶]

---

[۱] ابو عُبید قاسم بن سلّام اور احمد بن یحییٰ ثعلب نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ (البرھان ۔ ج ۱ ص ۲۱۷) الازہری التہذیب میں لکھتے ہیں کہ قولِ مختار یہی ہے۔ وہ حضرت عثمان کے اس قول سے احتجاج کرتے ہیں جو انہوں نے مصاحف کی ترتیب کا حکم دیتے وقت فرمایا تھا:

"جس بات میں تمہارے اور زید کے اندر اختلاف پیدا ہو جائے اس کو قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن زیادہ تر انہی کی زبان میں نازل ہوا تھا"

(البرھان ۔ ج ۱ ۔ ص ۲۱۸) ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ خلاف پیدا ہونے کا اندیشہ صرف رسم الخط میں تھا کسی اور بات میں نہیں۔

[۲] الاتقان ج ۱ ۔ ص ۰ ۔ زرکشی البرھان ج ۱ ص ۲۱۹ میں قریش کی تخصیص پر ایک (باقی بر صفحہ ۱۵۰)

اس لیے کہ قرآن میں چند الفاظ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو مذکورہ صدر قبائل کے علاوہ دیگر قبیلوں کی زبان سے تعلق رکھتے تھے مگر قریش نے ان کو اپنا لیا تھا۔ ابو بکر واسطی[1] نے اپنی کتاب "الارشاد فی القراءاتِ العشر" میں لغاتِ عرب کی تعداد چالیس[2] بتائی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

اِخْسَؤُوْا (رسوا ہو جاؤ) یہ قبیلہ عذرہ کی زبان ہے۔

بَئِیْس (شدید۔سخت) یہ قبیلہ غسان کی بولی میں کہتے ہیں۔

لَا تَغْلُوْا (مبالغہ نہ کرو) یہ قبیلہ لخم کی بولی ہے۔

حَصِرَتْ (تنگ ہوگئی) یہ یمامہ کی لغت ہے۔

هَلُوْعًا (بے تاب) یہ قبیلہ خثعم کی زبان میں کہتے ہیں۔

اَلْوَدْق (بارش) جرہم کی زبان میں۔

امام ابن عبد البر[3] نے "سبعۃ احرف" سے سات لغات مراد لینے پر تعجب کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں:

"اگر یہ بات ہوتی تو صحابہ آغازِ اسلام میں ایک دوسرے کی قراءت پر معترض نہ ہوتے کیونکہ یہ ان کی مادری زبان تھی۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ بن خطاب اور ہشامؓ بن حکیم دونوں قریشی تھے۔ اور اس کے باوجود ان کی قراءت باہم مختلف تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹) اعتراض عمر بن عبد البر کی زبانی نقل کرتے ہیں فرماتے ہیں "چند علماء نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ قرآن میں قبیلہ مضر کی زبان بھی استعمال کی گئی ہے کیونکہ اس میں تو لغاتِ شاذہ بھی ہیں۔ جس طرح قبیلہ قیس اور تمیم کی زبان میں بعض شاذ الفاظ مروج ہیں۔ یہ زبانیں قرآن کے مناسب حال نہیں ہیں"

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ابو بکر واسطی کا نام ونسب محمد بن محمد بن بیان ہے، یہ بڑے عمر رسیدہ اور حافظ حدیث تھے

[2] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۲۳۰۔ علاوہ ازیں مثالوں کیلئے دیکھئے الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۲۲۷۔ ۲۳۱۔

[3] ان کا نام ونسب یوسف بن عبد اللہ بن عبد الصمد بن عبد البر النمری القرطبی ہے۔ یہ کتاب "الاستیعاب" کے مصنف ہیں۔ ۴۶۳ھ میں وفات پائی (شذرات الذہب۔ ج ۳۔ ص ۳۱۴)

یہ ممکن نہ تھا کہ حضرت عمرانؓ کی اپنی زبان کے بارے میں ان پر معترض ہوتے"۔

اس حدیث میں وارد شدہ لفظ "سبعہ" (سات) سے کثرت کا مفہوم مراد لے کر بھی اس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے۔ مگر ہم بتا چکے ہیں کہ ایسے موقع پر عدد کے مفہوم کو ساقط قرار دینا درجہ کی کمزور رائے ہے۔

علماء نے "احرفِ سبعہ" کی شرح و توضیح میں جس قدر اقوالِ ضعیفہ نقل کیے ہیں ہم ان پر صرف اظہارِ حیرت ہی نہیں کرتے بلکہ اس بات کی پرزور تردید کرتے ہیں کہ بعض علماء نے ان سے ایسا مفہوم مراد لیا ہے جس کی شرعاً کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ اپنے خیال کے مطابق اس حدیث کی نہایت دقیق و عمیق باطنی تفسیر تصویر کرتے ہیں۔ وہ اس حدیث کی شرح و تفسیر میں ایسے نادر اقوال ذکر کرتے ہیں جو کسی شخص نے بیان نہیں کیے۔

مثلاً وہ کہتے ہیں کہ "احرف سبعہ" سے مندرجہ ذیل سات[1] علوم مراد ہیں۔

(۱) علم[1] الانشاء والایجاد۔ علم التوحید[2] والتنزیہ۔ علم صفات[3] الذات۔ علم صفات[4] الافعال۔ علم صفات[5] العفو والعذاب۔ علم الحشر[6] والحساب۔ علم النبوات[7]۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مندرجہ ذیل سات[2] امور مراد ہیں۔

مطلق[1] و مقید۔ عام[2] و خاص۔ نص[3] و مؤول۔ ناسخ[4] و منسوخ۔ مجمل[5] و مفسر۔ استثناء[6] [illegible] مستثناء[7]۔

بعض لوگوں نے اس ضمن میں اس حد تک جسارت سے کام لیا کہ اپنی بے بنیاد رائے کے اثبات میں ضعیف حدیث سے احتجاج کرنے سے بھی باز نہ رہے۔ انہوں نے بروایت ابن مسعودؓ

---

[1] البرہان - ج ۱ - ص ۲۱۲ - نیز الاتقان - ج ۱ - ص ۸۲۔

[2] الاتقان - ج ۱ - ص ۸۳ - نیز برہان زرکشی - ج ۱ - ص ۲۲۴ - ۲۲۵ - زرکشی نے اس ضمن میں قرآنی دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ مگر ہم نے اختصار کے پیشِ نظر الاتقان کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

[3] البرہان - ج ۱ - ص ۲۲۵۔

ایک مرفوع حدیث ذکر کی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا:

"گویا کتب سابقہ ایک ہی دروازہ سے ایک ہی طرح نازل ہوتی تھیں۔ بخلاف ازیں قرآن سات دروازوں سے سات احرف پر اتارا گیا۔ وہ سات حروف یہ ہیں۔

زاجر[1]۔ آمر۔ حلال۔ حرام[2]۔ محکم[3]۔ متشابہ۔ امثال۔

لہٰذا قرآن کی حلال کردہ اشیاء کو حلال سمجھو اور محرمات کو حرام قرار دو۔ اس کے بیان کردہ امثال سے عبرت حاصل کرو۔ اس کے متشابہات پر ایمان لاؤ۔ اور کہو کہ "اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا"[1]

ابن عبدالبر فرماتے ہیں:

"یہ حدیث اہل علم کے نزدیک ثابت نہیں بلکہ اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق کیا گیا ہے[2]"

احرفِ سبعہ کی حدیث سے مستشرقین کا استدلال:

یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ہم نے جن شکوک و شبہات کا ذکر کیا ہے وہ ان عظیم اعتراضات کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں جن کا موقع بعض مفسرین نے بنا پر اخلاص و حسنِ نیت پیدا کر دیا ہے اور مستشرقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے لیے شبہات کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے۔

اس اشکال کا حاصل یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ملتے جلتے اور یکساں معانی کے اظہار کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

مثلاً: اَقْبِلْ۔ هَلُمَّ۔ تَعَالَ۔ (آجا)

عَجِّلْ۔ اَسْرِعْ۔ (جلدی کر)

اُنْظُرْ۔ اَخِّرْ۔ اَمْهِلْ (مہلت دے)

اور اس قسم کے دیگر الفاظ[3]

---

[1] البرہان۔ ج۔ ص۔ [2] البرہان۔ ج۔ ص۲۰۶۔ [3] البرہان۔ ج

تفسیر طبری کے ظاہری الفاظ سے بھی یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ ایسے قریب المعنیٰ الفاظ کا استعمال درست ہے۔ طبری لکھتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو فرمایا تھا۔

"اے عمر! قرآن میں ہر طرح کے الفاظ کا استعمال درست ہے بشرطیکہ تو رحمت کی جگہ عذاب اور عذاب کی جگہ رحمت کا لفظ نہ رکھ دے[1]"

ظاہر ہے کہ ایسی بات کو مستشرقین کیونکر نظر انداز کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس سے اس بات پر استدلال کیا کہ قراءت بالمعنیٰ کا نظریہ اسلامی زندگی میں حد درجہ خطرناک تھا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص جیسے چاہتا قرآن کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لیتا[2] یہ نصوص کی تاویل اور ان کے اصلی معنیٰ کو تبدیل کر کے غیر حقیقی معانی پہنانے کا لازمی نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قراءت بالمعنیٰ[3] کے الفاظ کا استعمال یہاں اس طرح نہیں کیا گیا جس طرح حدیث کی روایت بالمعنیٰ میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ استعمال بے محل اور ناموزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اور قراءت دو مختلف چیزیں ہیں۔ قرآن اسی وحی کا نام ہے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر بیان و اعجاز کے لیے نازل کی گئی تھی۔ جب کہ قراءت اس اختلاف کو کہتے ہیں جو وحی مذکور کو لکھتے وقت کاتبوں کے الفاظ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یا حروف میں جو ثقل اور خفت ہوتی ہے اس کو بھی قراءت کہا جاتا ہے[4]۔

یہ بات دلائل صحیحہ سے معلوم ہو چکی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے آغازِ اسلام

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۱، ص ۱۰۔

[2] BLACHERE, INTRO, COR, 59.

[3] ابن الجزری اپنی کتاب "النشر" میں قرأت بالمعنیٰ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بعض صحابہ مثلاً ابن مسعودؓ قراءت بالمعنیٰ کو جائز قرار دیتے تھے وہ ان پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ ابن مسعودؓ نے صرف یہ کہا تھا کہ میں نے قراء کو قرآن پڑھتے سنا اور معلوم کیا کہ ان کے الفاظ باہم ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے جس طرح تمہیں معلوم ہے پڑھ لیا کرو" (محاسن التاویل للقاسمی۔ ج ۱، ص ۲۹)

[4] البرہان۔ ج ۱، ص ۳۱۸ نیز الاتقان۔ ج ۱، ص ۱۳۸۔

میں نرمی و سہولت کے پیشِ نظر مسلمانوں اور خاص طور سے بوڑھے مردوں اور عورتوں کو اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ قرآن کریم کو اپنی زبان کے مطابق پڑھ لیا کریں۔ اس لیے کہ دوسری زبان میں پڑھنے سے مشقت کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ ان قرأتوں کو قرآنی الفاظ کی طرح مصاحف میں لکھ لیں۔ بخلاف ازیں اس انداز قراءت کی اجازت دینے سے آپ کی مراد صرف بعض افراد کو سہولت و تخفیف بہم پہنچانا تھا اور بس۔

البتہ کاتبِ وحی صحابہ کو آپ نے جن الفاظ کے لکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ وہ نہایت قلیل التعداد ہیں۔ اور بطریق تواتر محفوظ ہیں۔ اس لیے کہ کسی آیت کے جزوِ قرآن ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حدیث متواتر سے ثابت ہو۔ نیز ان انفرادی حالات کو حروفِ سبعہ سے عام قرار دے کر قراءت بالمعنی پر محمول کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور نہ ہم حدیث میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

جب حدیثِ مذکور کی شرح و تفسیر میں ذکر کردہ آراء کا بطلان ثابت ہو گیا تو یہ حقیقت روشن ہوئی کہ اس ضمن میں صحیح رائے وہی ہے جو عقل و نقل سے ہم آہنگ ہے اور اس لیے صحیح ترین اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔

خلاصہ یہ کہ احرفِ سبعہ سے ——— واللہ اعلم ——— وہ سات طریقے مراد ہیں جن کے مطابق قرآن کریم کو پڑھ سکتے ہیں۔ امت کے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے اس کی اجازت دی گئی ہے تاکہ قاری کے لیے جیسے بھی آسان ہو وہ اسی طرح اس کو

۱؎ زرکشی اس کی تائید میں ترمذی کی ایک حدیث بروایت ابن ابی کعب نقل کرتے ہیں کہ آنحضور جبریل سے ملے اور فرمایا "جبریل مجھے ان پڑھ امت کی جانب مبعوث کیا گیا ہے۔ ان میں بوڑھے مرد اور عورت بھی ہیں اور چھوٹے بچے اور بچیاں بھی۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی" جبریل نے عرض کی اے محمد! قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

... ص ۲۲۰ ؛ ۲؎ البرہان۔ ج ۱۔ ص ۱۰۵

پڑھ لے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"جبریل نے مجھے ایک قراءت کے مطابق پڑھایا تو میں اس سے مزید آسانی کا مطالبہ کرتا رہا حتی کہ وہ سات حروف (سات قراءتوں) تک پہنچ گئے"[1]

بہرکیف اگر قرآن کریم کے ایک لفظ کو مختلف ومتنوع طریقوں سے ادا کیا جائے تو وہ طور طریقے سات سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں:

ا۔ پہلی قسم کا اختلاف وہ ہے جو وجوہِ اعراب میں ہوا کرتا ہے۔ خواہ معنی ومفہوم میں تبدیلی پیدا ہو یا نہ ہو۔

معنی میں تبدیلی ہونے کی مثال یہ آیت ہے:

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ[2] — پس آدم نے اپنے رب سے کلمات اخذ کیے

اس کو یوں بھی پڑھا جاتا ہے:

فَتَلَقَّىٰ آدَمَ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٌ — آدم پر اس کی رب کی طرف سے کلمات ڈالے جاتے تھے

معنی میں تبدیلی پیدا نہ ہونے کی مثال یہ ہے:

وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ۔[3] — کاتب اور گواہ کو ضرر نہ پہنچایا جائے۔

اس کو یوں بھی پڑھا جاتا ہے:

وَلَا يُضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ۔ — کاتب اور گواہ کو ضرر نہ پہنچایا جائے

---

[1] صحیح بخاری ج ۶۔ ص ۱۸۵

[2] سورۃ البقرۃ۔ ۳۷۔ (الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۹۰) اس کی مثال یہ آیت بھی ہے "رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا" اس کو یوں بھی پڑھا جاتا ہے "رَبُّنَا بَاعَدَ بَيْنَ أَسْفَارِنَا" (سورۂ سبا۔ ۱۹) باعد ایک جگہ بصیغہ امر ہے اور دوسری جگہ بصیغہ ماضی۔ یعقوب نے اس کو بصیغہ ماضی پڑھا ہے۔ اس آیت میں اعراب کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر لفظ کی صورت وہی رہتی ہے۔ (اتحاف فضلاء البشر از محمد دمیاطی ص ۳۵۹)

[3] سورۃ البقرۃ۔ ۲۸۲ (الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۹۰) اس کی (باقی بر صفحہ ۱۵۶)

۲۔ دوسری قسم اختلاف فی الحروف ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) ایک صورت وہ ہے جس میں معنی و مفہوم بدل جاتا ہے مگر صورت برقرار رہتی ہے۔ اس کو بعض اوقات نقطوں کے اختلاف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً یعلمون و تعلمون[1]

(۲) دوسری صورت میں لفظ بدل جاتا ہے مگر معنی برقرار رہتا ہے۔ جیسے "بصراط والسراط" اور "المصیطرون والمسیطرون[2]" مصاحف میں یہ لفظ صاد کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ یہ صاد دراصل سین تھا۔ اس لیے اس کو صاد اور سین دونوں کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

۳۔ تیسری قسم کا وہ اختلاف ہے جو اسموں کے مفرد تثنیہ جمع اور تذکیر و تانیث میں رونما ہوتا ہے[3] مثلاً آیت کریمہ:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ[4] ۝

اس کو بصیغہ واحد "لِاَمَانَتِهِمْ" بھی پڑھا جاتا ہے۔ عثمانی مصاحف میں اس کو لِاَمٰنٰتِهِمْ لکھا گیا تھا کیونکہ اس میں الف ساکن نہیں تھا۔ مگر معنی بدستور رہتے ہیں۔ اگر اس کو مفرد پڑھا جائے تو جنس ہونے کی بناء پر اس میں کثرت کا مفہوم ہوگا۔ اور اگر جمع قرار دیا جائے تو جمع میں سب افراد کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ تو گویا جمع ہونے کی صورت میں بھی جنس کا مفہوم پیدا ہو جائے گا اور اس میں امانت کے سب افراد شامل ہو جائیں گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۵) مثال یہ آیت بھی ہے "وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ" اس کو یوں بھی پڑھا جاتا ہے "وَيَضِيْقَ صَدْرِيْ" (سورۃ الشعراء ۔ ۱۳) دوسری یعقوب کی قراءت ہے (اتحاف فضلاء البشر ص ۳۳۱)۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] البرهان، ج ۱۔ ص ۲۲۲ پر لکھا ہے کہ امام مالک سے دریافت کیا گیا کہ یعلمون و تعلمون میں سے کون سا صحیح ہے؟ فرمایا دونوں ٹھیک ہیں۔ لوگوں کے الگ الگ مصاحف تھے۔ اور وہ دونوں طرح پڑھا کرتے تھے۔ اس کی مثال یہ آیت بھی ہے "وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا" اس کو "نُنْشِرُهَا" یعنی راء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ ۔ ۲۵۹۔ پہلی ابن عامر عاصم حمزہ کسائی اور خلف کی قراءت ہے (اتحاف فضلاء البشر ص ۲۰۲)

[2] آیت یوں ہے "ام هم المسیطرون" ۔ (سورۃ الطور ۔ ۳۷)۔

[3] الاتقان، ج ۱۔ ص ۴۹۔ [4] سورۃ المؤمنون ۔ ۸ ۔

یہی وجہ ہے کہ "العھد" کا لفظ آیت میں دونوں قراءتوں کے مطابق مفرد ہی آیا ہے۔
چنانچہ اس کو "وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ"۔ نہیں پڑھا گیا
اس کو یوں بھی نہیں پڑھا جاتا:

"وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعُهُودِهِمْ رَاعُونَ"

یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا میں بناء برجنس "البقر" کے لفظ کو مذکر قرار دے کر فعل مفرد مذکر لایا گیا ہے۔ اس لیے "تَشَابَهَ عَلَيْنَا" فرمایا۔ اور ایک جگہ جمع کا لحاظ کرکے مونث لایا گیا ہے۔ چنانچہ تشابہ سے مضارع مونث لا کر اس کی ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے اور "تَشَابَهُ" پڑھا گیا۔ یہ لفظ دراصل "تَتَشَابَهُ" تھا[1]

۴۔ اختلاف کی چوتھی قسم یہ ہے کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھا جائے اور وہ دونوں باہم مترادف استعمال ہوتے ہوں۔ دونوں میں فرق یہ ہو کہ ان میں سے ایک کسی قبیلہ میں رائج ہو اور دوسرا نہ ہو۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ" دُھنی ہوئی روئی کی طرح" اس کو "كَالصُّوفِ الْمَنْفُوشِ" بھی پڑھا گیا ہے[2]

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ دو الفاظ باہم اس لیے تبادل ہو جایا کرتے ہوں کہ وہ قریب المخرج ہوں اور نظر بریں ان کا آپس میں تبدیل ہو جانا چنداں دشوار نہ ہو۔ علاوہ ازیں ان کی لفظی مقاربت و مماثلت معنوی یک رنگی و ہم آہنگی پر دلالت کرتی ہو مثلاً قرآن کریم کے یہ الفاظ:

"طَلْحٍ مَنْضُودٍ"[3] اس کو "طَلْعٍ مَنْضُودٍ" بھی پڑھا گیا ہے۔

---

[1] سورۃ البقرۃ - ۷۰، دیکھیے ہماری کتاب دراسات فی فقہ اللغۃ ص ۸۷۔

[2] سورۃ القارعۃ - ۵ (البرھان، ج ۱- ص ۲۱۵-)

[3] سورۃ الواقعۃ - ۲۹ - (البرھان، ج ۱- ص ۲۱۵) امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ سورۃ الجمعہ کی آیت نمبر ۹ میں فَاسْعَوْا کی جگہ "فَامْضُوا إِلَى ذِكْرِ اللهِ" بھی پڑھ سکتے ہیں (البرھان ج ۱- ص ۲۲) حالانکہ یہ قراءت متواتر کے درجہ تک نہیں پہنچی۔ بلکہ اس کے روایت کرنے میں حضرت عمر و ابن عباس و ابن مسعود رضی اللہ عنہم (باقی برصفحہ ۱۵۸)

اس تبدیلی کی وجہ جواز یہ ہے کہ عین اور حاء دونوں حلقی حرف ہیں اور اسی لیے باہم قریب المخرج ہونے کی وجہ سے آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا کو "اَيْمَانَهُمَا" پڑھتے ہیں۔[۱]

مگر یہ قراءت شاذ ہے کیونکہ بطریق آحاد وارد ہوئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بطور تفسیر کے اَيْمَانَهُمَا پڑھا کرتے تھے (ان کا مقصد یہ تھا کہ "اَيْدِيَهُمَا" سے یہاں دائیں ہاتھ مراد ہیں)۔

۵۔ پانچویں قسم کا اختلاف وہ ہے جو بعض الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے سلسلہ میں رونما ہوتا ہے۔ تقدیم و تاخیر کی وجہ یا تو کلام عرب میں عام طور سے معروف ہوتی ہے۔ یا کسی خاص موقع و محل اور انداز تعبیر کے باعث اس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

مثلاً یہ آیت کریمہ:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۔[۲]

اس آیت کے آخری الفاظ کو یوں بھی پڑھا گیا ہے:

"فَيُقْتَلُوْنَ وَيَقْتُلُوْنَ"۔ "يَقْتُلُوْنَ" بصیغہ مضارع معروف کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دشمنوں کو قتل کرتے ہیں۔ جب کہ يُقْتَلُوْنَ بصیغہ مضارع مجہول کے یہ معنی ہیں کہ وہ شہادت کی آرزو لیے ہوئے میدان جہاد میں جاتے ہیں اور شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان دونوں لفظوں کی تقدیم و تاخیر سے معنی و مفہوم میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۰) منفرد تھے۔ دیگر صحابہ یہاں "فَاسْعَوْا" پڑھا کرتے تھے (البرهان ج ۱ ص ۲۰۵ حاشیہ)
(حاشیہ صفحہ ہذا)

[۱] سورۃ المائدۃ ۔ ۳۸ ۔ (البرهان ج ۱ ص ۳۲۶)

[۲] سورۃ التوبۃ ۔ ۱۱۱ ۔ (الاتقان ج ۱ ص ۸۰)

حضرت ابوبکرؓ آیت "وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ" کے بجائے "وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ"[1] پڑھتے ہیں۔ مگر یہ تواتر کے درجہ تک نہیں پہنچتی اس لیے یہ شاذ قراءت ہے۔ مزید براں اگر یہ ثابت ہو بھی جائے کہ ابوبکرؓ نے اس طرح پڑھا تھا تو یہ اجماع صحابہ کے خلاف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ "سکرات الموت" کے الفاظ استعمال عرب میں عام طور سے معروف ہے۔ مگر سکرات الحق نہیں بولا جاتا۔ بعض اوقات بھول کر یا زبان کی لغزش کی بنا پر بھی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر کی جانب جو قراءت منسوب ہے اس کی حقیقت بھی یہی ہے۔[2]

۶ - چھٹی قسم کا اختلاف یہ ہے کہ اہل عرب کے دستور کے مطابق حروف جارہ و عاطفہ کو کبھی حذف کیا جائے اور کبھی باقی رکھا جائے اور اس طرح کلام میں کمی بیشی کی جائے۔ قرآن میں اس قسم کی کمی بیشی کو صرف چند الفاظ کی حد تک محفوظ رکھا گیا ہے۔ محفوظ نہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کمی بیشی چنداں اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اس کو شاذ تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں بھی ایسی کمی بیشی کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں یہ مذکور ہوتا ہے کہ یہ ائمہ ثقات کے نزدیک محفوظ نہیں ہے اور اس لیے شاذ ہے۔

اضافہ کی مثال سورۃ التوبہ کی یہ آیت ہے:

"جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ"۔ اس کو "مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" بھی پڑھا گیا ہے[3] یہ دونوں متواتر قراءتیں ہیں اور مصحف عثمانی کے مطابق ہیں۔ مصحف مکی میں بھی یہ اضافہ[4] موجود ہے۔ مگر بعض علماء نے اس کو حذف کر دیا ہے۔

کمی کی مثال یہ آیت ہے:

---

[1] سورۃ ق ۱۹ (البرہان ج ۱ ص ۳۳۵)

[2] اسی طرح یہ قراءت "إِذَا جَآءَ فَتْحُ اللّٰهِ وَالنَّصْرُ" بھی شاذ ہے۔

[3] سورۃ التوبہ ۱۰۰ (البرہان ج ۱ ص ۳۳۲)۔ [4] الاتقان ج ۱ ص ۱۳۰۔

"قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" سورۂ بقرہ کی یہ آیت شروع سے "و" کو حذف کر کے پڑھی گئی ہے۔ مصحفِ شامی میں بھی واؤ مذکور نہیں ہے[1]

آیتِ قرآنی "وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ" سے مَا خَلَقَ کو حذف کر کے "وَالذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ" بھی پڑھا گیا ہے۔[2]

حضرت ابن عباس سورۃ الکہف کی آیت کو یوں پڑھتے ہیں:

وَكَانَ أَمَامَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ صَالِحَةٍ غَصْبًا ۝

مذکورہ بالا آیت میں "صالحۃ" کے لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور لفظ "وراء" کے بجائے "أمام" پڑھا گیا ہے۔

یہ دونوں قراءتیں خبرِ واحد سے منقول ہیں۔ ظاہر ہے کہ خبرِ واحد سے قرآن[3] ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے حدیث متواتر کی ضرورت ہے۔

اسی طرح آیت قرآنی تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً[4] میں لفظ "اُنثیٰ" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ آیت وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ" کے آگے وکان کافرًا بڑھایا گیا ہے۔[5]

آیت "حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ" کے آگے "والصلوۃ[6] صَلٰوۃُ الْعَصْرِ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں جو اضافہ کیا گیا ہے وہ تفسیر و توضیح کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کو "حروف سبعہ" میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے ذاتی

---

[1] سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲ (الاتقان، ج ۱-ص ۱۳۰)

[2] سورۃ الیل آیت نمبر ۳ (احکام القرآن لابن العربی، ج ۲-ص ۳۰۹)

[3] سورۃ الکہف آیت نمبر ۷۹ (الاتقان، ج ۱-ص ۱۳۲)

[4] سورۃ ص آیت نمبر ۲۳۔ [5] سورۃ الکہف آیت نمبر ۸۰

[6] سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۳۸۔

مصحف میں ان کو درج کیا گیا تھا۔[1]

۷۔ ساتویں قسم کا وہ اختلاف ہے جو لہجوں کی تبدیلی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اختلاف زیادہ تر فتح امالہ، ترقیق، تفخیم، ہمزہ، تسہیل (یہ سب قراءت و تجوید کی اصطلاحات ہیں) حروفِ مضارع کو کسرہ دینے، بعض حروف کو تبدیل کرنے، میم کے اشباع اور بعض حرکات کے اشمام سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آیت "هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى"[2] اور "بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ"[3] میں اَتٰی و مُوْسٰی اور بَلٰی کے الفاظ کو کسرہ کی طرف امالہ کر کے پڑھا گیا ہے۔

ارشاد خداوندی "خَبِيْرًا بَصِيْرًا" کو دونوں راء کی ترقیق اور "وَالصَّلٰوةَ" اور "وَالطَّلَاقُ" کو دونوں لام کی تفخیم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

آیت "قَدْ اَفْلَحَ"[4] میں ہمزہ کو حذف کر کے اور اس کی حرکت کو قَدْ کی دال کی طرف نقل کر کے قَدَ افْلَحَ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس کو تسہیل الہمزہ کہتے ہیں۔

آیاتِ قرآنیہ "لِقَوْمٍ تَعْلَمُوْنَ"، "نَحْنُ نَعْلَمُ"، "تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ"، "اَلَمْ اَعْهَدْ" میں فعل مضارع کو بکسر حروفِ مضارع بھی پڑھا جاتا ہے۔

آیت "حَتّٰى حِيْنٍ" کو قبیلہ ہذیل والے عَتّٰی یعنی حاء کو عین کے ساتھ تبدیل کر کے پڑھتے ہیں۔

"عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ" اور "مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ" میں جمع کی میم کو اشباع کے ساتھ عَلَيْهِمُوْ اور مِنْهُمُوْ پڑھتے ہیں۔

---

[1] البرہان، ج ۱۔ ص ۲۱۵۔
[2] سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ۹۔
[3] سورۃ القیامۃ آیت نمبر ۴۔
[4] سورۃ المومنون آیت نمبر ۱۔ (البرہان، ج ۱۔ ص ۳۲۰۔ اسی طرح قُلْ اُوْحِيَ (سورۃ الجن) اور آیت "وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ" (سورۃ البقرہ) میں بھی تسہیل الہمزہ جائز ہے۔

آیت "وَغِیضَ الْمَآءُ" کو اشمام ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ اقسامِ سبعہ میں سے یہ آخری قسم حد درجہ اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ قرآن کو حروفِ سبعہ پر کس لیے اُتارا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں اُمت کے لیے تخفیف اور سہولت پائی جاتی ہے۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کی اس اُمت میں مختلف قبائل پائے جاتے تھے۔ جن کے لہجہ اور طرز ادا میں بڑی حد تک تفاوت و تباین پایا جاتا تھا۔ اس لیے ان کے لہجہ اور انداز نطق و ادا کی رعایت ضروری تھی۔ البتہ ان کی لغات کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ قرآن نے لغت قریش کو منتخب کیا تھا جو مختلف لغات عرب کی نمایندہ اور ترجمان تھی[۱] بعض علماء جس کھینچا تانی اور تعصب سے بعض قبائل کی زبان کو ترجیح دیتے ہیں، کسی عقلی اور نقلی دلیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں نے جب قریش کے لہجہ کو اپنایا اور اپنی مشترک ادبی زبان بنایا تو وہ قریش کی زبان سے خود بھی متاثر ہوئے اور اس پر بھی اپنے اثرات ڈالے۔ اس طرح قریش کی زبان پر تاثیر و تاثر کے قوانین نے اپنا اثر دکھایا۔ یہ ایسے قوانین ہیں جن سے دنیا کی کوئی زبان خالی نہیں[۲]

یہ ایک مسلمہ صداقت ہے جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ قریش کی زبان سب سے زیادہ بھرپور تھی۔ اس کا اسلوب نہایت رَواں دَواں اور الفاظ کی کثرت و ثروت سے مالا مال تھا۔ اس زبان میں انواع و اقسام کے معانی و مضامین کے ادا کرنے کی صلاحیت سب سے زیادہ پائی جاتی تھی[۳] کتابت و تالیف اور شعر و خطابت کے لیے اس سے موزوں تر دوسری کوئی

---

[۱] اسی کے پیشِ نظر امام بخاری نے اپنی صحیح میں لغتِ قریش میں قرآن کے نازل ہونے کے بارے میں مستقل ایک باب باندھا ہے۔ (بخاری، ج ۶ ص ۱۸۲)

[۲] دیکھیے ہماری کتاب "دراسات فی فقہ اللغۃ" ص ۱۰۹ طبع اوّل۔

[۳] دراسات فی فقہ اللغۃ۔ ص ۵۹ - ۶۰

زبان نہ تھی۔

اس کی حد یہ ہے کہ قریش کے علاوہ دیگر قبائل کے شعراء شعر کہتے وقت الفاظ کی بناوٹ اور ترکیب کلمات میں اپنے مخصوص طرز و انداز کو نظر انداز کر کے قریش کے لہجہ کو اختیار کرتے تھے تاکہ وہ لوگوں سے اس زبان میں بات کریں جس سے وہ مانوس ہوں اور جس کو انہوں نے اس وقت اختیار کیا جب بہت سے عوامل نے اس کو شستہ و رُفتہ بنا دیا تھا [1]

خلاصۂ کلام یہ کہ جب کائنات ارضی کو اسلام کے آفتابِ عالم تاب نے منور کیا۔ اس وقت ایک ایسی مثالی زبان موجود تھی۔ جو ہر لحاظ سے چیدہ و برگزیدہ تھی اور جو عوام نہیں بلکہ خواص کے نزدیک بھی تعبیر و بیان کا بہترین ذریعہ تھی۔ جب قرآن کریم واضح عربی میں نازل ہوا تو اس سے عربی کے دائرہ میں اتنی وسعت پیدا ہوئی۔ اور اس کی تاثیر میں خاطر خواہ اضافہ ہوا البتہ ظہورِ اسلام کے وقت عربی کو جو لغوی وحدت حاصل تھی اور نزول قرآن نے جس کی قوت کو دو بالا کر دیا تھا اس سے عربی قبائل کے مختلف لہجے جو قبل از اسلام موجود تھے مٹ نہ سکے بلکہ حسبِ سابق برقرار رہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عرب عوام اسلام لانے کے بعد جب اپنے دیار و بلاد کو لوٹتے تو وہ قریش کی مثالی اور وحدت پذیر زبان میں نہیں۔ بلکہ اپنی مخصوص اور قبائلی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ اور ان کی گفتگو پر اپنی مخصوص زبان کے آثار و علامات نمایاں ہوتے تھے [2] ابن ہشام فرماتے ہیں:

"عرب ایک دوسرے کے اشعار پڑھتے اور اپنی مادری زبان بولتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شعروں کو مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے [3]"

---

[1] دراسات فی فقہ اللغتہ۔ ص ۶۰۔

[2] کتاب مذکور۔ ص ۵۰۔ ۵۱۔

[3] المذہر۔ ج ۱۔ ص ۲۶۱۔

یہی وجہ ہے کہ لغوی وحدت کے پیش نظر قرآن نے عرب کے بلغاء و خود اس کو مخاطب کر کے چیلنج کیا کہ قرآن جیسی کتاب لکھ لائیں۔ یا کم از کم ایک آیت ہی بنا لائیں۔ دوسری طرف قراءت و اداء کے طریقوں میں "حروف سبعہ" کے مطابق وسعت و سہولت پیدا کی تاکہ عوام کے لیے آسانی رہے اور وہ اپنے اپنے لہجوں میں قرآن پڑھ سکیں۔ عربوں کو اس بات پر مجبور نہیں کیا گیا تھا کہ وہ قرآن کو اس طریقہ کے مطابق پڑھیں جو ان کے یہاں رائج نہیں، اور اس طرح پڑھنا ان کے لیے آسان بھی نہیں[1]

ابن الجزری اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"سات حروف پر وارد ہونے کا مقصد یہ تھا کہ اُمّت کے لیے تخفیف و سہولت رہے۔ یہ آسانی اور سہولت اس عظمت و فضیلت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ جو خاص طور سے اس اُمّت کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی مقبولیت کا بھی اثر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء سابقین کو اپنی اپنی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام سُرخ و سیاہ اور عرب و عجم کی جانب مبعوث کیا گیا تھا۔ قرآن عربوں کی زبان میں نازل ہوا تھا۔ ان کی بولی میں بڑا فرق پایا جاتا تھا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی بولی کے علاوہ دوسروں کی زبان بولیں۔ بلکہ بعض عربوں کی یہ حالت تھی کہ وہ سکھانے سے بھی دوسروں کی زبان نہیں سیکھ سکتے تھے۔"[2]

سابقاً ذکر کردہ سات اقسام میں سے آخری قسم یعنی "اختلاف لہجات" کی اہمیت کے پیش نظر بعض علماء نے حروفِ سبعہ کو لہجہ کے مختلف اقسام میں محدود کر دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعض علماء نے از رہ غفلت اس آخری قسم کا ذکر تک نہیں کیا۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] دراسات فی فقہ اللغۃ ص ۵۰۔
[2] مناهل العرفان للزرقانی ج ۱۔ ص ۱۳۹۔

آخری قسم میں ایسا اختلاف نہیں پایا جاتا جس سے لفظ و معنی میں تغیر و تنوع پیدا ہو جائے۔ اس لیے کہ مختلف لہجوں کی تبدیلی سے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا۔[1]

ہمارے نزدیک یہ دونوں نظریات مبالغہ پر مبنی ہیں۔ یہ بات کسی طرح موزوں نہیں کہ سابقاً ذکر کردہ چھ اقسام کو اہم ہونے کے باوصف نظر انداز کر کے صرف ساتویں قسم کا ذکر کیا جائے۔ اسی طرح آخری قسم کی اہمیت مسلّم ہے کیونکہ بعض حروف کی ادائگی میں لہجہ کا اختلاف صحابہ کے یہاں بھی پایا گیا تھا۔ بلکہ اس قسم کا اختلاف صحابہ میں زیادہ جاری و ساری تھا۔ للہذا آخری قسم کو نظر انداز کر کے باقی چھ اقسام کو ذکر کرنا کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ مذکورہ چھ اقسام طرز قراءت و تلاوت کے جملہ اختلافات کو شامل نہیں ہیں۔

وجوہ سبعہ کی تحقیق و تلاش میں متقدمین سے جو سہل انگاری و تغافل شعاری ہوئی تھی۔ اس کے پیش نظر ہم نے ان سے الگ راہ اختیار کی۔ چنانچہ ہم نے ابو الفضل رازی[2] کا مسلک بھی اختیار نہیں کیا جس کو زرقانی نے اپنی کتاب "مناہل العرفان" میں ابن قتیبہ اور ابو الخیر بن الجزری اور قاضی ابو بکر بن الطیب باقلانی[3] کے نظریہ سے افضل قرار دیا ہے۔ ہم ان میں سے کسی کے مسلک کو بھی پسند نہیں کرتے۔

رازی مذکور نے اپنی کتاب "اللوائح" میں "اختلاف فی الحروف" کا ذکر اشارۃً بھی نہیں کیا مثلاً "یعلمون و تعلمون" کا اختلاف اسی قسم میں شامل ہے۔ حالانکہ اختلاف فی الحروف

---

[1] مناہل العرفان للزرقانی، ج ۱ ص ۱۴۵۔ اس قسم کے الفاظ کو ابن الجزری کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔

[2] ابو الفضل بن شاذان رازی متوفی ۲۹۰ھ بہت بڑے امام تھے (النشر ج ۱ ص ۱۷۹)

[3] مناہل العرفان فی علوم القرآن از محمد عبد العظیم زرقانی، ج ۱ ص ۱۴۸، ۱۶۰۔ زرقانی نے تینوں علماء کے افکار و آراء بیان کر کے ابو الفضل رازی کے نقطۂ نگاہ سے ان کا تقابل کیا اور رازی کے نظریہ کو ترجیح دی ہے، ابن الجزری نے "النشر فی القراءات العشر" ج ۱ ص ۲۶، ۲۸ میں ابو الفضل رازی ابن قتیبہ اور اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ زرقانی نے یہ نظریہ ابن الجزری سے اخذ کیا۔ اور اس کو ان کی طرف منسوب نہیں کیا۔

ان چھ اقسام میں شامل نہیں ہے مزید براں رازی نے ماضی مضارع اور امر یعنی افعال کی گردان میں پیدا ہونے والے اختلاف کو ایک مستقل قسم قرار دیا ہے۔ باوجودیکہ یہ اختلاف فی الاعراب کی ایک قسم ہے۔ موخر الذکر تین علماء کے نظریات کو ہم اس لیے تسلیم نہیں کرتے کہ انہوں نے اختلافِ لہجات کی قسم کو عملی طور پر نظر انداز کر دیا ہے اور اس کا ذکر صرف نظری حیثیت سے کیا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری ذکر کردہ اقسام سبعہ قراءت میں پیدا ہونے والے جملہ اختلافات کو شامل ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ہی لفظ میں ان سات اقسام کا التزام واجب ہے بخلاف ازیں ہر کلمہ میں جُدا گانہ طور پر ان میں سے کبھی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ اور کبھی زیادہ۔ بعض اوقات ایک لفظ میں صرف ایک ہی قسم پائی جاتی ہے۔ ہمارا مقصود یہ ہے کہ اختلاف جب بھی کہیں رُونما ہوگا وہ ان اقسام سبعہ میں سے ایک قسم میں ضرور داخل ہوگا[1]

ہم نے پہلے متقدمین کے آراء و افکار کو ذکر کر کے ان میں جمع و تطبیق کا اہتمام کیا۔ اور پھر اختلاف کے اقسام کو سات انواع میں محدود و محصور کر دیا جہاں تک صحابہ کرام کا تعلق ہے ان کے سامنے عہد رسالت میں قرآنِ کریم حروفِ سبعہ میں نازل ہُوا تھا۔ آپ صحابہ کو سات حروف کے مطابق قرآن پڑھاتے اور ان سے آگاہ کرتے تھے۔ صحابہ اُمّی تھے اور لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے۔ صحیح طور سے وہ نہیں جانتے تھے کہ حروفِ سبعہ سے کیا مراد ہے۔ البتہ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ مفردات القرآن میں جو اختلاف پیدا ہو سکتا ہے وہ سات اقسام سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ جو مختلف قراءتیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سکھائی تھیں اور ہمیں ان سے آگاہی حاصل ہوئی۔ ان سے عملی طور پر یہ سات قسمیں جمع ہو گئیں اور ہمیں بطریق استقراء و استنباط ان کا علم حاصل ہُوا۔

---

[1] البرھان، ج ا۔ ص ۲۲۳۔

تیسرا باب

علوم القرآن

فصل اوّل

عُلُومُ القرآن کا تاریخی جائزہ!

صحابہ کرام خالص عرب تھے اور عربی زبان کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ سالارِ رسل صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ کریم کا جو حصہ نازل ہوتا وہ بخوبی اسے سمجھتے تھے۔ جب قرآن کے فہم وادراک میں کوئی دشواری پیش آتی تو آنحضور صلی اللہ وسلم سے دریافت کرتے[1] جب آیتِ کریمہ:

وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ[2] — اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا۔

نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی "ایسا کون شخص ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہ کیا ہو؟" آپ نے فرمایا کہ "ظلم سے شرک مراد ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں شرک کو ظلم کہا گیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ[3] — شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

خداوند کریم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کتابِ مقدس نازل فرمائی اور آپ کی ذات کو علم سے بہرہ ور کیا۔ اور فضلِ عظیم سے نوازا تھا۔ اس لیے عہدِ رسالت اور صحابہ کرام کے زمانہ میں علوم القرآن پر کوئی کتاب تصنیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔[4]

---

[1] البرھان۔ ج ۱۔ ص ۱۴۔

[2] سورۃ الانعام آیت ۸۲۔

[3] سورۃ لقمان آیت ۱۳۔

[4] اس ضمن میں عدی بن حاتم کا جو واقعہ ذکر کیا جاتا ہے وہ ایک انفرادی واقعہ ہے۔ اور عام صحابہ پر صادق نہیں آتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "إِنَّ وِسَادَتَكَ لَعَرِيضٌ" (تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے) اس سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ تم ایک غفلت شعار آدمی ہو۔ قاضی عیاض اس فقرہ کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ تم جسیم اور فربہ آدمی ہو۔ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔ إِنَّكَ لَعَرِيضُ الْقَفَا (تم غبی آدمی ہو) دیکھیے صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ۷، ص ۲۰۱ (باقی بر صفحہ ۱۰۰)

اکثر صحابہ اُمّی تھے اور لکھنے پڑھنے کے وسائل سے محروم تھے۔ اس لیے بھی علوم القرآن پر کوئی کتاب تصنیف کرنا ممکن نہ تھا۔ اس پر مزید یہ کہ آپ نے قرآن کے سوا ہر چیز کے لکھنے سے روک دیا تھا۔ آغازِ اسلام میں آپ نے فرمایا تھا:

"مجھ سے سُن کر کوئی بات مت لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا مجھ سے کوئی چیز لکھی ہو وہ اسے مٹا دے۔ البتہ مجھ سے سُن کر حدیثیں بیان کرو۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور جس نے دانستہ مجھ پہ جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے[۱]"

یہ آپ نے اس لیے فرمایا تھا کہ قرآن اور غیر قرآن آپس میں مل جل نہ جائیں۔ عہدِ رسالت اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانہ میں علوم القرآن براہِ راست بالمشافہہ اخذ و روایت کیے جاتے رہے۔ عہدِ عثمان میں عرب و عجم آپس میں گھل مل گئے۔ اس لیے حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو قرآن کے ایک نسخہ پر جمع ہونے کا حکم دیا۔ اس کو مصحفِ امام کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی نقلیں مختلف بلاد و دیار میں بھیجی جائیں اور باقی نسخے تلف کر دیے جائیں۔

ہم قبل ازیں اس کے اسباب کی تفصیل ذکر کر چکے ہیں۔

ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نقولِ قرآن کا حکم دے کر حضرت عثمانؓ نے اس علم کی بنیاد رکھی۔ جس کو بعد ازاں "علم رسم القرآن" یا "علم الرسم العثمانی" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود[۲] الدؤلی متوفی ۶۹ھ کو حکم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹) صحیح مسلم کتاب الصیام میں واقعہ یوں مذکور ہے کہ جب آیت کریمہ "حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ" نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے عرض کی یارسول اللہ! میں اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھتا ہوں ایک سیاہ اور ایک سفید تاکہ مجھے رات دن کا فرق معلوم ہو جائے۔ آپ نے فرمایا تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے (تم غافل یا غبی شخص ہو)، سیاہ دھاگہ سے رات کی سیاہی اور سفید دھاگہ سے دن کی روشنی مراد ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا)

۱؎ مسلم نے یہ حدیث بروایت ابوسعید خدری روایت کی ہے۔ دیکھیے ہماری کتاب علوم الحدیث۔

۲؎ انباہ الرواۃ۔ ج۔ ص ۱۳-۲۳۔ و تہذیب التہذیب، ج ۱۲۔ ص ۱۰-۱۲

دیا تھا کہ نحو کے قواعد مرتب کریں۔ تاکہ عربی زبان کا تحفظ کیا جا سکے۔ نظر بریں حضرت علیؓ نے "علم اعراب القرآن" کی تشکیل و تاسیس کا فریضہ انجام دیا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ علوم القرآن کی بنیاد رکھنے والے صحابہ میں سے مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

۱۔ خلفاءِ اربعہ[۴]۔ ابن عباسؓ۔ ابن مسعودؓ۔ زید بن ثابتؓ۔ اُبی بن کعبؓ۔ ابو موسیٰ اشعریؓ۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم۔

۲۔ تابعین میں سے مندرجہ ذیل حضرات:

مجاہدؒ۔ عطاء بن یسارؒ۔ عکرمہؒ۔ قتادہؒ۔ حسن بصریؒ۔ سعید بن جبیرؒ۔ زید بن اسلمؒ۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۳۔ اتباع تابعین میں سے۔

امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علوم القرآن پر اہم تصانیف:

مذکورہ صدر حضرات علم تفسیر۔ علم اسباب النزول۔ علم المکی والمدنی۔ علم ناسخ و منسوخ اور علم غریب القرآن کے واضع و بانی تھے۔

عصر تدوین میں علم تفسیر کو باقی تمام علوم پر فوقیت حاصل تھی۔ کیونکہ یہ علم علوم قرآن کی اصل و اساس کا حکم رکھتا تھا۔

عصر تدوین میں علم تفسیر میں مندرجہ ذیل حضرات نے تصنیف و تالیف کی خدمت انجام دی:

شعبہ بن حجاج[۲]۔ سفیان بن عیینہ[۳]۔ وکیع بن جراح[۴]۔

---

[۱] الفہرست لابن الندیم ص ۳۲۔

[۲] بصرہ کے عظیم محدث اور امیر المومنین فی الحدیث شعبہ بن حجاج بن ورد العتکی الازدی الواسطی کی کنیت ابو بسطام ہے۔ انہوں نے امام مالک کو دیکھا تھا۔ چار سو تابعین سے حدیثیں سنیں۔ سب آئمہ ان کو حجت مانتے ہیں ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔

[۳] سفیان بن عیینہ ہلالی کوفی تفسیر و حدیث میں اہل حجاز کے ... ۱۹۸ھ میں (باقی برصفحہ ۱۰۲)

تیسری صدی ہجری:

ان کی تفاسیر اقوال صحابہ و تابعین کی جامع تھیں۔

ان کے بعد ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کی تفسیر اجل التفاسیر ہے۔ یہ تفسیر روایات صحیحہ اعراب و استنباط اور قیمتی آراء و افکار کا گنجینہ ہے۔

تفسیر بالماثور کے ساتھ تفسیر بالرائے کا بھی آغاز ہوا۔ بعض مفسرین نے پورے قرآن کی تفسیر تحریر کی۔ بعض نے قرآن کے ایک حصہ کی۔ بعض نے ایک سورت کی۔ اور بعض نے صرف ایک آیت کی۔ بعض علماء نے آیات الاحکام کی تفسیر رقم کی۔ جہاں تک دیگر علوم القرآن کا تعلق ہے۔ تیسری صدی ہجری میں امام بخاری کے استاد علی[1] بن مدینی نے اسباب النزول کے فن پر ایک کتاب لکھی۔

ابو عُبَید قاسم بن سلام نے ناسخ و منسوخ القراءت اور فضائل قرآن پر ایک کتاب تحریر کی[2] اسی طرح محمد بن ایوب الضریس متوفی ۲۹۴ھ نے مکی و مدنی سورتوں کے بارے میں کتاب لکھی ہے۔

محمد بن خلف مرزبان متوفی ۳۰۹ھ نے "الحاوی فی علوم القرآن"[3] کے نام سے ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۱) وفات پائی (تذکرۃ الحفاظ، ج ۱۔ ص ۲۴۲)

[4] وکیع بن جراح بن ملیح بن عدی الرؤاسی الکوفی کی کنیت ابوسفیان ہے۔ یہ قیس عیلان کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وکیع نے ابن جریج اعمش اوزاعی اور سفیان ثوری سے حدیثیں سنیں۔ ان سے عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن آدم احمد بن حنبل اور علی بن مدینی نے روایت کی ۱۲۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین ان کے بارے میں فرماتے ہیں "ہمارے نزدیک عراق میں ثقہ راوی صرف وکیع ہیں" (تاریخ بغداد، ج ۱۳۔ ص ۴۶۶۔ ۴۸۱)۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] علی بن عبداللہ بن جعفر کی کنیت ابوجعفر ہے۔ آپ نے ۲۳۴ھ میں وفات پائی (تذکرۃ الحفاظ، ج ۲۔ ص ۱۵، ۱۶۔ و شذرات الذہب ج ۲۔ ص ۸۱)

[2] ان کی کتاب کا نام "فضائل القرآن" ہے اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ مکتبہ ظاہریہ میں موجود ہے۔

[3] ابن الندیم نے الفہرست میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ ۲۷ مجلدات میں ہے۔

کتاب تحریر کی۔

چوتھی صدی:

چوتھی صدی ہجری میں ابوبکر محمد بن قاسم الانباری متوفی سنہ ۳۲۸ھ نے "عجائب علوم القرآن" تصنیف کی۔ اس کتاب کا موضوع فضائل القرآن اور اس کا سات حروف پر نازل ہونا ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں مصاحف کی کتابت اور آیات وکلمات اور سورتوں کی تعداد بھی ذکر کی ہے[1]

ابوالحسن الاشعری نے "المختزن فی علوم القرآن" تصنیف کی۔ یہ بہت بڑی کتاب ہے[2]۔

ابوبکر سجستانی[3] نے غریب القرآن کے موضوع پر ایک کتاب تحریر کی۔

ابومحمد القصاب محمد بن علی کرخی متوفی سنہ ۳۶۰ھ نے "نکت القرآن[4]" کے نام سے ایک کتاب لکھی

محمد بن علی ادفوی متوفی سنہ ۳۸۸ھ نے "الاستغناء فی علوم[5] القرآن" بیس جلدوں میں تصنیف کی۔

پانچویں صدی:

علی بن ابراہیم بن سعید الحوفی[6] نے "البرہان فی علوم القرآن" اور "اعراب القرآن" دو[7] کتابیں تحریر کیں۔

---

[1] اس کتاب کا ایک نسخہ اسکندریہ کے مکتبۃ البلدیہ میں موجود ہے۔

[2] الدیباج، ص ۱۹۵۔

[3] محمد بن عزیز بن عزیزی سجستانی متوفی سنہ ۳۳۰ھ (بغیۃ الوعاۃ ص ۷۰)، سیوطی الاتقان، ج ۱ ص ۱۹۵ پر لکھتے ہیں کہ سجستانی اور ان کے استاد ابوبکر بن الانباری نے اس کتاب کی تالیف میں پندرہ سال صرف کیے

[4] اس کتاب کا ایک نسخہ مراد ملا میں موجود ہے۔

[5] ہمارے خیال میں کتاب کا صحیح نام یہی ہے۔ اگرچہ اس کو "الاستغناء فی علوم القرآن" بھی پڑھ سکتے ہیں

[6] علی بن ابراہیم بن سعید الحوفی المصری مصنف کتاب "البرہان فی علوم القرآن" وکتاب "اعراب القرآن" سنہ ۴۳۰ھ میں فوت ہوئے (حسن المحاضرہ، ج ۲۔ ص ۲۲۸ وانباہ الرواۃ، ج ۲۔ ص ۲۱۹) البرہان ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

ابوعمرو الدانی متوفی ۴۴۴ھ نے "التیسیر فی القراءات السبع" اور "المحکم فی النقط"[۲] دو کتابیں لکھیں۔

چھٹی صدی:

ابوالقاسم عبدالرحمٰن نے جو سُہیلی[۱] کے نام سے معروف تھے "مبہمات القرآن کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔

ساتویں صدی

ابن عبدالسلام نے مجاز القرآن کے موضوع پر ایک کتاب لکھی[۲]

علم الدین السخاوی نے القراءات پر ایک کتاب تحریر کی[۳]

اس کے بعد قرآن کریم سے متعلق نئے نئے علوم کا ظہور ہوا۔ مثلاً بدائع القرآن[۴]

۱۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد سُہیلی کی کنیت ابوالقاسم ہے ۵۸۱ھ میں مراکش میں فوت ہوئے۔ ان کی کتاب کا نام "مبہمات القرآن" ہے۔ صاحب کشف الظنون نے اس کا ذکر "التعریف والاعلام بما اُبْہِمَ فی القرآن فی الاسماء والاعلام" کے نام سے کیا ہے۔ اس نام سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب کس غرض وغایت کے پیش نظر لکھی گئی تھی۔ قاہرہ کے دارالکتب اور مکتبہ تیموریہ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ سُہیلی نے سیرت ابن ہشام کی شرح الروض الاُنف کے نام سے تحریر کی ہے۔

(انباہ الرواۃ، ج ۲۔ ص ۱۶۲)

۲۔ شیخ الاسلام امام ابومحمد عبدالعزیز بن عبدالسلام جو العز کے نام سے مشہور تھے۔ ۶۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ (طبقات الشافعیہ، ج ۵۔ ص ۸۰۔ ۱۰۷ نیز شذرات الذہب، ج ۵۔ ص ۳۱)۔

۳۔ علی بن محمد بن عبدالصمد سخاوی کے نام سے مشہور تھے ۶۴۳ھ میں فوت ہوئے۔ علم القراءت کے موضوع پر موصوف نے ایک کتاب نظم میں تحریر کی ہے۔ اس کو سخاویہ کہتے ہیں اس کا نام ہے "ہدایۃ المرتاب فی المتشابہ" (امام سخاوی کے تعارف کے لیے دیکھیے وفیات الاعیان، ج ۱۔ ص ۳۴۵ نیز البرہان ج ۱۔ ص ۱۱۲)

۴۔ بدائع القرآن اس فن کا نام ہے جس میں قرآن میں وارد شدہ انواع البدیع سے بحث کی جاتی ہے۔ ابن ابی الاصبع نے اس فن میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور وہ چھپ چکی ہے۔

(الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۴۰۔ ۱۶۰)

حجج القرآن[1]۔ اقسام القرآن[2]۔ امثال القرآن[3]۔

ان علوم کی غرض وغایت یہ تھی کہ جزئیاتِ قرآن کا احاطہ کیا جائے۔ اس لیے "علوم القرآن" کا جدید علم وضع کر کے جملہ علوم وفنون کو اس میں سمو دیا گیا۔

سیرت امام شافعی میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ آپ پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ یمن میں جو علوی بغاوت پر آمادہ تھے آپ ان کی قیادت کر رہے ہیں۔ آپ کو پابزنجیر بغداد میں ہارون الرشید کے دربار میں لایا گیا۔ ہارون نے پوچھا آپ کتاب اللہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ اس لیے کہ کتاب اللہ سے آغاز کرنا سب سے افضل ہے۔ جناب امام نے فرمایا "امیر المومنین! آپ اللہ کی کتابوں میں سے کس کتاب کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں؟ کیونکہ خدا نے بہت سی کتابیں نازل کی ہیں۔" ہارون نے کہا "بہت خوب! میں نے اس کتاب کے بارے میں سوال کیا ہے جو میرے چچازاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی تھی۔" امام شافعی نے فرمایا! قرآن میں بہت سے علوم ہیں۔

آیا آپ محکم ومتشابہ کے بارے میں پوچھتے ہیں یا تقدیم وتاخیر اور ناسخ ومنسوخ سے متعلق یا کسی اور مسئلہ کے بارے میں[4]؟

---

[1] حجج القرآن کے فن کو "علم جدل القرآن" بھی کہتے ہیں۔ اس فن میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن میں جو دلائل وبراہین بیان کیے گئے ہیں وہ عربوں کے طریقہ پر ذکر کیے گئے ہیں متکلمین کی طرز پر نہیں۔ نجم الدین الطوفی سلیمان بن عبد القوی بن عبد الکریم متوفی ۷۱۶ھ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے۔ (الدرر الکامنۃ، ج ۲۔ ص ۱۵۴۔ نیز الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۲۹، ۲۳۳ و البرھان، ج ۲۔ ص ۲۴۔ ۲۷)

[2] الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۲۵۔ ۲۲۸۔ امام ابن قیم نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے۔ متاخرین میں سے عبد الحمید فراہی نے ایک کتاب "امعان فی اقسام القرآن" کے نام سے لکھی ہے۔

[3] امثال القرآن کے نظائر وشواہد کے لیے دیکھیے الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۲۲۔ ۲۲۵۔

[4] یہ بات امام جلال الدین بلقینی نے اپنی کتاب "مواقع العلوم من مواقع النجوم" میں ذکر کی ہے دیکھیے مناہل العرفان للزرقانی ج ۱۔ ص ۲۶

بعض محققین کا خیال ہے[1] کہ "علوم القرآن" کی اصطلاح جامع اور وسیع مفہوم کی حیثیت سے سب سے پہلے کتاب "البرہان فی علوم القرآن" کے ذریعہ معرض ظہور میں آئی۔ یہ کتاب علی بن ابراہیم بن سعید الحوفی متوفی ۴۳۰ھ نے تیس جلدوں میں تصنیف کی تھی۔ ان میں سے پندرہ جلدیں غیر مرتب طور پر قاہرہ کے دارالکتب میں موجود ہیں اور علم تفسیر کے عنوان کے تحت ان کا نمبر ۵۹ ہے۔ دراصل یہ قرآن کی تفسیر ہے مگر اس میں بعض علوم القرآن کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں غریب اعراب اور تفسیر سب کچھ ہے۔"

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اس دور میں ایسی کتب بھی تالیف ہوئیں جن میں براہ راست علوم القرآن کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے قدیم تر کتاب وہ تھی جو ابن المرزبان نے تیسری صدی ہجری میں تصنیف کی۔

چھٹی صدی ہجری میں محدث ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ نے دو کتابیں تصنیف کیں۔ (۱) فنون الافنان فی عجائب القرآن[2] (۲) المجتبیٰ فی علوم تتعلق بالقرآن" ان دونوں کتابوں کے قلمی نسخے قاہرہ کے دارالکتب میں موجود ہیں۔

ساتویں صدی ہجری میں علم الدین سخاوی متوفی ۶۴۳ھ نے اپنی کتاب "جمال القراء وکمال الاقراء"[3] اور ابو شامہ متوفی ۶۶۵ھ نے "المرشد الوجیز فی ما یتعلق بالقرآن العزیز" تحریر کی۔

آٹھویں صدی:

آٹھویں صدی ہجری میں بدر الدین[4] زرکشی متوفی ۷۹۴ھ نے "البرہان فی علوم القرآن" تصنیف کی

۱ھ کتاب مذکور، ج ۱ - ص ۲۶۔

۲ھ مکتبہ تیموریہ میں فنون الافنان کا ایک ناقص نسخہ موجود ہے۔ اس کا نمبر ۲۲۲ ہے۔

۳ھ کشف الظنون سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب "جمال القراء وکمال الاقراء" علوم قراءت و تجوید، وقف وابتداء اور ناسخ ومنسوخ پر مشتمل ہے۔ ۴ھ امام بدر الدین محمد بن عبد اللہ (باقی برصفحہ ۱۷۷)

اس کو پروفیسر محمد ابوالفضل ابراہیم نے شائع کیا اور اس کی تحقیق وتدقیق میں بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیا

نویں صدی:

نویں صدی ہجری میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جلال الدین بلقینیؒ[1] نے اپنی کتاب "مواقع العلوم من مواقع النجوم"[2] تحریر کی۔

محمد بن سلیمان کافیجی متوفی ۸۷۹ھ[3] نے ایک کتاب تصنیف کی امام سیوطی نے اس کا ذکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۶)

زرکشی عظیم مفسر اور اصولی تھے۔ آپ ۷۴۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۹۴ھ میں وفات پائی۔ آپ کے تعارف کے لیے دیکھیے مقدمہ "البرہان فی علوم القرآن" شائع کردہ پروفیسر محمد ابوالفضل ابراہیم۔ یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا)

[1] آپ کا نام ونسب عبدالرحمٰن بن رسلان ابوالفضل جلال الدین بلقینی ہے۔ آپ فقہ واصول عربیت تفسیر اور معانی وبیان کے علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ نے بخاری کا حاشیہ "الافہام لمافی صحیح البخاری من الابہام" کے نام سے تحریر کیا۔ آپ کو متعدد مرتبہ مصر کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ۸۲۴ھ میں وفات پائی۔ (شذرات الذہب ج ۷۔ ص ۱۶۹)

[2] الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۔

[3] ان کا نام ونسب محمد بن سلیمان بن سعد بن مسعود محی الدین ابوعبداللہ کافیجی ہے۔ آپ نحو کی مشہور کتاب کافیہ سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں انہیں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ امام سیوطی ۱۴ سال ان کی صحبت میں رہے۔ آپ نے علم تفسیر فقہ اصول لغت اور نحو پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ امام سیوطی نے الاتقان میں ان کی جس تصنیف کا نام ذکر نہیں کیا "بغیۃ الوعاۃ" میں اس کا نام بتا دیا ہے۔ اس کا نام "التیسیر فی قواعد التفسیر" ہے۔ سیوطی لکھتے ہیں

"میرے استاد محترم کافیجی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس فن کو ایجاد کیا۔ پہلے یہ سعادت کسی کے حصہ میں نہ آئی"۔

استاد محترم کو معلوم نہ تھا کہ قبل ازیں زرکشی "البرہان" اور جلال الدین بلقینی "مواقع العلوم" جیسی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں"۔ کافیجی ۸۷۹ھ میں فوت ہوئے (بغیۃ الوعاۃ ص ۴۸)۔

کیا ہے ۔ سیوطی امام کافیجی سے نقل کرتے ہیں کہ "ایسی کتاب پہلے نہیں لکھی گئی" مگر ہم اس کتاب کے نام ومقام سے آشنا نہیں ہیں ۔ بعد ازاں سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اپنی کتاب "التحبیر فی علوم التفسیر" تصنیف کی اور اس کے بعد "الاتقان فی علوم القرآن" لکھی[1]

آخری دور میں مختلف علماء نے قرآن کی تاریخ اور اس کے علوم کی جانب توجہ مبذول کی چنانچہ شیخ طاہر الجزائری نے "التبیان لبعض المباحث المتعلقہ بالقرآن" تحریر کی ۔ شیخ محمد جمال الدین القاسمی نے "محاسن التاویل" لکھی ۔ شیخ محمد عبد العظیم زرقانی نے "مناھل العرفان فی علوم القرآن" تصنیف کی ۔ شیخ محمد علی سلامہ نے "منہج الفرقان فی علوم القرآن" لکھی ۔ شیخ طنطاوی جوہری نے "الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم" مشہور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے "اعجاز القرآن" پروفیسر سید قطب (شہیدؒ) نے "التصویر الفنی فی القرآن" اور ظلال القرآن جیسی گراں مایہ کتب تصنیف کیں ۔

علاوہ ازیں شیخ مالک بن نبی نے "الظاہرۃ القرآنیۃ" تحریر کی ۔ یہ کتاب وحی سے متعلق قیمتی مباحث کا مجموعہ ہے ۔ سید امام محمد رشید رضا نے بھی قرآن کریم کی تفسیر تصنیف کی ۔ اس میں علوم القرآن کے بارے میں بڑی عمدہ بحثیں ہیں[3] ۔ حال ہی میں ڈاکٹر

---

[1] الاتقان ، ج ۱ ۔ ص ۳ سیوطی کہتے ہیں "یہ بڑی نفیس کتاب ہے ، اور اس کے مضامین میں بڑا ربط وتسلسل پایا جاتا ہے ۔"

[2] الاتقان کئی مرتبہ قاہرہ میں طبع ہو چکی ہے ۔ اس کا بڑا ماخذ زرکشی کی البرھان ہے ۔ سیوطی نے البرھان سے متعدد فصلیں نقل کی ہیں ۔ سیوطی بعض جگہ زرکشی کا نام ذکر کرتے ہیں ، اور بعض دفعہ خاموشی سے کام لیتے ہیں ۔ سیوطی نے البرھان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے دیکھیے مقدمہ الاتقان ، ج ۱ ۔ ص ۶ ، ۸ ۔

[3] دور حاضر میں علوم القرآن سے متعلق بڑی مفید کتابیں معرض ظہور میں آئیں ۔ جن کا مطالعہ دینی ذوق کے نشو وارتقاء کے لیے بے حد مفید ہے ۔ مثلاً استاذ محمد غزالی کی "نظرات فی القرآن" ...... یہ جن کے مطالعہ سے ادبی ذوق نکھرتا ہے اور قرآنی اسلوب کی خوبیاں اُجاگر ہوتی ہیں مثلاً ۔ پروفیسر محمد مبارک پرنسپل شریعت کالج دمشق یونیورسٹی کی "المنہل الخالد"

محمد عبداللہ دراز[1] نے "النباء العظیم۔ نظرات جدیدۃ فی القرآن" مرتب کی۔

---

[1] پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد نے ۵۸-۱۹۵۷ء لاہور میں بین الاقوامی سطح پر ایک مجلس مذاکرہ عالمیہ منعقد کی تھی۔ احقر نے اس میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر عبداللہ دراز مرحوم نے مصری مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ عین بحث وتمحیص کے موقع پر ڈاکٹر صاحب موصوف پر دل کا دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور جنوری ۱۹۵۸ء لاہور ہی میں وفات پائی نعش بذریعہ ہوائی جہاز قاہرہ پہنچائی گئی۔ لاہور میں اتنا بڑا جنازہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس میں شرکت کی سعادت احقر کو بھی حاصل ہوئی۔

(غلام احمد حریری)

فصل دوم

علم اسباب النزول

مسبب حقیقی نے ہر چیز کے لیے ایک سبب بنایا اور ہر چیز کی ایک خاص مقدار مقرر کی ہے نوزائیدہ بچہ عالم وجود میں آنے سے پہلے بہت سے مراحل و ادوار طے کرتا ہے۔ اسی طرح جو واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا ہے اس سے پہلے بہت سے مقدمات پیش آتے ہیں۔ الفس و آفاق میں تغیر پیدا ہونے سے پہلے ایک طویل تمہید کی ضرورت ہے۔ کائناتِ ارضی پر بسنے والی مخلوقات کے سلسلہ میں یہ خدا کی سنت رہی ہے۔ اور خدا کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔

تاریخ عالم اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ ہمیشہ سے خدا کی یہ سنت رہی ہے۔ اور حیاتِ انسانی کا کوئی واقعہ اس سے خارج نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی روشن دماغ اور دقیقہ رس مورخ حوادث کے اسباب کو نظر انداز کر کے صرف نصوص و دستاویزات کے پیش نظر تاریخی حقائق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

مگر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ تنہا صرف تاریخ ہی مقدمات سے نتائج اخذ کرنے اور اسباب کے بطن سے حقائق کو معرض ظہور میں لانے کی محتاج نہیں بلکہ علوم طبیعہ و دراساتِ اجتماعیہ اور فنون ادبیہ بھی اس ضمن میں تاریخ کے سہیم و شریک ہیں کہ وہ اسباب و مسببات کی پہچان حاصل کریں۔ اور مبادی و غایات تک رسائی حاصل کریں۔

ہم معرفت اسباب کے اقسام میں موازنہ نہیں کرنا چاہتے تاکہ ہم دیکھیں کہ ان میں سے ہر قسم کس حد تک چیزوں کے اسباب معلوم کرنے کی ضرورت مند ہے۔ ہمارا مقصد صرف

اس امر سے آگاہ کرتا ہے کہ اس وقت جو دینی مباحث ہمارے پیش نظر ہیں ان اقسام سے کون سی قسم ان مباحث کے ساتھ قریبی تعلق رکھتی ہے اور ہر طرح ان سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہے ظاہر ہے کہ یہ ادب کا فن ہی ہو سکتا ہے۔ جب کسی حسین و جمیل نص کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے یا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو فن ادب ہی اس کے لیے معیار و مدار کی حیثیت رکھتا ہے کسی نص کا صحیح فہم و ادراک یا اس کا ذوق سلیم ادب کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب ادیب انفرادی و اجتماعی پردوں کو ہٹا کر اس میں غور و فکر سے کام لے اور پھر بہترین الفاظ و معانی کا انتخاب کرے۔

ایک ادیب کے لیے عربی زبان کی لغوی دولت و ثروت اور کثیر شواہد سرمایہ افتخار ہیں ادیب ہمیشہ اس امر پر فخر محسوس کرتا ہے کہ اس نے ادب میں مہارت حاصل کی اور بلغاء کے اسالیب کلام سے آشنائی پیدا کی۔ تاہم اس کی یہ حالت ہے کہ جب بہترین اشعار کے ایک قصیدہ کے بارے میں اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ یہ کیوں کہا گیا؟ اور کن ظروف و احوال کے پیش نظر اس کی ضرورت پیش آئی؟ تو وہ شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ٹھوکر کھاتا ہے چنانچہ ہجویہ قصیدہ کو مدح قرار دیتا ہے۔ اور عتاب پر مشتمل اشعار کو غزل کہہ دیتا ہے۔ یا صلح کی دعوت پر مبنی تصور کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں جنگ و قتال کی تحریض و ترغیب دلائی گئی ہوتی ہے یا اس کے برعکس ترانہ جنگ سمجھنے لگتا ہے۔ جب کہ وہ اشعار صلح و

امن کے پیام بر ہوتے ہیں۔

چنانچہ عربی ادب کا ذوق آشنا جب سعد بن مالک کے یہ اشعار پڑھتا ہے تو وہ ان کی سہولت و روانی سے متاثر ہوتا ہے ؎

يَا بُؤسَ لِلْحَرْبِ الَّتِي ... وَضَعَتْ أَرَاهِطَ فَاسْتَرَاحُوا

وَالْحَرْبُ لَا يَبْقَى لِجَاحِمِهَا ... التَّخَيُّلُ وَالْمِرَاحُ

إِلَّا الْفَتَى الصَّبَّارُ فِي النَّجَدَا ... تِ وَالْفَرَسُ الْوَقَاحُ [1]

[1] حماسہ ابی تمام بشرح المرزوقی ج ۲ ص ۵۰۰ طبع ۱۹۶۱

ترجمہ :

۱۔ اے لوگو اس لڑائی کی شدت کو دیکھو جس نے میری قوم کی چند جماعتوں کو بہادروں کے بلند مقام سے گرا دیا۔ چنانچہ وہ (شمشیر زنی اور نیزہ بازی سے) آرام پا گئے۔

۲۔ جنگ ایسی چیز ہے کہ اس کی شدت کے وقت تکبر اور نشاط باقی نہیں رہتی۔

۳۔ مگر مصیبتوں میں صبر کرنے والا نوجوان اور مضبوط سم کا گھوڑا (باقی رہتا ہے)

یہ اشعار ایسے ہیں کہ ڈکشنری سے مدد لیے بغیر ان کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ ادیب کی اولین نگاہ جب "اراہط" کے لفظ پر پڑتی ہے تو وہ فوراً اشعار کی شرح و تحلیل کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ لفظ فاعلیت کی بناء پر مرفوع اور مفعولیت کی وجہ سے منصوب بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں دونوں احتمال موجود ہیں۔ چنانچہ وہ اس تردد میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اراہط کو فاعل قرار دیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ قوموں اور جماعتوں نے لڑائی سے کنارہ کشی کر کے امن و عافیت کی زندگی اختیار کر لی۔ جب کہ مفعول ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ لڑائی نے ان کو ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور وہ دشمن کے سامنے جھکنے اور راحت و سکون کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا ان اشعار کے مطلع میں لڑائی کی ترغیب دلائی گئی اور اس میں شرکت نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کی گئی ہے؟ یا بخلاف ازیں جنگ و قتال کی مذمت بیان کی گئی ہے؟ اس لیے کہ لڑائی بڑوں کو عاجز کرتی ہے اور گردن کو جھکا دیتی ہے۔ بناء بریں امن و سلامتی بہر حال اس سے بہتر ہے۔

ایک ادیب جب اُن ظروف و احوال کا بخوبی جائزہ لیتا ہے جن میں شاعر نے یہ اشعار کہے تھے تو روایات و اخبار سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ سعد بن مالک نے یہ اشعار حارث بن عبادہ کی مذمت میں کہے تھے اس لیے کہ حارث مذکور بزدلی اور جنگ سے

کنارہ کشی میں مشہور تھا[1]۔ شاعر ان اشعار میں حرب و پیکار کی دعوت دیتا اور قوم کو ذلت و رسوائی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔

مذکورہ صدر بیانات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ جب کسی قصیدہ کے متعلقہ حالات و واقعات معلوم کرنے سے اس کا فہم و ادراک آسان ہو جاتا ہے۔ ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا اور اس کی شرح و توضیح آسان ہو جاتی ہے۔ تو اسی طرح اگر آیت کا واقعہ متعلقہ معلوم ہو اور ان اسباب تک رسائی ہو جو اس کے نزول کا باعث ہوئے تو اس سے یقیناً اس کا مطلب سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کی تاویل راجح اور صحیح ترین تفسیر کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ اگر ہم قرآن کے مطالب کو صحیح طور پر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم علم تفسیر کے علاوہ اسباب النزول معلوم کرنے کی جانب بھی توجہ دیں۔ اس لیے کہ مفسرین کے اقوال نہ تمام مشکلات کی گرہ کشائی کرتے ہیں نہ تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کرتے ہیں اور نہ ہر اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ قرآن کی زبان اور اس کے قواعد و آداب کے علاوہ ہمیں اس کی کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن کا انداز تعبیر و بیان اس کے مفردات کی سحر طرازی اور اس کے قصص و حکایات کی رنگا رنگی بڑی حد تک ہمیں ان زندہ واقعات منہ بولتے حوادث اور پائندہ غزوات و مشاہد کے ساتھ جوڑ دیتی ہے اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ ان واقعات کے ہیرو دنیا کے تھیٹر پر ابھی زندۂ جاوید ہیں۔ مگر لغت کی جامد تشریحات اور بے جان بلاغی اصطلاحات میں یہ خوبی نہیں پائی جاتی۔ ان سے نہ واقعات کی صحت کا پتہ چلتا ہے۔ نہ حوادث و وقائع کے اسرار سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ نہ کانوں میں ان واقعات کی شیریں صدا

---

[1] العقد الفرید طبع حیدر آباد ج ۵ ص ۲۲۰۔

گو بحتی ہے۔

سبب نزول کی ضرورت :

اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کے تاریخی حقائق جان لینے ہی سے ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا لہٰذا اگر ہم اسبابِ نزول سے آگاہ ہو بھی جائیں تو اس کا۔ مطلب یہ نہیں کہ ہم نے اپنے مقصود کو پالیا اور اب کچھ حاصل کرنا باقی نہیں ہے۔ تاریخ اور مورخین کی دروغ بافی آخر کس سے مخفی ہے؟ ابھی تاریخ میں کتنے ہی خلاء ہیں جن کو پُر کرنے کی ضرورت ہے۔ اور کس قدر شگاف ہیں جن کو بند کرنا ناگزیر ہے۔ جہاں تک اسباب نزول کی دینی حیثیت کا تعلق ہے ہمیں ظاہری واقع سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ اس کی ماہیت و حقیقت مطلوب ہے۔ ہمیں انسان کی ضرورت ہے اس کے ڈھانچہ اور کالبد کی نہیں۔ ہمیں حق چاہیے اس کی صدائے بازگشت مطلوب نہیں۔ اگر علمائے محققین نے فرمایا ہے کہ جو شخص اسبابِ نزول سے نابلد ہے۔ قرآن کی تفسیر بیان کرنا اس پر حرام ہے [۱] تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

امام واحدی [۲] نے سچ فرمایا کہ:

"جب تک کسی آیت کا واقعہ متعلقہ اور اس کا سبب نزول معلوم نہ ہو اس آیت کی تفسیر معلوم نہیں ہو سکتی [۳]"

---

[۱] اسباب النزول للسیوطی۔ ص ۲۔

[۲] امام واحدی کا نام علی بن احمد اور کنیت ابو الحسین ہے۔ مشہور نحوی اور مفسر تھے ۴۶۸ھ میں وفات پائی۔ (انباہ الرواۃ۔ ج ۱۔ ص ۱۹)

[۳] اسباب النزول للواحدی، ص ۳۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں،

"سبب نزول کی پہچان کسی آیت کے فہم و ادراک میں مدد دیتی ہے۔ اس لیے کہ سبب کے علم سے مسبب کا معلوم ہونا ایک فطری بات ہے۔"

ابن دقیق العید کا قول ہے:

"سبب نزول کی پہچان قرآن کے مطالب و معانی کے حصول کا زبردست ذریعہ ہے۔" (الاتقان، ج ۱۔ ص ۲۹) ابو الفتح قشیری کا قول بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ فرماتے ہیں: (باقی بر صفحہ ۱۸۵)

سبب نزول کو قصہ اور واقعہ کے لفظ سے تعبیر کرنا بڑے پاکیزہ ذوق کی غمازی کرتا ہے۔ فنی غرض و غایت کے علاوہ یہ دینی مصلحت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ آخر سبب نزول اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کسی واقعہ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کیونکر پیش آیا؟ اصل واقعہ کیا تھا؟ اور کون لوگ اس کے ذمہ دار تھے؟ سبب نزول کے معلوم ہونے سے کسی آیت میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہر جگہ اور ہر وقت پورے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ قارئین میں اس کی تلاوت سے بیزاری اور اکتاہٹ کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اسلاف کے واقعات دلی مسرت کے موجب ہوتے ہیں اور تلاوت کرتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری کے اپنے حالات و واقعات ہیں۔

اسبابِ نزول سے ناآشنا ہونے کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا کہ لوگ التباس و ابہام کا شکار ہو گئے اور آیات کا مطلب غلط سمجھنے لگے۔ اس قسم کا واقعہ مروان بن حکم کو بھی پیش آیا تھا اس نے سمجھا کہ آیت قرآنی:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا [1]

مسلمانوں کے لیے وعید ہے۔ اس نے اپنے دربان سے کہا کہ اے رافع! جا کر ابن عباس سے کہو کہ:

"اگر ہر اس آدمی کو جو اپنے اعمال سے خوش ہوتا ہے اور ناکردہ کاموں پر دوسروں سے خراج تحسین وصول کرنا چاہتا ہے۔ عذاب میں گرفتار کیا جائے گا تو ہم میں سے کوئی بھی عذاب سے بچ نہیں سکتا۔"

حضرت ابن عباسؓ نے جواباً فرمایا:

"تمہیں اس آیت سے کیا سروکار؟ واقعہ یوں تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو بلا کر ایک بات پوچھی۔ انہوں نے اصل بات چھپا کر غلط جواب دیا گویا انہوں نے

[1] سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۸۸۔

ایک جھوٹ بات بتلا کر اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے داد چاہی اور اصل بات کے چھپانے پر خوشی کا اظہار کیا"[1]

پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت کی:

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ۔ — جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے واضح کرو گے۔

مذکورہ بالا واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے مفہوم میں جو اشکال تھا وہ سبب نزول کے بیان کرنے سے دور ہوا۔

اگر سبب نزول بیان کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو لوگ آج تک نشہ آور اشیاء اور شراب کو حلال طیب سمجھنے میں حق بجانب ہوتے اور اس آیت سے استدلال کرتے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا[2] — جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں۔ انہوں نے جو بھی کھایا ان پر کوئی گناہ نہیں ہے

حضرت عثمان بن مظعونؓ اور عمرو بن معدیکرب سے منقول ہے کہ وہ اس آیت کے پیش نظر شراب کو مباح قرار دیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اس آیت کے سببِ نزول سے آگاہ نہ تھے حسن بصری اور دیگر راویوں کا بیان ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا "ہمارے ان بھائیوں کا کیا بنے گا۔ جو شراب کی حرمت سے پہلے فوت ہو چکے ہیں؟ حالانکہ خدا نے ہمیں بتایا ہے کہ شراب نجس ہے۔ تب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی[3]

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر ج ۲ - ص ۴۰ - وتفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۳۶ نیز الاتقان ج ۱ - ص ۴۴ - والبرہان، ج ۱ - ص ۲۰ -

[2] سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۹۳ -

[3] البرہان، ج ۱ - ص ۲۰ نیز اسباب النزول للواحدی ص ۱۰۰، وتفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۷۰ و الاتقان، ج ۱ - ص ۵۳ -

اگر سبب نزول کی ضرورت نہ ہوتی تو لوگ آیت قرآنی "وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ" کے پیش نظر جس جہت و جانب کی طرف چاہتے منہ کر کے نماز پڑھتے۔ مگر سبب نزول سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ یہ آیت ان صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے ایک تاریک رات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نماز پڑھی تھی۔ قبلہ معلوم نہ ہو سکا اس لیے ہر شخص نے اپنے اجتہاد پر عمل کر کے جدھر چاہا رُخ کر کے نماز پڑھ لی[۲] اللہ تعالیٰ نے صحابہ کا یہ عمل ضائع نہ کیا اور ان کی نماز قبول کر لی۔ اس لیے کہ تاریک رات میں قبلہ کی پہچان دشوار تھی۔

چونکہ ہم خاص طور پر اسباب نزول سے بحث کر رہے ہیں اس لیے سر دست ہم ان آیات کو زیر بحث نہیں لائیں گے جو کسی سوال یا حادثہ کے بغیر نازل ہوئیں۔ ایسی آیات اکثر و بیشتر مندرجہ ذیل مضامین سے تعلق رکھتی ہیں۔

۱۔ وہ آیات جن میں انبیاء سابقین اور اُمم سابقہ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ زمانہ ماضی کے واقعات پر مشتمل ہیں۔

۳۔ جن آیات میں مستقبل میں پیش آنے والے غیبی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ قیام قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے۔

۵۔ عذاب و ثواب کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ایسی آیات اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے نازل کرنے کی غرض یہ ہے کہ مخلوق خدا کو سیدھی راہ دکھائی جائے۔ یہ آیات قرآنی سیاق و سباق کے ساتھ مربوط و متصل ہیں۔ مگر کسی سوال کے جواب میں نازل نہیں ہوئیں۔ اور ان میں کسی چیز کا حکم بھی مذکور نہیں ہے۔

[۱] سورۃ البقرۃ، آیت ۱۱۵۔ پوری آیت یوں ہے۔ وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰہِ، اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔

[۲] اسباب النزول للواحدی، ص ۲۵۔

امام سیوطی رقم طراز ہیں :

"سبب نزول اس واقعہ کو کہتے ہیں جس کے ظہور و وقوع کے ایام میں کوئی آیت نازل ہوئی ہو۔ نظریریں واحدی کا یہ قول درست نہیں کہ سورۃ الفیل کا سبب نزول اہل حبشہ کا مکہ میں ورود ہے۔ اس لیے کہ اہل حبشہ کے مکہ وارد ہونے کا سورت کے نزول سے کوئی تعلق نہیں۔ بخلاف ازیں اس سورت میں زمانہ ماضی کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح حضرت نوح عاد و ثمود اور تعمیر کعبہ کے واقعات ذکر کیے گئے ہیں۔ اسی طرح آیت "وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا" کا بھی سبب نزول سے کوئی تعلق نہیں[1]۔"

مندرجہ صدر بیان سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہمارا موجودہ بیان صرف اس آیت یا آیات تک محدود ہے جو کسی خاص واقعہ کے سبب نازل ہوئی ہوں۔ یا اس میں کسی سوال کا جواب دیا گیا ہو۔ یا اس کا حکم بیان کیا گیا ہو۔ ایسے سوال یا واقعہ کو سبب نزول کہتے ہیں۔

سبب نزول کی جو اصطلاح ہم نے سطور بالا میں ذکر کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ قرآنی آیات دو قسموں میں منقسم ہیں۔

۱۔ وہ آیات جو اسباب نزول سے متعلق ہیں۔

۲۔ وہ آیات جن کا اسباب نزول سے کچھ علاقہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی ابن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو یہ بات منقول ہے کہ جو آیت بھی نازل ہوئی ہمیں اس کے بارے میں معلوم ہے کہ کس لیے کس کے بارے میں اور کہاں نازل ہوئی[2]؟ اس کا لفظی و ظاہری مطلب مراد نہیں۔ اگرچہ بعض صحابہ نے حلفاً"

---

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۵۲۔

[2] الاتقان، ج ۱، ص ۲۲۲۔

ایسے الفاظ کہے ہیں [1]

صحابہ کا مطلب ایسے الفاظ سے یا تو کلام میں مبالغہ اور تاکید پیدا کرنا تھا۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ کتاب خدا زندگی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس لیے انہیں ہر وہ چیز معلوم ہے جس کا قرآن سے کچھ بھی تعلق ہے۔ یا ان کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے عہد رسالت میں جو کچھ بھی سیکھا اور حاصل کیا ہے لوگ ان سے سیکھ لیں۔ تاکہ ان کی وفات کے ساتھ ہی علم کا خاتمہ بھی نہ ہو جائے۔ اگرچہ عقلی طور پر ممکن تھا کہ انہیں ذاتی طور پر کسی آیت کا سببِ نزول معلوم نہ ہو۔ بلکہ انہوں نے کسی اور صحابی سے سن کر معلوم کیا ہو۔ مگر بالواسطہ حاصل کردہ علم کو بلا واسطہ اور ذاتی علم پر محمول کیا۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ صحابہ سے روایت کرنے والوں نے اس بات کو ان کی طرف منسوب کرنے میں اپنی جانب سے کچھ اضافہ کر دیا ہو۔ ورنہ ایسے فخریہ کلمات کا صدور صحابہ سے کسی طرح قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ وہ عجز و انکسار کا زندہ پیکر تھے اور اس قسم کی ڈینگیں مارنے کے عادی نہ تھے۔ روایات میں منقول ہے کہ تواضع و کسر نفسی کی بناء پر صحابہ فتویٰ دینے سے کترایا کرتے تھے۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ صحابہ قرآن کے ساتھ حد درجہ کی وابستگی و دلبستگی رکھتے تھے۔ وہ قرآن کو سینوں و سفینوں اور صدور و سطور میں محفوظ کرتے رہتے تھے۔ خدا کی کتاب ان کے افکار اور جذبات و احساسات پر چھائی ہوئی تھی۔ رسول کریم پر ہر لحظہ وحی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہر لمحہ کم از کم ایک یا دو آیتیں نازل ہوتیں اور ایک دو واقعات بھی رونما

---

[1] درحقیقت یہ عبارت صحابہ سے منقول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے "خدا کی قسم جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس ضمن میں نازل ہوئی" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی حلف اٹھا کر ایسے الفاظ کہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے الفاظ ہیں "کس شخص کے بارے میں نازل ہوئی" ان دونوں اقوال کے ملانے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ بعض آیات اشخاص کے بارے میں اتریں اور بعض اشیاء کے ضمن میں۔

ہو جاتے۔ اس لیے صحابہ ہر آیت کا سبب نزول کیوں کر معلوم کر سکتے تھے؛ اور ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا؟ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہر صحابی کسی آیت کے نزول کے وقت اور اس جگہ موجود ہو جہاں کوئی آیت نازل ہوئی۔ اگرچہ بعض صحابہ ہر آیت کو سن کر لکھ لیا کرتے یا حفظ کر لیا کرتے تھے۔ مگر یہ کسی طرح ممکن تھا کہ وہ اس کے سبب نزول کو بھی لکھ لیں یا یاد کر لیں[1]

ذوقِ سلیم اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ صحابہ براہ راست جو بات سنتے تھے اس کو علیٰ وجہ البصیرت دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ مگر ہمارے نزدیک کچھ بعید نہیں کہ بعض اسباب سے ناآشنا ہوں جس طرح علماءِ قرآن بھی بہت سے اسباب نزول سے نابلد ہو سکتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جائے گا۔ لوگ اصلی سرچشمہ سے دور ہونے کی وجہ سے ان اسباب سے بے بہرہ ہوتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ سلف اسبابِ نزول سے متعلق روایات میں تشدد سے کام لیا کرتے تھے۔ اس تشدد کا دائرہ راویانِ حدیث اور اسانید و متون تک وسیع ہوتا تھا۔ راویانِ حدیث جب اسباب نزول کے بارے میں پوچھتے تو ان کا ورع و تقویٰ حد سے بڑھا ہوا ہوتا تھا۔

محمد بن سیرینؒ[2] فرماتے ہیں میں نے عَبِیدہ سے ایک آیت کے بارے میں دریافت کیا اس نے کہا:

"خدا سے ڈر اور سیدھی بات کہہ۔ اسباب نزول کے جاننے والے اس دنیا سے چل دیئے[3]"

مگر یہ ورع و تقویٰ انہیں اس قسم کے موضوعات کے بارے میں صحابہ کے اقوال کو تسلیم

---

[1] دیکھیے ہماری کتاب علوم الحدیث۔

[2] محمد بن سیرین بصری کی کنیت ابوبکر ہے۔ آپ حدیث اور خوابوں کی تعبیر کے علم میں بہت مشہور تھے۔ اپنے عصر و عہد میں آپ دینی علوم میں بصرہ کے امام تھے سنہ ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۴

[3] الاتقان، ج ۱، ص ۵۲۔

کرنے سے باز نہیں رکھتا تھا۔ اس ضمن میں وہ جو دلیل پیش کرتے تھے اس میں جدل و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ:

"جن مسائل میں رائے و اجتہاد کی گنجائش نہ ہو بلکہ نقل و سماع پر موقوف ہوں ان کے بارے میں صحابہ کے اقوال کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جا سکتی[1]۔"

امام حاکم اور ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ جب کوئی ایسا صحابی جو وحی و تنزیل کے مشاہدۂ ناظر بچشم خود دیکھ چکا ہو کسی آیت کے بارے میں کہے کہ وہ فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تو وہ مسند حدیث ہوگی اور اس کو حدیثِ مرفوع قرار دیا جائے گا[2]۔

تابعین کے اقوال صرف اس صورت میں روایاتِ صحیحہ کے جا بجا ہوتے ہیں جب کسی اور مرسل روایت سے ان کی تائید ہو رہی ہو۔ اور اس روایت کو ایسے آئمہ تفسیر نے نقل کیا ہو جو صحابہ سے اخذ و روایت میں مشہور ہیں۔ مثلاً عکرمہ مجاہد سعید بن جبیر عطاء حسن بصری سعید بن المسیب اور ضحاک[3]۔

نزولِ قرآن کے وقت جو صحابہ موجود تھے اور وہ تابعین جو صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔

---

[1] منہج العرفان از محمد علی سلامتہ ص ۲۹ (الاتقان، ج ۱۔ ص ۵۲)

[2] سببِ نزول کا علم صحابہ کو قرائن سے حاصل ہوتا ہے وہ قرائن قضایا و احکام کے جامع ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ صحابہ جزم و وثوق کے بغیر یوں کہتے ہیں "میرا خیال ہے کہ فلاں آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی" مثلاً اصحابِ صحاح ستہ نے عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت کیا ہے کہ پانی کی ایک نالی کے بارے میں ایک انصاری اور حضرت زبیرؓ کے درمیان تنازع بپا ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "زبیر! اپنے کھیت کو سیراب کر کے پانی اپنے پڑوسی کی طرف موڑ دو" انصاری نے کہا "یہ فیصلہ آپ نے اس لیے صادر کیا کہ زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں" یہ سن کر آپ کا چہرہ لال پیلا ہو گیا۔ زبیر کہتے ہیں۔ "میرا خیال ہے کہ آیت "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ" اسی واقعہ میں نازل ہوئی۔ (الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۵۲ نیز الاتقان، ج ۱۔ ص ۲۲۹)۔

[3] الاتقان، ج ۱۔ ص ۵۳۔

ان کی روایات کی مقبولیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحتِ روایت کی شرط اس لیے عائد کی گئی ہے تاکہ اس بات کا یقین آجائے کہ راوی فی الواقع اس وقت موجود تھا اور اس نے وہ حادثہ بچشم خود دیکھا تھا۔ یا وہ اس سوال سے بخوبی آگاہ و آشنا ہے جو کسی آیت کے نزول کا سبب قرار پایا۔

اسباب نزول کے ضمن میں روایات صحیحہ کی اہمیت:

اسباب نزول سے متعلق واقعات کی جانچ پڑتال ہی کے جذبہ نے علماء کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ روایات صحیحہ میں بیان کردہ اسباب نزول کی پہچان کے وسائل اختیار کریں۔ اور اس ضمن میں اپنی رائے اور اجتہاد کی اساس پر کچھ کہنے سے احتراز کریں۔ امام واحدی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسباب نزول کے بارے میں روایت و سماع کے بغیر کوئی بات کہنا روا نہیں ہے۔ اس ضمن میں روایت و سماع ان لوگوں سے معتبر ہوگا جن کے سامنے قرآن نازل ہوا۔ جو اسباب نزول سے کلیتہً آگاہ تھے اور اس علم کے سچے طلب گار تھے۔"[1]

امام واحدی فرماتے ہیں کہ علمائے سلف اسباب نزول بیان کرنے سے امکانی حد تک احتراز کرتے تھے۔ مبادا وہ بلا دلیل و برھان قرآن سے متعلق کوئی جھوٹی بات کہہ دیں۔ پھر ہم علماء کی سہل انگاری اور تغافل شعاری پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ بے محابا اسباب نزول کے بارے میں گفتگو کرتے جاتے ہیں۔ گویا انہیں اس وعید کی کچھ پرواہ نہیں جو قرآن پہ جھوٹ باندھنے والے کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ وہ بڑے دردناک اور الم انگیز لہجہ میں فرماتے ہیں:

"آج تو یہ حال ہے کہ ہر کس و ناکس کچھ نہ کچھ گھڑتا اور جھوٹ باندھتا رہتا ہے۔ وہ لوگوں کو جہالت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ اسباب نزول سے ناواقف کے بارے میں کس قدر وعیدِ شدید وارد ہوئی ہے۔"[2]

---

[1] اسباب النزول للواحدی ص ۳-۴۔

[2] کتاب مذکور ص ۴۔ واحدی پانچویں صدی ہجری کی بات کرتے ہیں (باقی برصفحہ آئندہ)

ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ ہم اسباب نزول سے متعلق روایاتِ صحیحہ کی طلب و تلاش میں کس قدر بھی محنت و کاوش سے کام لیں ہم ایسی آیات کو جمع کرنے سے قاصر رہیں گے۔ جن کا نزول کسی سوال یا سبب کی بناء پر ہوا۔ اس لیے ہم اپنے معاصر علماء کو دعوت دیتے ہیں کہ اسباب نزول کے بارے میں کثرت سے کتب تصنیف کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ تصانیف وسیع و دقیق معلومات پر مشتمل ہوں اور ان میں وارد شدہ متون و اسانید کی خوب چھان بین کی جائے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے ہم اختراع فی الدین اور کذب و افتراء کا ارتکاب کرنے والوں کے زمرہ سے خارج رہ سکیں گے اور ہمارا شمار ان میں نہیں ہوگا۔

متقدمین کی تصانیف پر نقد و جرح:

اسباب نزول کے بارے میں تصنیف کردہ علماء سلف کی کتب پر شدید جرح و قدح کی گئی ہے۔ حالاں کہ ان کی تصانیف علمی، امانت و دیانت اور ورع و تقویٰ کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آج ہم جو کچھ اسباب نزول کے بارے میں کہہ رہے ہیں اس پر کیا کچھ لے دے نہ ہوگی۔ بظاہر اس پر کڑی تنقید کی امید کی جاتی ہے۔

اس فن پر مستقل تصانیف لکھنے والے علماء کا تذکرہ کرنے کے بعد سیوطی نے اس پر جو حاشیہ آرائی کی ہے۔ اس سے جرح و نقد کا سرسری سا اندازہ ہوتا ہے[1] فرماتے ہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پھر دورِ حاضر کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ہمارے اسلاف تو سبب نزول بیان کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مگر آج کل وہ لوگ بھی مفسرین کے زمرہ میں شامل ہونے کے دعویٰ دار ہیں جو سرے سے ایسی[؟] بات ہی کے منکر ہیں۔ ان کی جسارت کا یہ عالم ہے کہ عربی زبان سے نابلد ہونے کے باوصف دھڑا دھڑ قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ مگر لغات القرآن لکھوانے کے لیے عربی دان علماء کا سہارا لیتے ہیں۔ ان علماء کا حال قابل رحم ہے۔ جو چند ٹکوں کی خاطر ان سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ اور تعاون فی الاثم والعدوان کا مرتکب ہوتے ہوئے انہیں کبھی اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا خیال نہیں آیا۔ ایسی من گھڑت تفاسیر لکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم کی طرف لوٹنے کی توفیق بخشے (غلام احمد حریری مترجم)۔ (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سیوطی کی رائے میں اس ضمن میں سب سے پہلے امام بخاری کے استاد ابن المدینی نے کتاب تصنیف کی (الاتقان، ج ۱۔ ص ۲۸)

واحدی کی کتاب مغلق و پیچیدہ ہے اور اس میں ابہام و اجمال پایا جاتا ہے[۱] جعبری[۲] نے واحدی کی کتاب کا جو اختصار پیش کیا ہے اس میں یہ نقص ہے کہ اسانید کو حذف کر دیا گیا ہے۔ مگر اضافہ کچھ نہیں کیا گیا۔ سیوطی فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام[۳] ابن حجر نے اسباب النزول پر ایک کتاب لکھی تھی۔ مگر مسودہ کو مبیضہ کی صورت میں تبدیل کرنے سے قبل وفات پا گئے یہی وجہ ہے کہ سیوطی اس سے پوری طرح مستفید نہ ہو سکے۔ مگر سیوطی کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی حد تک ابن حجر کی کتاب سے کسب فیض کیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے پوری کتاب ملاحظہ کی ہو۔ حیرت ہے کہ مدح و ثنا کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ ان کے رویہ سے اس کتاب کی مذمت کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ سیوطی جملہ متقدمین اور ابن حجر کی کتاب کو ترازو کے ایک پلڑا میں اور اپنی کتاب کو دوسرے پلڑا میں رکھتے ہیں سیوطی رقم طراز ہیں:

۱؎ الاتقان، ج ۱- ص ۴۸-

۲؎ ابراہیم بن عمر بن ابراہیم جعبری کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا لقب برہان الدین ہے۔ انہوں نے بہت عمدہ کتب تصانیف کی ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے "روضۃ الطرائف فی رسم المصاحف" اور "عقود الجمان" در شاطبیہ کی شرح "کنز المعانی" خاص طور سے مشہور ہیں۔ آپ نے ۷۳۲ھ میں وفات پائی (الدرر الکامنۃ ج ۱- ص ۵۰)

۳؎ امام مورخ اور حافظ شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی کا نام احمد بن علی کنیت ابو الفضل لقب شہاب الدین اور نسبت عسقلانی ہے۔ آپ فلسطین کے شہر عسقلان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے حفظ احادیث کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دیں۔ آپ کی تصانیف آپ کی زندگی ہی میں ہر طرف پھیل گئیں سلاطین وقت یہ کتب ایک دوسرے کو تحفہ کے طور پر دیا کرتے تھے۔ مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

لسان المیزان[۱]۔ تہذیب التہذیب[۲]۔ الاصابۃ[۳] فی تمییز اسماء الصحابۃ۔ الدرر[۴] الکامنۃ فی اعیان المئۃ الثامنۃ۔ تعجیل[۵] المنفعۃ بزوائد رجال الائمۃ الاربعۃ۔ بلوغ المرام[۶]۔ طبقات[۷] المدلسین۔ الاحکام[۸] لبیان ما فی القرآن من الاحکام۔ نزہۃ الالباب[۹] فی الالقاب۔ تحفۃ اہل الحدیث[۱۰] عن شیوخ الحدیث۔ المجمع المؤسس[۱۱] بالمعجم المفہرس۔ آپ نے ۸۵۲ھ میں وفات پائی (الاعلام ج ۱ ص ۱۷۳)۔

"ہماری تصنیف کا نام "لباب النقول[1] فی اسباب النزول" ہے۔ ہماری کتاب اختصار اور جامعیت کا شاہکار ہے اور آج تک اس فن میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔"

مگر سیوطی نے اپنی کتاب پر جس قدر اظہار فخر کیا ہے ہماری نگاہ میں اس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اس لیے کہ متاخرین کی تصانیف میں کبر و فخر کا یہ ناپسندیدہ ترانہ اکثر سننے میں آتا ہے خصوصی طور سے یہ بے وقت کی راگنی امام سیوطی کی تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے۔ خداوند کریم انہیں معاف فرمائے۔ البتہ ان فخریہ ترانوں سے اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ اس فن کی قدیم کتب میں اغلاق و اجمال ضرور پایا جاتا ہے۔ اگر ان کتب میں یہ خامی نہ ہوتی تو سیوطی اس تنقید کی جسارت نہ کرتے۔

کتب قدیمہ میں اغلاط کی بھرمار:

افسوس تو اس بات کا ہے کہ اگر کتب قدیمہ میں صرف ابہام و اجمال کا نقص ہوتا تب بھی گوارا تھا۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ یہ کتب تاریخی اغلاط منطقی مغالطات اور عجیب و غریب مبالغات و نوادرات کا پلندہ ہیں۔

واحدی کی تاریخی غلطی:

مثال کے طور پر یہ واقعہ ملاحظہ ہو کہ امام واحدی آیت قرآنی:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ[2]

پڑھتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرتے کہ یہ آیت عبادت گاہوں اور اسلامی شعائر کی توہین کرنے والوں کی وعید کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے۔ بلکہ ایک ایسی فاش غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں کہ اگر وہ ان کی اپنی غلطی ہوتی تو بھی ہم اسے چنداں اہمیت نہ دیتے۔ مگر

[1] الاتقان ج ۱۔ ص ۴۹ لباب النقول ۱۲۸۰ھ میں بولاق میں جلالین کے حاشیہ پر چھپ چکی ہے۔

[2] سورۃ البقرہ آیت ۱۱۴۔

وہ اس تاریخی غلطی کو قرآن کے سر تھوپتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ واحدی قتادہ کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کہ یہ آیت بخت نصر بابلی اور اس کے رفقاء کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ بخت نصر نے یہود پر حملہ کر کے بیت المقدس کو تباہ کر دیا تھا۔ رومی عیسائیوں نے بخت نصر کی امداد کی تھی[1] گویا رومی عیسائیوں نے بخت نصر کے ساتھ مل کر بیت المقدس کو تباہ کیا تھا۔ حالاں کہ بخت نصر کا واقعہ ولادت مسیح سے ۶۳۳ (چھ صد تینتیس) سال قبل پیش آیا۔[2]

مگر واحدی کی یہ غلطی دو وجوہ کی بناء پر قابل معافی ہے۔

۱۔ واحدی مورخ نہ تھے۔

۲۔ واحدی نے صرف قتادہ کا قول ذکر کیا ہے اور اس پر تنقید و تبصرہ نہیں کیا۔ گویا وہ اس کو صحیح سمجھتے ہیں۔

واحدی نے اس آیت کی ایک تفسیر قتادہ کا قول ذکر کرنے سے قبل ذکر کی ہے اور ایک اس کے بعد آیت میں ان دونوں کی گنجائش موجود ہے۔

۱۔ پہلی تفسیر میں ابن عباسؓ کا قول بروایت کلبی ذکر کیا ہے کہ یہ آیت طیطوس[3] رومی اور اس کے عیسائی ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ رومی عیسائیوں نے بنی اسرائیل کے جوانوں کو قتل کیا۔ بچوں کو قید کیا۔ تورات کو جلایا۔ بیت المقدس کو ویران کیا۔ اور لاشوں سے بھر دیا تھا۔ مورخین کی نگاہ میں یہ تفسیر صحیح ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ولادت مسیح کے ستر سال بعد وقوع پذیر ہوا۔

۲۔ دوسری تفسیر میں ابن عباسؓ کا قول بروایت عطاء ذکر کیا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے

---

[1] اسباب النزول للواحدی، ص ۲۴۔ [2] تفسیر المنار، ج ۱۔ ص ۴۳۱۔

[3] اسباب النزول، ص ۲۴۔ پر یہ لفظ طلوس لکھا گیا ہے۔ مگر صحیح وہی ہے جو ہم نے تحریر کیا بعض نے "تیتوس" لکھا ہے۔

بارے میں نازل ہوئی [1] انھوں نے مسلمانوں کو بیت اللہ میں داخل ہو کر ذکر الٰہی کرنے سے روک دیا تھا۔ ابن عباسؓ کا اشارہ صلح حدیبیہ کے واقعہ کی جانب ہے۔ بظاہر یہ تفسیر قرآن کریم کے سیاق و سباق اور تاریخ اسلام سے قریب تر معلوم دیتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ کم از کم طیطوس کے واقعہ کی نسبت موزوں تر دکھائی دیتی ہے اس لیے کہ طیطوس کے واقعہ پر ایک طویل مدت گزر چکی تھی۔ لہذا وہ آیت میں مقصود نہیں ہو سکتا۔

مگر اس تاویل پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ دور جاہلیت میں مشرکین عرب کعبہ کو آباد کرنے اور اس کو اپنے لیے سرمایہ عز و فخر تصور کرتے تھے۔ کعبہ کو ویران کرنا ان کے تصور سے بھی خارج تھا۔ لہذا آیت کا تعلق صرف واقعہ کے ایک گوشہ سے ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے عمرۂ حدیبیہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔[2]

واحدی کی جانب سے اعتذار:

واحدی نے تاریخ سے ناواقف ہونے کی بناء پر جو فاش غلطی کی تھی اس کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ بخت نصر سے اور بیانال رومی مراد ہے جس کو یہودی بخت نصر ثانی کہتے تھے۔ یہ ولادت مسیح کے ۱۳۰ سال بعد بیت المقدس میں آیا تھا۔ اس نے بیت المقدس کے کھنڈرات

---

[1] یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ابن عباسؓ سے دو متضاد روایتیں کیونکر نقل کی گئی ہیں؟ ایک کے ناقل کلبی ہیں اور دوسری کے عطاء۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابن عباس کبھی یہ بات کہتے ہیں کہ یہ آیت رومیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور کبھی یہ کہ مشرکین عرب سے متعلق اتری۔

[2] امام شیخ محمد عبدہٗ تفسیر المنار، ج ۱۔ ص ۴۳۱ پر لکھتے ہیں "ممکن ہے کہ یہ آیت دونوں واقعات سے متعلق ہو۔ آیت کے جس حصہ میں مذکور ہے۔ کہ انھوں نے خدا کے گھر میں ذکر کرنے سے روکا تھا۔ وہ مشرکین مکہ تھے۔ اور جن لوگوں نے اس کی بربادی میں حصہ لیا وہ رومی تھے۔ اس آیت میں دو کاموں کا ذکر کیا۔ ایک ذکر الٰہی سے روکنا اور دوسرا خانہ خدا کو برباد کرنا۔ دونوں کو یکجا ذکر کے اس جانب اشارہ کیا کہ یہ دونوں کام قباحت میں یکساں ہیں"۔

پر ایک شہر آباد کر کے اس کو آراستہ پیراستہ کیا تھا۔ اس نے شہر میں حمام بنوائے اور ہیکل سلیمان کے کھنڈرات پر مشتری کے لیے ایک ہیکل بنوایا تھا۔ اس نے یہود کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ جو یہودی داخل ہوتا اس کو قتل کر دیا کرتا تھا[1]

ابن جریر کی غلطی :

اگر واحدی کی جانب سے یہ عذر تسلیم بھی کر لیا جائے تو ابن جریر جیسے مورخ و مفسر کے لیے کون سا عذر تلاش کیا جائے گا۔ جس نے نہ صرف واحدی کی طرح بخت نصر کا واقعہ ذکر کیا بلکہ حسب عادت اس ضمن میں وارد شدہ اقوال میں سے اس کو قول مختار قرار دیا ہے چنانچہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

"اس آیت کی تاویل میں میں نے جس قدر اقوال نقل کیے ہیں میرے نزدیک ان میں سے عمدہ ترین قول یہ ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں جنھوں نے بیت المقدس کی بربادی میں حصہ لیا اور اس ضمن میں بخت نصر کی امداد کی تھی۔ جب بخت نصر واپس چلا گیا تھا تو نصاریٰ نے اہل ایمان بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہو کر نماز پڑھنے سے روک دیا تھا"[2]

حیرت ہے کہ ابن جریر ایک عظیم مورخ اور حافظ حدیث ہونے کے باوجود اس قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم ابن جریر سے مدافعت کرتے ہوئے۔ اس کو بخت نصر ثانی پر محمول کریں؟ یا یوں کہیں کہ اکابر علماء و حفاظ بھی بعض اوقات بڑی فاش غلطی کے مرتکب ہو جایا کرتے ہیں۔

ہر آیت کے لیے سبب نزول کا ہونا ضروری نہیں :

اور اگر ہم اس قسم کی تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کرنا چاہیں جو اسباب نزول پر مبنی ہیں اور

---

[1] تفسیر المنار، ج ۱، ص ۴۳۱۔

[2] تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص ۳۹۸۔ ابن جریر نے اپنے موقف کو ثابت (باقی برصفحہ آئندہ)

جن پر اس بات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ قرآن کریم کو ان معانی و مضامین کا حامل قرار دیا جائے جن کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ تو ہمیں صد درجہ طوالت سے کام لینا ہوگا۔ ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان غلطیوں کا راز کس امر میں مضمر ہے اور ان کی اصل و اساس کیا چیز ہے۔ اس لیے ہم بے مقصد طوالت سے احتراز کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان اغلاط کا منشاء و مصدر علماء کا یہ گمان ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک سبب نزول کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ قرآن میں امم سابقہ کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اور جن کے اسباب و نتائج اور مقدمات و عواقب ان کے ساتھ ہی قبروں میں مدفون ہو چکے ہیں۔ ان کے لیے بھی سبب نزول کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ آیت کے لیے کسی سببِ نزول کا تلاش کرنا ایک لابدی امر ہے تو اُس کا تعلق ان لوگوں سے ہونا چاہیے جو عہد رسالت میں بقید حیات تھے۔ خواہ وہ مومن ہوں یا مشرک اور اہل کتاب۔ نہ کہ ان لوگوں سے جو عہد رسالت سے قبل ہی موت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔

سابقہ بیانات کے پیش نظر آیت زیر بحث کے ضمن میں صحیح موقف یہ نہیں کہ یہ بخت نصر یا طیطوس کے وارد بیت المقدس ہونے کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔ بلکہ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کس سیاق میں وارد ہوئی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے اصلی مخاطب اہل مکہ اور ان کے ہمنوا تھے۔ اب بھی اس کے مخاطب اسی قسم کے لوگ ہیں۔ آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو عبادت گاہوں کی توہین کا ارتکاب کرتے ہوں۔ خواہ اس کے مجرم عہد رسالت میں ہوں یا ازمنہ سابقہ میں۔ اور خواہ یہ جرم ان سے صادر ہوا ہو یا دوسروں سے نیز یہ کہ خواہ فی الواقع ایسا ہو چکا ہو یا آئندہ زمانہ میں ہونے والا ہو یا اس کے وقوع پذیر ہونے کا امکان ہو۔ آیت کے مخاطب اہل مکہ ہیں۔ یہاں اشخاص یا امکنہ و ازمنہ کی تعیین و تخصیص غیر ضروری ہے یہ آیت ہر اُس شخص کے لیے وعید کا حکم رکھتی ہے جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کرنے کے لیے بہت سے دلائل ذکر کیے ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں۔

کسی زمان و مکان میں عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنا چاہتا ہو۔

بعض سُوَر و آیات کا بلا اسباب نزول :

اس میں شبہ نہیں کہ ایسی تاویل و تفسیر مفسّر کو اسباب نزول کے سلسلہ میں تگ و دو کرنے سے نجات دیتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ قرآن کی بعض سورتیں اور آیتیں بلا اسباب بھی نازل ہوئی ہیں۔ عقل و منطق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ آیات کا ایک عام سبب ہونا چاہیے جس کو سبب حقیقی قرار نہیں دے سکتے مثلاً حضرت موسیٰ کا واقعہ قرآن میں متعدد جگہ مختلف الفاظ میں وارد ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ابتداءً بلا اسباب نازل ہوا ہے۔ مزید براں جو اس کے لیے اسباب تلاش کرنا چاہے گا وہ ان سب واقعات کے لیے ایک ہی عام سبب کی نشان دہی کرے گا۔ اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰ کا واقعہ متعدد جگہ بیان کر کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ایسے حوادث میں متفکر نہ ہوں۔ مگر جن آیات میں حضرت موسیٰ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں یوں کہا جائے گا کہ یہ آنحضورؐ کی تسلی کے لیے نازل کی گئی ہیں۔ کیونکہ یہ آپ کے زمانہ میں اُتریں یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ آیات حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے بارے میں نازل ہوئیں اس لیے کہ یہ آیات حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے عرصہ دراز بعد نازل ہوئیں۔

نظر بریں یہ اعتراض درست نہیں کہ صحابہ نے بارگاہِ نبوی میں عرض کیا تھا کہ ہمیں کوئی واقعہ سنایئے تو تب سُورۂ یوسف نازل ہوئی[1]۔ اس لیے کہ یہ پوری سورت کا سبب نزول ہے نہ کہ صرف ابتدائی آیات کا۔ اور یہ ایک ایسے صاف و صریح معاملہ کے بارے میں ہے جو صحابہؓ سے متعلق تھا۔ اور سوال کرنے والے بھی خود صحابہ تھے۔ جو عبرت و موعظت پر مبنی واقعات سننے کے دل و جان سے طلب گار تھے۔ انھوں نے بہترین واقعہ سننے کی انتہائی رغبت و

---

[1] اسباب النزول للواحدی، ص ۲۰۲۔ اس حدیث کے راوی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

خواہش کا اظہار کیا تھا[1] اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ جس طرح یہود کے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرنے میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

قتادہ فرماتے ہیں:

"یہود نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا"۔[2]

یہی وجہ ہے کہ ہم نے قرآن کی اس قسم کے بارے میں جو ابتداءً بلا اسباب نازل ہوئی ہے تشدد سے کام نہیں لیا۔ ہمارے نزدیک قرآن کی یہ قسم ماضی کے تمام واقعات کو نہیں بلکہ اکثر شامل ہے۔ اسی طرح قرآن کے تمام قصص اس کے دائرہ میں داخل نہیں بلکہ زیادہ تر غیبیات کے مشاہد اور جنت و جہنم کے مناظر میں سے بھی سب نہیں بلکہ اکثر اس کی لپیٹ میں آتے ہیں۔[3] کچھ بعید نہیں کہ ان میں سے بعض امور کے لیے کچھ اسباب ہوں مگر ایک محقق کو یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ جنت و دوزخ اور قیامت کے مناظر و مشاہد کے لیے اسباب نزول کی اتنی ضرورت نہیں جتنی مقابلۃً ان آیات میں پیش آتی ہے جن میں انفرادی و اجتماعی احکام بیان

---

[1] اس پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ حضرت سعد اپنی روایت میں فرماتے ہیں "صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ہمیں کوئی واقعہ سنایئے تب یہ آیت نازل ہوئی "اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا" سعد اس کے بعد فرماتے ہیں "یہ اس لیے فرمایا تاکہ لوگ قرآن پر ایمان لے آئیں (اسباب النزول للواحدی ص ۲۰۳)

[2] سورۃ الکھف نیز اسباب النزول للواحدی ص ۲۲۵۔

[3] مثلاً ابوالعالیہ اور ضحاک سورۃ الواقعہ کی آیت "فِىْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ" کے شان نزول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے طائف میں ایک سرسبز و شاداب وادی دیکھی تو وہاں بیری کے درخت ان کو بہت پسند آئے اور کہا کاش! ہمیں ایسی وادی نصیب ہوتی۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (اسباب النزول للواحدی ص ۳۰۱)

کیے گئے ہیں۔ قاری جب کوئی ایسی آیت تلاوت کرتا ہے جس میں عبادات یا معاملات کے احکام ذکر کیے گئے ہوں یا حلال و حرام، درغزوہ وجہاد کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ یا احوال شخصی حقوق مدنی یا معاہدات دُوَلی کی تفصیلات بیان کی گئی ہوں۔ تو اس کا ذہن فوراً اسبابِ نزول کی تلاش میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مسائل و احکام کا فہم و ادراک تاریخی سببِ نزول کے ساتھ وابستہ ہے۔

اسبابِ نزول سے متعلق صیغے:

اگر ہم ان غیر مقصود مباحث سے صرفِ نظر کر لیں جو مفسرین نے ماضی کے واقعات کو اسبابِ نزول میں شامل کرکے مبالغہ آرائی کی بناء پر پیدا کر دیے ہیں تو ہمارے سامنے کئی مباحث اور بھی ہیں۔ ان میں سے اشد ضروری بحث یہ ہے کہ اسبابِ نزول سے متعلق روایات میں جو صیغے بیان کیے جاتے ہیں ان میں سے اثباتِ مقصود کے لیے صحیح ترکون سے ہیں۔

اس ضمن میں جان لینا چاہیے کہ کسی صحیح روایت سے ہمیشہ سببِ نزول کا ثابت ہو جانا ضروری نہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں سبب کے علاوہ کوئی اور چیز مذکور ہو۔ جب حدیث کا راوی سبب کا لفظ صراحۃً بول کر یوں کہے "سَبَبُ نُزُولِ هٰذِهِ الْاٰیَةِ كَذَا" (اس آیت کا سببِ نزول یہ ہے) یا کوئی حادثہ اور سوال ذکر کرنے کے بعد کہے "حَدَثَ كَذَا اَوْ سُئِلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ كَذَا فَنَزَلَتْ اٰيَةُ كَذَا۔ (فلاں واقعہ پیش آیا یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فلاں بات دریافت کی گئی تو یہ آیت نازل ہوئی) تو اس واقعہ یا سوال کے سببِ نزول ہونے میں نصِ صریح ہے۔

بخلاف ازیں جب راوی یوں کہے "نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِي كَذَا" تو اس میں دونوں احتمال موجود ہوتے ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ وہ واقعہ حقیقی سبب ہو۔ (۲) دوسرے یہ کہ یہ آیت فلاں حکم کے بارے میں نازل ہوئی۔

زرکشی البرہان میں رقم طراز ہیں:

"صحابہ و تابعین کی عادت ہے کہ جب وہ "نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِيْ كَذَا" کے الفاظ کہتے ہیں تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت فلاں حکم کو شامل ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ واقعہ اس آیت کا شانِ نزول ہے۔ محدثین کی ایک جماعت اس کو حدیث مرفوع خیال کرتی ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول آیت: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ" کے بارے میں امام احمد اور مسلم اس کو حدیث مسند قرار نہیں دیتے بلکہ اس کو صحابی کی رائے اور اجتہاد پر محمول کرتے ہیں اور اس کو کسی اور سے منقول تصور نہیں کرتے"[1]

اگر ایک راوی کہے کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی اور دوسرا کہے نہیں بلکہ فلاں واقعہ میں اتری۔ اگر آیت کے الفاظ دونوں کے متحمل ہوں تو دونوں پر محمول کیا جائے گا۔ اور اس میں تناقض بھی نہیں ہوگا۔ ورنہ آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق جس بات کا مقتضی ہوگا۔ اس کو صحیح سمجھا جائے گا۔ جب دو راویوں میں سے ایک کہے "نزلتِ الآیۃ فی کذا" اور دوسرا راوی تصریح سے کام نہ لے۔ تو ترجیح اس راوی کے قول کو دی جائے گی، جس میں صراحت پائی جاتی ہو۔

ایک آیت کے سبب نزول میں متعدد روایات:

بعض اوقات ایک ہی آیت کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوتی ہیں۔ ان روایات سے صریح الفاظ میں مستفاد ہوتا ہے کہ فلاں آیت کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے۔ ایسی صورت میں علماء کے یہاں ایک بڑا نازک معیار ہوتا ہے جس پر لا کر وہ ایک روایت کو ترجیح دیتے ہیں یا دونوں روایات میں بڑی عمدہ تطبیق دیتے ہیں اور ان کے تضاد کو رفع کر دیتے ہیں۔

اگر دونوں روایات صحیح ہوں اور کسی ایک کی ترجیح کا کوئی امکان نہ ہو تو دونوں میں تطبیق دی جائے گی۔ اور کہا جائے گا کہ آیت دونوں سببوں کے وقوع کے بعد نازل ہوئی۔ اس کی

[1] البرهان ج ۱ ص ۳۱-۳۲ نیز الاتقان ج ۱ ص ۵۲)

مثال وہ حدیث ہے جس کو بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور لفظ بخاری کے ہیں۔ سہل بن سعد روایت کرتے ہیں کہ بنی عجلان کا رئیس عویمر عاصم بن عدی کے پاس آیا اور کہا تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو، جو اپنی بیوی کے ساتھ دوسرے شخص کو مشغول دیکھے؟ اگر وہ اس بدکار کو قتل کر دے تو تم اُس کو قتل کر دو گے۔ پھر وہ کیا کرے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر مجھے بتایے۔ عاصم بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا اور ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے اس سوال کو ناپسند فرمایا۔ عویمر نے کہا "بخدا میں آپ سے یہ بات دریافت کر کے رہوں گا۔ عُویمر نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا وہی سوال دُہرایا۔ آپ نے فرمایا تمہارے اور تمہاری بیوی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کر دیا ہے۔ آپ نے ان دونوں کو لعان کا حکم دیا[۱]

امام بخاری نے عکرمہ سے بطریق ابن عباس ہلال[۲] بن اُمیہ سے روایت کی ہے کہ اُس نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر اپنی بیوی کو شریک بن سَحماء کے ساتھ متہم کیا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "گواہ پیش کرو، ورنہ تم پر حدِ قذف لگائی جائے گی"۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! جب کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو مشغول دیکھے تو وہ گواہ ڈھونڈنے چلا جائے؟[۳] اس دوران حضرت جبریل مندرجۂ ذیل آیات لے کر نازل ہوئے:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ ..... مِنَ الصَّادِقِينَ[۴] تک۔

چونکہ ان دونوں واقعات کے درمیان بُعدِ زمانی نہایت کم تھا اس لیے ان میں جمع و تطبیق

---

[۱] صحیح بخاری، ج ۶ ص ۹۹۔

[۲] ہلال بن اُمیہ خزاعی ان تین صحابہ میں سے تھے۔ جو جنگ تبوک میں شرکت نہ کر سکے رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ (بخاری، ج ۶ ص ۱۰۰)۔

[۳] ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ہلال نے کہا اس ذات کی قسم جس نے حق کے ساتھ آپ کو مبعوث فرمایا میں سچا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآن نازل کر کے میری پیٹھ کو حدِ قذف سے بچائے گا (بخاری، ج ۶ ص ۱۰۱)

[۴] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۶۵ نیز الاتقان، ج ۱ ص ۵۶۔

بہت آسان ہے۔ دونوں میں سے ایک صحابی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا۔ ابھی آپ جواب نہ دے پائے تھے کہ دوسرے صحابی نے بھی یہی سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں سائلوں کے جواب میں سورۂ نور کی یہ آیات نازل فرمائیں۔ بقول محدث خطیب بغدادی یہ بھی ممکن ہے کہ بیک وقت یہ واقعہ پیش آیا ہو۔ اس لیے ظاہر بات یہی ہے کہ نزولِ آیات کے یہاں دو سبب تسلیم کرنے پڑیں گے۔ اور تعددِ اسباب سے کوئی چیز مانع بھی نہیں جیسا کہ حافظ ابن[1] حجر عسقلانی کا ارشاد ہے۔

اور اگر دونوں روایتیں صحیح ہوں اور ترجیح کا کوئی امکان نہ ہو۔ اور بُعدِ زمانی کی وجہ سے دونوں میں جمع و تطبیق بھی ممکن نہ ہو۔ تو ہم کہیں گے کہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی۔

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو بیہقی اور البزار نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے، کہ غزوۂ اُحد میں جب حضرت حمزہ شہید ہو گئے اور آپ کا مُثلہ کیا گیا تو آنحضورؐ ان کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا "میں تیرے عوض ان کے ستر آدمیوں کا مُثلہ کروں گا" اسی دوران جبریل سورۂ نحل کی آخری تین آیات[2] لے کر تشریف لائے۔ آنحضورؐ ابھی تشریف فرما تھے۔

علاوہ ازیں ترمذی اور حاکم ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے روز ۶۴ انصار اور ۶ مہاجرین نے شہادت پائی۔ ان میں سے ایک حضرت حمزہؓ بھی تھے۔ کفار نے آپ کا مُثلہ کر دیا تھا۔ انصار نے کہا "اگر ہمیں موقع ملا تو ہم اس سے بڑھ کر انتقام لیں گے" جب فتح مکہ کا دن آیا تو یہ آیت نازل ہوئی وَإِنْ عَاقَبْتُمْ تا آخر[3]

ان دونوں روایتوں میں جمع و تطبیق ممکن نہیں۔ کیونکہ دونوں میں طویل زمانہ حائل ہے۔ ایک کا تعلق غزوہ اُحد سے ہے اور دوسری کا فتح مکہ سے۔ اور دونوں میں کئی سالوں کا بُعد ہے۔ اس

---

[1] الاتقان، ج ۱- ص ۵۶۔

[2] آیات یہ ہیں "وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ..... مُحْسِنُونَ" تک۔

[3] الاتقان، ج ۱- ص ۵۷۔

لیے مجبوراً ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ آئتیں دو مرتبہ نازل ہوئیں۔ ایک دفعہ غزوۂ احد میں اور دوسری دفعہ فتح مکہ کے موقع پر۔

اس کی مثال بخاری کی وہ حدیث بھی ہے جس کو المسیب روایت کرتے ہیں کہ جب ابوطالب کا آخری وقت قریب آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس تشریف لے گئے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن ابی اُمیّہ بھی ان کے پاس موجود تھے۔ آپ نے فرمایا "چچا جان! کلمہ طیب پڑھ لیجیے میں تمہارے حق میں خدا سے جھگڑوں گا" ابوجہل اور عبداللہ بن ابی اُمیّہ کہنے لگے اے ابوطالب کیا تم عبدالمطلب کے دین سے منحرف ہو رہے ہو؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں اس وقت تک آپ کے لیے معافی طلب کرتا رہوں گا جب تک مجھے اس سے روکا نہ گیا" پھر یہ آیت نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا	نبی اور مومنوں کے لیے موزوں نہیں کہ مشرکوں
اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ	کے لیے مغفرت طلب کریں اگرچہ ان کے رشتہ دار
كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى۔	ہی کیوں نہ ہوں۔

سورۂ توبہ کی یہ آیت بالاتفاق مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ حالانکہ ابوطالب کی وفات مکہ میں ہوئی تھی[2]۔ اسی طرح سورۂ اخلاص کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ مشرکین مکہ نے جو سوال کیا تھا۔ یہ سورت اس کے جواب میں نازل ہوئی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ سورت مدینہ کے اہل کتاب کے جواب میں اتری[3]۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سورت دو دفعہ نازل ہوئی۔ اور کوئی چیز اس سے مانع بھی نہیں۔

زرکشی البرہان میں لکھتے ہیں:-

"بعض اوقات اظہارِ عظمت وفضیلت اور خوفِ نسیان کے ازالہ کے لیے ایک چیز

---

[1] التوبہ آیت ۱۱۳۔ بخاری کتاب التفسیر، ج ۲۔ ص ۶۹۔

[2] البرہان، ج ۱۔ ص ۳۱۔ [3] البرہان، ج ۱۔ ص ۳۰۔

دو دو دفعہ بھی نازل کی جاتی ہے۔ جیسے فاتحہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دو دفعہ نازل ہوئی۔ ایک دفعہ مکہ میں اور ایک دفعہ مدینہ میں[1]

اگر سبب نزول کی دونوں روایتیں صحیح ہوں۔ ان میں سے ایک روایت صحیح تر ہو اور اس بناء پر اس کو دوسری پر ترجیح دینا ممکن ہو۔ یا اس لیے ترجیح دے سکتے ہوں کہ ایک کا راوی واقعہ میں شریک ہوا اور دوسرا نہ ہو۔ تو بلا شبہ سبب نزول کو اس روایت پر مبنی قرار دیا جائے گا جو صحیح تر ہونے کی وجہ سے راجح ہو۔

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ میں آپ کے ساتھ مدینہ میں جا رہا تھا۔ آپ کھجور کی ایک ٹہنی کا سہارا لے کر چل رہے تھے۔ آپ کا گزر یہودیوں کی ایک جماعت پر ہوا۔ بعض یہودی کہنے لگے ان سے کچھ پوچھنا چاہیے چنانچہ انھوں نے دریافت کیا روح کیا چیز ہے؟ آپ تھوڑی دیر سر اوپر کو اٹھائے کھڑے رہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وحی نازل ہو رہی ہے۔ جب فارغ ہوئے تو یہ آیت سنائی:

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ — آپ فرما دیں کہ روح میرے رب کا امر ہے اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

ترجیح روایتِ صحیحہ:

دوسری روایت وہ ہے جو ترمذی نے ابن عباس رضؓ سے نقل کی اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ قریش نے یہود سے کہا ہمیں کوئی بات بتائیے جو ہم اس شخص (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کریں۔ یہود نے کہا ان سے روح کی حقیقت پوچھیے۔ چنانچہ قریش نے یہ سوال کیا

---

[1] البرھان ج ۱۔ ص ۲۹۔

[2] یہ عبارت سیوطی نے الاتقان، ج ۱۔ ص ۵۵ پر بخاری سے نقل کی ہے۔ بخاری کی دوسری روایت کے الفاظ قدرے اس سے مختلف ہیں (بخاری کتاب التفسیر ج ۶۔ ص ۸۷) تفسیر ابن کثیر ج ۱۔ ص ۶۰ پر بھی اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ حدیث امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے

تو مذکورہ صدر آیت نازل ہوئی ۔[۱]

مذکورہ صدر بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہاں دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک بخاری میں ہے اور دوسری ترمذی میں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ترمذی کی روایت بھی صحیح ہے مگر بخاری کی روایت کو جمہور کے نزدیک ترمذی کی روایت پر ترجیح حاصل ہے۔ مزید براں روایت راجحہ کے راوی ابن مسعود ہیں جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں اور یہ درست ہے کہ ؎

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

یہ ترجیح کی وجہ ثانی ہے۔ بلکہ ترجیح کی یہ وجہ اقوی ہے ۔[۲]

جب ہم سبب نزول کے سلسلہ میں صحیح تر اور ارجح روایت کو اخذ کرتے ہیں ——— حالاں کہ مرجوح روایت بھی صحیح ہے ——— تو یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب ایک روایت صحیح اور دوسری ضعیف ہو تو اس صورت میں صرف روایت صحیحہ پر اعتماد کیا جائیگا اس کی مثال وہ حدیث ہے جس کو بخاری و مسلم نے جندب سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑ گئے اور ایک یا دو راتوں میں اُٹھ نہ سکے، ایک عورت نے آکر کہا "اے محمدؐ! میرا خیال ہے کہ تمہارا شیطان تم سے رخصت ہو گیا" تب یہ سورۃ کریمہ نازل ہوئی:

وَالضُّحٰی ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰی ۝

محدث طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے حفص بن میسرہ سے روایت کی حفص اپنی والدہ سے اور وہ اپنی والدہ سے روایت کرتی ہیں کہ وہ آنحضورؐ کی خادمہ تھیں۔ ایک دفعہ کتے کا پلا گھر میں داخل ہو کر چارپائی کے نیچے چار روز تک بیٹھ گیا آپ پر وحی نازل نہ ہوئی۔ فرمایا اے خولہ! جانے کیا واقعہ پیش آیا میرے پاس جبریل حاضر نہیں ہوتا؟ میں نے اپنے جی میں کہا

---

[۱] الاتقان، ج ۱ ص ۵۵۔

[۲] امام سیوطی فرماتے ہیں "بخاری کی روایت کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ یہ دیگر روایات کے مقابلہ میں صحیح تر ہے۔ نیز اس لیے کہ ابن مسعود اس واقعہ میں بہ نفس نفیس موجود تھے۔" (الاتقان، ج ۱ ص ۵۵)

[۳] بخاری، ج ۶ ص ۱۸۲۔

گھر میں جھاڑو دینا چاہیے۔ میں نے جھاڑو ہاتھ میں لے کر چارپائی کے نیچے دیکھا اور پلّے کو نکال دیا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ریش مبارک ہل رہی تھی۔ جب وحی نازل ہوتی تو آپ پر لرزہ طاری ہو جایا کرتا تھا۔ تب سورہ والضحیٰ "فَتَرْضٰی" تک نازل ہوئی۔

ظاہر ہے کہ دوسری روایت پر موضوع ہونے کے آثار نمایاں ہیں۔ اس کے الفاظ و معانی میں وحشت و غرابت پائی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں پہلی روایت صحیح ہے۔ لہٰذا ہمیں اس تردّد میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ کس روایت کو اخذ اور کس کو ترک کیا جائے۔ اس لیے کہ باطل کسی صورت میں بھی صحیح کا حریف نہیں ہو سکتا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

"پلّے کی وجہ سے وحی میں تاخیر مشہور واقعہ ہے۔ مگر اسے سورہ والضحیٰ کا سببِ نزول قرار دینا ٹھیک نہیں کیونکہ اس کی اسناد میں مجہول راوی ہے۔ لہٰذا روایت صحیحہ ہی قابلِ اعتماد ہے[1]

ایک واقعہ متعدد آیات کے نزول کا باعث:

بعض اوقات ایک واقعہ دو یا دو سے زیادہ آیات کے نزول کا سبب قرار پاتا ہے اس کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں "تعدّد النازل والسبب واحد"

اس کی مثال وہ حدیث ہے جس کو ابن جریر طبری طبرانی اور ابن مَرْدَوَیْہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ایک درخت کے سایہ تلے استراحت فرما تھے۔ ارشاد ہوا عنقریب ایک شخص آئے گا وہ تمہاری طرف شیطان کی طرح دیکھے گا۔ جب وہ آئے تو اس سے بات نہ کیجیے۔ اتنے میں نیلی آنکھوں والا ایک شخص آیا۔ آپ نے اسے بلا کر کہا تم اور تمہارے ساتھی مجھے گالیاں کیوں دیتے ہیں؟ وہ شخص گیا اور اپنے ساتھیوں کو لے آیا۔ انہوں نے حلف اُٹھا کر کہا کہ ہم نے آپ کو گالیاں نہیں دیں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

---

[1] الاتقان ج ۱ ص ۳۵۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ (سورۃ التوبۃ)

محدث حاکم نے یہ حدیث انہی الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے اور کہا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝[1]

(سورۃ المجادلۃ)

ایک ہی واقعہ جو متعدد آیات کے نزول کا سبب ہو اس کی مثال وہ حدیث ہے جس کو حاکم اور ترمذی نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ نے مہاجر عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّيْ لَا أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى۔ (سورۃ آل عمران)

حاکم نے یہ حدیث بھی حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کا ذکر کرتے ہیں اور عورتوں کا نہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔

نیز یہ آیت بھی اتری:

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ آخر تک (سورۃ الاحزاب)

نیز مذکورہ صدر آیت یعنی "إِنِّيْ لَا أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ" بھی اتری۔[2]

---

[1] الاتقان، ج ۱ ص ۵۸۔

[2] الاتقان، ج ۱ ص ۵۷-۵۸۔

ترجیحِ روایات میں مفسرین کا مقیاس و معیار :

یہ ہیں اہلِ تحقیق مفسرین کے اسباب نزول سے متعلق روایات میں سانچے اور پیمانے! ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ پیمانے نزاکتِ اصطلاحات حسنِ نقد و جرح لطافتِ ذوق اور براعتِ تخریج میں منفرد اور یگانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ انہی مقیاسات کے پیشِ نظر ان ائمہ ثقات کے لیے اسبابِ نزول کی نشان دہی کرنا آسان ہو گیا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ ان تاریخی توہمات کا شکار بھی نہیں ہوئے جن میں مبالغہ آمیزی اور عجلت پسندی سے کام لینے والے مبتلا ہو گئے تھے۔ ان جلد بازوں نے قرآن کے مطالعہ کو تاریخی و تفسیری روایات اور قواعد لغت و بیان سے بے نیاز قرار دے دیا تھا۔

ان محققین نے اسی حسین و جمیل تنقیدی مطالعہ کی روشنی میں بچشم خود مشاہدہ کیا کہ ان کے دریافت کردہ مخصوص اسباب کے تحت آیات کا نزول اس بات کے منافی نہیں کہ ان آیات کو ایسی جگہ رکھا گیا ہے جو ان کے سیاق کے مناسب تھی اس لیے کہ قرآن متفرق واقعات اور اسباب کے تحت قسط وار نازل ہوا کرتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت یا چند آیات کو ان سے ملتی جلتی آیات کے ساتھ وہاں رکھنے کا حکم دیتے جو حکم خداوندی کے پیشِ نظر ان کی اصلی جگہ ہوتی؛ اور نظم قرآن اور حسن سیاق کا تقاضا بھی یہی ہوتا کہ ان کو وہاں رکھا جائے[1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفسرین نے تاریخی سبب نزول اور ادبی سیاق و سباق کو یکجا کر دیا۔ اس سے ان کی فنی مہارت اور حسن تنقید کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ نہ تو انہوں نے سبب نزول کی پہچان کے لیے تاریخی حقائق کو نظر انداز کیا اور نہ سیاق و سباق کو ملحوظ رکھتے ہوئے فنی نظم و نسق سے غفلت برتی۔ اس لیے کہ بقول زرکشی زمانہ سبب نزول کے لیے شرط ہے۔ معنوی مناسبت کے لیے نہیں۔ مناسبت صرف یہ مقصود ہے کہ آیت کو وہاں رکھا جائے جہاں مناسب ہو[2]۔ خلاصہ یہ کہ ایک طرف آیات کو حکیمانہ ترتیب کے ساتھ سفینوں میں

---

[1] البرہان، ج ۱۔ ص ۲۵، ۲۶۔ [2] البرہان، ج ۱۔ ص ۲۶۔

سجایا گیا۔ اور دوسری طرف بکمال حفاظت حسبِ واقعات ان کو سینوں میں ٹھہرایا گیا۔

آیات کا ربط و تعلق:

سورۂ نساء کی یہ آیت:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ[1]۔

اہل کتاب کے ایک شخص کعب بن اشرف کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ وہ مکہ آیا تھا اور بدر کے مقتولوں کو دیکھ کر اہل مکہ کو جنگ پر اکسایا کفار قریش نے پوچھا "صحیح راستہ پر کون ہے محمد اور ان کے ساتھی یا ہم؟ اس نے ازراہِ خوشامد کہا "تم صحیح راہ پر ہو"[2] پہلے چند آیات کعب بن اشرف اور اس کے رفقاء سے متعلق ہیں۔ پھر یکایک اگلی آیت میں اداءِ امانت کا حکم دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا[3]"	کی امانتیں ادا کر دو۔

مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ عبدری حاجب کعبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کعبہ کی کنجی لی اور پھر واپس دے دی[4] تھی۔ جب یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اتری اور سابقہ آیت غزوہ بدر کے بعد کعب بن اشرف کے بارے میں نازل ہوئی تو اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کے درمیان چھ سال کی مدت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کو آپس میں کیونکر ملا دیا گیا؟ اس قدر طویل بُعدِ زمانی کے باوجود دونوں آیتیں یکے بعد دیگرے کیونکر لائی گئیں؟

---

[1] سورۃ النساء، آیت ۵۱۔ [2] تفسیر ابن جریر طبری، ج ۵۔ ص ۸۵۔

[3] سورۃ النساء، آیت ۵۸۔ [4] تفسیر ابن کثیر ج ۱۔ ص ۵۱۵ نیز طبری ج ۵۔ ص ۹۱-۹۲

مگر علمائے محققین ان دونوں بظاہر غیر مربوط آیتوں میں ایک ایسا گہرا اور مستحکم ربط نکال لیتے ہیں کہ بے ربطی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیتیں بہمہ وجوہ آپس میں مربوط و متصل ہیں۔ مثلاً وہ مذکورہ صدر دونوں آیتوں میں ربط و تعلق یوں پیدا کرتے ہیں کہ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی جو ازرہِ تملق کفارِ قریش کو ہدایت یافتہ قرار دے رہے تھے بہر حال اہل کتاب تھے۔ ان کی کتب مقدسہ میں آنحضورؐ کی بعثت اور آپ کی صفات تفصیلاً مذکور تھیں۔ ان سے عہد لیا گیا تھا کہ اس امانت کو مت چھپائیں۔ مگر وہ خائن ثابت ہوئے ان کی یہ خیانت بالکل یونہی تھی جیسے کسی کو امانت دی جائے اور وہ اسے ادا نہ کرے۔ اس لیے ان کو اور ان کے ہمنواؤں کو اداءِ امانت کا احساس دلایا گیا۔ کہ وہ اس خیانت کاری سے باز آجائیں[1]

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ مفسرین جہاں کہیں سبب نزول سے پہلے آیات کا باہمی ربط و تعلق اور مناسبت بیان کرتے ہیں تو اس میں مبالغہ آمیزی کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوتا۔ مفسرین عموماً وہاں ایسا کرتے ہیں جہاں دیکھتے ہیں کہ نظم کلام ربط اور اور مناسبت بیان کیے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ جہاں سبب نزول بیان کیے بغیر ربطِ آیات کا ذکر و بیان ممکن نہ ہو۔ وہاں سبب نزول پہلے بیان کرتے ہیں اور ربط بعد میں۔ یہ ان کی علمی بلند پروازی اور اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا شاہکار ہے۔ جس طرح آیت قرآنی أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ میں پہلے سبب نزول بیان کیا اور بعد ازاں ربطِ آیات۔ اگر اس آیت کا سبب نزول معلوم نہ ہوتا تو قرآن کا وہ قاری جو ہمیشہ ربطِ آیات کی طلب و تلاش میں رہتا ہے یہاں بڑی الجھن میں مبتلا ہو جاتا اور اس پر ربط کی کوئی وجہ ظاہر نہ ہوتی۔

---

[1] مشہور مالکی فقیہہ ابوبکر بن العربی اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں: "دونوں آیتوں میں ربط و تعلق کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اہل کتاب آنحضورؐ کی صفات کو چھپاتے اور مشرکین کو ہدایت یافتہ قرار دیتے تھے۔ یہ ان کی خیانت تھی۔ اس لیے امانت کی ادائگی پر زور دیا۔ زرکشی نے البرہان [illegible] ص ۲۹ پر یونہی لکھا ہے"۔

مفسرین کا عام انداز یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر کا آغاز اس کے سببِ نزول سے کرتے ہیں تاہم یہ مسئلہ اکثران کے یہاں زیرِ بحث آتا ہے کہ آیا تفسیرِ آیات کا آغاز ربط و تعلق سے ہونا چاہیے یا سببِ نزول سے؟ اس سوال کی حیثیت کچھ بھی ہو اس سے یہ بات منظرِ عام پر آتی ہے کہ قرآنی آیات کا ربط و تعلق اس کے فقرات و کلمات اور مشابہ و سُوَر کا اقتران و اتصال ایک عظیم علم ہے جس میں قرآن کریم کے لطائف و عجائبات مضمر ہیں۔ قرآن کے اکثر احکام و شرائع کی تفسیر اس علم کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ امام ابوبکر نیسابوری[1] ——— جس نے اس علم کو بغداد کے شہر میں منصۂ شہود پر جلوہ گر کیا ——— علمائے بغداد کی اس لیے مذمت کیا کرتے تھے کہ وہ ربط آیات کے فن سے بے بہرہ ہیں۔ جب ان کو کوئی آیت یا سورت پڑھ کر سنائی جاتی تو وہ اکثر دریافت کرتے "اس آیت کو دوسری آیت کے پہلو میں کس لیے رکھا گیا ہے؟ اور فلاں سورت کو فلاں کے بعد کس لیے لایا گیا ہے؟[2]"

سُوَرِ قرآنی کے مابین ربط و تعلق:

ابوبکر نیسابوری کے مذکورہ بالا قول سے ایک جدید رجحان کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ آیات کے درمیان ربط و تعلق کے علاوہ سورتوں کے مابین بھی ربط کی ضرورت ہے ——— اس ضمن میں سچی اور پختہ بات یہ ہے کہ تقدم اور اولیت ربط آیات ہی کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے آیت ہی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ آیا یہ سابقہ آیت کا تکملہ اور ضمیمہ ہے یا اپنے مضمون میں مستقل ہے؟ اور اگر مستقل ہے تو ما قبل سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اور یہاں اس کے لانے کی کیا وجہ ہے؟

جہاں تک سورتوں کی باہمی مناسبت کا تعلق ہے اس میں تکلف سے کام لینا پڑتا ہے

---

[1] نام عبداللہ بن محمد اور کنیت ابوبکر ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ حدیث اور شافعی مذہب کے عظیم فقیہ تھے ۳۲۴ھ میں وفات پائی (شذرات الذہب، ج ۲۔ ص ۳۰۲)

[2] البرہان، ج ۱۔ ص ۳۶

مزید براں یہ اس امر پر مبنی ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی (اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ) ہے اس ضمن میں ہمارا زاویہ نگاہ یہی ہے[1] مگر سورتوں کے توقیفی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ دو سورتوں کے درمیان نہایت قریبی روابط ہوں۔ جس طرح آیات کی توقیفی ترتیب عقلاً اس بات کی مقتضی نہیں کہ جب دونوں کے اسباب نزول مختلف ہوں تو اس وقت بھی دونوں آیتیں باہم مرتبط ہوں۔

کسی ایک سورت میں زیادہ تر اس وصف کا پایا جانا ضروری ہے کہ اس کا مرکزی موضوع ایک نمایاں کلی حیثیت رکھتا ہو۔ اس کی جزئیات اس کے ساتھ مربوط و متصل ہوں۔ اور سب کڑیاں آپس میں ملتی چلی جائیں۔ مگر ایک رت میں موضوع کی جو جداگانہ وحدت پائی جاتی ہو ضروری نہیں کہ یہی وحدت سب سورتوں میں بحیثیت مجموعی بھی پائی جائے۔ ظاہر ہے کہ مفسرین نے اس حد تک تکلف سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے صرف یہ کام کیا ہے کہ ایک سورت کے اختتام کو دوسری سورت کے آغاز کے ساتھ جو مناسبت تھی وہ بیان کر دی۔ اگر دونوں سورتوں کے درمیان "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے الفاظ حد فاصل نہ ہوتے تو دونوں کے مابین ربط ایک جزئی حیثیت کا ہوتا کلی طرز کا نہیں۔

قرآنی آیات و سُوَر کے درمیان جس قسم کا تناسب و تطابق پایا جاتا ہے اس میں تکلف کا معیار ہماری نگاہ میں وہی ہے جیسے مختلف موضوعات کا باہمی تماثل و تشابہ۔ اگر یہ تماثل ایسے امور میں واقع ہو جن کے اوائل کا اواخر کے ساتھ گہرا ربط و تعلق ہو تو یہ معقول و مقبول ہے۔ اور اگر تماثل ایسے امور میں رونما ہو جو باہم مختلف ہوں تو یہ بے کار ہے، کسی نے سچ کہا ہے:

"مناسبت و مشابہت ایک معقول چیز ہے۔ جب اسے عقل کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ اسے قبول کر لیتی ہے[2]"

---

[1] جیسا کہ قبل ازیں ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اس ضمن میں ضابطہ یہ ہے کہ آیتوں یا سورتوں کے درمیان ربط و تعلق کبھی پوشیدہ ہوتا اور کبھی ظاہر۔ البتہ آیات میں باہمی ربط کے پوشیدہ ہونے کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اس کے برخلاف سورتوں کے مابین ربط کا ظہور شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بات ایک آیت سے مکمل نہیں ہوتی۔ اس لیے موضوع زیر بحث میں دوسری آیات وارد ہو کر مضمونِ سابق کی تاکید و تفسیر پیش کرتی ہیں یا دوسری آیت عطف و بیان حصر و استثناء یا اعتراض و تذییل کے طور پر وارد ہوتی ہے۔ گویا بعد میں آنے والی آیات سابقہ آیت کے نظائر و امثال کے قبیل سے ہوتی ہیں۔ مثلاً جو شخص یہ آیت تلاوت کرے گا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى [1]

وہ لازمی طور پر یہ سوال کرے گا کہ چاند کے احکام اور گھروں کو آنے کے درمیان کیا ربط و تعلق پایا جاتا ہے؟ پھر اس پر جلد ہی اس ربط کا راز و انکشاف ہو جائے گا۔ اور وہ یوں کہ قرآن کریم کا مقصد اس امر کی جانب تعریض کرنا ہے کہ سوال کرنے والوں کا سوال بے موقع اور بے جا ہے[2] گویا جب انہوں نے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی حکمت و مصلحت سے متعلق پوچھا تو قرآن نے جواب دیا:

"خدا کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے عاری نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسا سوال ترک کر دو۔ ذرا اپنے افعال پر ایک نگاہِ احتساب ڈالو کہ تم غلط کام کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہو کہ یہ نیکی ہے"[3]

(بقیہ صفحہ گزشتہ) [2] البرھان، ج ۱ ص ۳۵۔ برھان الدین البقاعی نے اس موضوع پر ایک بیش قیمت کتاب تالیف کی تھی۔ اس کا نام "نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور" ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ قاہرہ کے دار الکتب میں موجود ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۹۔

[2] تفسیر المنار، ج ۲۔ ص ۱۹۷۔ [3] البرھان، ج ۱۔ ص ۴۱۔

سطورِ سابقہ اس حقیقت کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ ہم ایک ہی آیت کے دو ٹکڑوں کے درمیان ربط و تعلق تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس مناسبت کے تلاش کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تاکہ آیت کا آغاز و انجام ایک دوسرے سے غیر مربوط نہ ہو جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ پھر دو آیتوں کے درمیان ـــــ جن کو آیت کے آخری لفظ (فاصلہ) نے دوسری آیت سے جُدا کر رکھا ہے ـــــ ربط و تعلق کیونکر ضروری نہیں؟ اور اس بات کا دعویٰ آخر کس نے کیا ہے کہ آیات کے فواصل ان کو بالکل بے تعلق اور الگ تھلگ بنا دیتے ہیں؟ ہم مندرجہ ذیل آیات تلاوت کرتے ہیں:

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ	کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اونٹ کو کیسے پید
خُلِقَتْ ۔ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ	کیا گیا، اور آسمان کو کیسے بلند کیا گیا؟ اور
رُفِعَتْ ۔ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۔	پہاڑوں کو کس طرح نصب کیا گیا؟ اور زمین
وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ[۱]	کو کیسے بچھایا گیا؟

بظاہر ہمیں اُونٹ کے پیدا کرنے اور آسمان کے بلند کرنے میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اسی طرح پہاڑوں کے نصب کرنے آسمان کے بلند کرنے میں بھی بظاہر کوئی ربط موجود نہیں۔ زمین کا بچھانا پہاڑوں کو نصب کرنے سے بے تعلق ہے۔ اب یہاں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا فی الواقع ان میں کوئی وجہ جامع اور فکری رابطہ موجود نہیں؟

کیا کم از کم ان آیات میں یہ ربط موجود نہیں کہ ان میں مناظرِ فطرت کی تصویر کشی کی گئی ہے؟ تاکہ انسان جہاں بھی ہو ان کو دیکھے اور ان میں غور کرے۔ یہ تصویر ہی نظم و نسق بلند آسمان زمین کے فرش اُونچے پہاڑوں اور بلند کوہان والے اُونٹوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے[۲]

زرکشی کا بیان اس ضمن میں قابلِ ملاحظہ ہے فرماتے ہیں:

---

۱ سورۃ الغاشیہ آیت ۱۷-۲۰

۲ ظلال القرآن، ج ۳۰۔ ص ۱۴۹

"ان تمام باتوں کو بدوی عربوں کے حسب عادت یکجا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے معاشی امور کا انحصار اونٹ پر تھا۔ اور اس لیے اونٹ ان کی توجہات کا مرکز و محور رہا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اونٹ سے فائدہ اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ وہ کھائے پیئے۔ اور کھانے پینے کا انحصار بارش پر ہے۔ جب بارش کے انتظار میں وہ اوپر کو دیکھیں گے تو لامحالہ ان کو آسمان دکھائی دے گا۔ پھر انہیں رہنے کے لیے ایک ٹھکانے کی ضرورت ہے۔ اور اس ضمن میں پہاڑوں سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہو سکتی ہے؟ چونکہ وہ زیادہ دیر تک ایک جگہ سکونت گزین نہیں رہ سکتے اس لیے انہیں نقل مکانی کی شدید ضرورت ہے۔ جب ایک بدوی شخص غور و فکر سے کام لے گا۔ تو وہ ان تمام اشیاء کو اپنی نگاہِ تصور میں موجود پائے گا [1]"

ہم یہ آیت تلاوت کرتے ہیں:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ [2]	قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت میں نہ لائیے۔

اس کے پہلے یہ آیت ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ [3]	انسان اپنے آپ سے خوب آگاہ ہے اگرچہ وہ عذر پیش کر رہا ہو۔

اس کے بعد یہ آیات ہیں:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔ [4]	ہرگز نہیں بلکہ تم دنیا کو چاہتے اور آخرت کو ترک کرتے ہو۔

بظاہر ہمیں ان آیات میں ربط کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

---

[1] البرهان، ج ۱۔ ص ۴۵۔
[2] سورۃ القیامۃ۔ آیت ۱۶۔
[3] سورۃ القیامۃ۔ آیت ۱۴-۱۵۔
[4] سورۃ القیامۃ۔ آیت ۲۰-۲۱۔

گر غور کرنے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ دنیا کو "عاجلہ" کہہ کر اس جانب اشارہ کیا کہ انسانی زندگی نہایت محدود ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضورؐ جلدی جلدی زبان ہلا کر اولین فرصت میں وحی کو حفظ و اخذ کرنے کے متمنّی رہتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

"وحی میں غور و فکر سے کام لیجیے اور عام انسانوں کی طرح اس محدود زندگی میں عجلت پسندی کا ثبوت نہ دیجیے"[1]

مذکورہ صدر بیان سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ کہ مندرجہ ذیل دو آیتوں کے درمیانی ربط و مناسبت کی جو وجہ علاّمہ زمخشری نے بیان کی ہے وہ درست ہے۔

ایک آیت یہ ہے:

كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا	جس طرح تمہارے والدین کو جنت سے نکال دیا اور ان کا لباس بھی اتار دیا۔

اس کے آگے یہ آیت ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ	اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اُتارا جو تمہاری برہنگی کو ڈھانپتا ہے اور باعثِ زینت بھی ہے مگر تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔

علاّمہ زمخشری اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حضرت آدم و حوّا کے برہنہ ہونے اور

[1] اس مقام پر علاّمہ زمخشری کے بلند پایہ ادبی ذوق کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ مذکورہ صدر آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کشاف، ج ۴۔ ص ۱۶۵ پر لکھتے ہیں "کلّا" کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جلد بازی سے منع کرکے آہستہ روی اور اعتدال پسندی کی تلقین کی گئی ہے پھر "تحبّون العاجلۃ" کہہ کر اس میں مزید زور پیدا کیا گویا یوں فرمایا "اے بنی نوع انسان! عجلت پسندی کا مادہ تمہاری فطرت میں رکھا گیا ہے۔ اس لیے تم ہر بات میں جلد بازی کو پسند کرتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم جلد آنے والی (دنیا) کو چاہتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔"

[2] سورۃ الاعراف آیت ۲۶۔

بدن پر سے لپیٹنے کا ذکر کیا اور پھر اظہار منت کے طور پر لباس پیدا کرنے کا ذکر کیا۔ کیونکہ عریانی و برہنگی میں ذلت و رسوائی پائی جاتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ستر پوشی تقویٰ کے ابواب میں سے ایک عظیم باب ہے[۱]

تنظیر کا وجوہ ربط میں سے ہونا:

یہ بات درست ہے کہ تنظیر (ایک نظیر کا دوسرے نظیر کے ساتھ الحاق) بھی ربط و تناسب کی ایک ادبی قسم ہے مثلاً یہ آیت:

كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِٱلْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ لَكَٰرِهُونَ ۔[۲]

اس سے پہلے یہ آیت ہے:

أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَٰتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۔[۳]

ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے اصحاب کی ناپسندیدگی کے باوجود مجاہدین کو انعام دینے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ جس طرح صحابہ کی کراہت کے باوجود آپ تجارتی قافلہ کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے۔ ان دونوں آیتوں میں مجاہدین کو انعام دینے کی ناپسندیدگی کو خروج للجہاد کی نفرت و حقارت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے[۴]

ربط آیات کی پہچان کے لیے ادبی ذوق سے کام لینے کی ضرورت:

قرآنی آیات کے باہمی تناسب و توافق کو معلوم کرنے کے لیے گاہے ادبی ذوق کو کام میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے اور گاہے فطری فہم و شعور کو۔ اسی کے نتیجہ میں عام یا خاص ذہنی یا خارجی یا عقلی حسی اور خیالی ربط تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ فی نفسہ وہاں ملولہ اصطلاحی یا فلسفی کا وجود عنقا ہوتا ہے۔

---

[۱] تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۵۹ نیز البرھان، ج ۱، ص ۴۹۔ [۲] سورۃ الانفال آیت ۵۔

[۳] سورۃ الانفال۔ آیت ۴۔ [۴] تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۱۱۴۔

اکثر دفعہ آیات کے درمیان اسی قسم کا تلازم پایا جاتا ہے جیسے علّت و معلول ہیں۔ اگر ایک آیت دوسری کو مستلزم نہ بھی ہو تو ان میں تقابلِ تضاد (وہ تقابل جو ضدّین کے درمیان ہوتا ہے) ضرور پایا جاتا ہے۔ مثلاً عذاب کا ذکر کرنے کے بعد رحمت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یا پہلے دوزخ کا حال بیان کر کے جنت کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ یا پہلے عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اور پھر دل کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ اور احکام بیان کرنے کے بعد پند و موعظت کا درس دیا جاتا ہے۔

سُورتوں کے مابین ربط و تعلق کا غموض و خفاء:

اسی فطری صلاحیت و استعداد کے پیش نظر ــــــ جس کی مدد سے آیات کا باہمی ربط بڑی عمدگی اور آسانی سے معلوم کر لیا جاتا ہے ــــــ ہمارا خیال ہے کہ سورتوں کے درمیان تناسب و توافق کے مواقع بہت کم ہیں اور ان میں اکثر غموض و خفاء پایا جاتا ہے اگر ابو جعفر بن زبیر کی کتاب "البرھان فی مناسبۃ ترتیب سُوَر القرآن" ہمارے ہاتھ لگتی تو ہم اس غموض کے نمونے بچشم خود دیکھ لیتے۔ ربطِ سُوَر کی جانب مفسرین کی بے توجہی صرف اس لیے نہ تھی کہ یہ بڑا دقیق کام ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں افادیت کم اور تکلف زیادہ ہے۔ چنانچہ مفسرین کا یہ حال ہے کہ دو سورتوں کے درمیان ربط تلاش کرتے کرتے وہ تھک ہار جاتے ہیں اور ان کا دم نکلنے لگتا ہے۔ تب کہیں جا کر دو سورتوں کے مابین ان کو ملتے جلتے دو لفظ یا دو آئیں مل جاتی ہیں۔ خواہ وہ دونوں سورتوں کے آغاز میں ہوں یا انجام اور وسط میں۔

ربطِ سُوَر کے چند نمونے:

قرآنی سورتوں کے درمیان ربط کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

قائلین ربطِ سُوَر کا خیال ہے کہ سورۂ فاتحہ کا اختتام "اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ"[1] پر اور سورۂ بقرہ کا آغاز "الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ" سے کیا گیا۔ ان کے درمیان ربط

---

[1] سورۃ الفاتحہ، آیت ۶

کی صورت یہ ہے کہ جب بندوں نے صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی چاہی تو انہیں کہا گیا کہ سیدھی راہ میری کتاب ہے[۱]

۲۔ سورۃ فاطر کا افتتاح حمد سے کیا گیا۔ اس سے ماقبل جو سورت ہے اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوا:

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ[۲]

آغاز و انجام کا ربط ظاہر ہے۔

۳۔ سورۃ الاسراء کا آغاز "سُبحان" سے کیا گیا۔ اسی طرح سورۃ الکہف کو بھی "الحمد" سے شروع کیا گیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان یہی مناسبت ہے۔ کیونکہ تسبیح ہمیشہ تحمید سے مقدم ہوتی ہے[۳]

۴۔ سورۃ الکوثر، سورۃ الماعون کی حریف مقابل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے سورۃ الماعون کے بعد لایا گیا ہے۔ سورۃ الماعون میں منافقین کے چار اخلاقِ قبیحہ بیان کیے گئے ہیں (۱) بخل (۲) ترکِ صلوٰۃ (۳) ریاکاری (۴) ترکِ زکوٰۃ۔

سورۃ الکوثر میں بخل کے مقابلہ میں "الکوثر" (خیرِ کثیر) ذکر کیا۔ ترکِ صلوٰۃ کے مقابلہ میں "فَصَلِّ" فرمایا۔ ریاکاری کے مقابلہ میں "لِرَبِّکَ" ارشاد ہوا۔ یعنی خدا کے لیے نماز پڑھیے لوگوں کے لیے نہیں۔ "منع الماعون" (معمولی اشیاء نہ دینے) کے مقابلہ میں فرمایا "وَانْحَرْ" اس سے مراد یہ ہے کہ قربانیوں کا گوشت صدقہ کیجیے[۴]

اخفش نے سورہ "لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ" اور سورۃ الفیل کے ربط میں بڑے تکلف سے کام لیا ہے۔ اس کے نزدیک ان دونوں سورتوں کا باہمی ربط مذکورہ ذیل آیت:

---

[۱] البرہان، ج ۱۔ ص ۳۸۔
[۲] سورۂ سبا آیت ۵۴۔
[۳] البرہان، ج ۱۔ ص ۳۹۔
[۴] حوالہ مذکورہ۔

فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا[1]
آلِ فرعون نے اس (موسیٰؑ) کو اٹھا لیا تاکہ آخر کار وہ ان کا دشمن اور حزن (ملال) کا باعث ہو۔

کے قبیل سے ہے۔ یعنی جس طرح بچپن میں حضرت موسیٰ کو اٹھانے کا انجام یہ ہوا کہ وہ آل فرعون کے لیے غم و حزن کا باعث ثابت ہوئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کی شرارت آمیز تدبیر کو قریش کی مانوسیت کا سبب قرار دیا[2]

خلاصہ یہ کہ آیتوں اور سورتوں کے درمیان ربط و تناسب کی تلاش میں کس قدر بھی تکلف سے کام لیا گیا ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ اہل تحقیق مفسرین کی سعی و کاوش ہر حال میں بارآور ثابت ہوئی۔ انہوں نے تکلف سے بدطرف رہ کر قارئین کے قلب و ذہن میں یہ بات اتار دی کہ جو قرآن بیس سال سے زائد عرصہ میں مختلف اسباب و احکام کے سلسلہ میں نازل ہوتا رہا تھا۔ اس کی ہر سورت کی آیات میں مکمل ربط و تناسب پایا جاتا ہے۔ اکثر جگہوں میں یہ تناسق و تطابق اتنا گہرا ہے کہ وہاں اسباب نزول کے تلاش کرنے کی مطلقاً حاجت نہیں۔ اور اس کی فنی ترتیب و تہذیب اس کے تاریخی واقعات کا نعم البدل ثابت ہوئی ہے۔ پھر ایک سو ۱۱۴ چودہ سورتیں اپنی با ترتیب آیات کے جلو میں یوں نمودار ہوئیں گویا وہ زمانہ کے گلے میں ایک خوبصورت ہار ہیں۔

قرآن کا فنی نظم و نسق:

قرآن فنی نظم و نسق کا سب کتب سے زیادہ خواہاں ہے۔ ہمارے علمائے محققین قرآنی نظم و ترتیب کے اسرار و رموز کو معلوم کرنے کے سب سے زیادہ شائق تھے۔ اگر آیات کا سبب نزول معلوم نہ ہو یا معلوم ہو مگر یاد نہ ہو یا یاد ہو مگر مشہور نہ ہو تو آیات کی باہمی مناسبت ان کا نعم البدل ہے۔ بعض اوقات آیات کے وجوہِ مناسبت سے ان کے اسبابِ نزول کا پتہ چل جاتا ہے آیات کے باہمی ارتباط و اتصال میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ اور ان کا اسلوب و انداز

[1] سورۃ القصص آیت ۸۔
[2] البرھان، ج ۱ - ص ۳۸۔

رواں دواں ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نظم و نسق کئی طرح کا ہوتا ہے۔ اور یہ سب قسمیں ربطِ آیات کے علم میں جمع ہو جاتی ہیں۔

ربطِ آیات کے علاوہ قرآن میں اور بھی کئی طرح کا تناسق و توافق پایا جاتا ہے جو اسباب نزول معلوم ہونے کی صورت میں ان کا بدل قرار پاتا ہے۔ یا اس کے صُوَر و اشکال اس کے زندہ مشاہد و مناظر اور کثیر نظائر و امثلہ سے ربط کے مفہوم میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔

نظم و ترتیب کے ان جدید اور مرتب انواع و الوان کی جھلک قرآن کے تین مقامات پر دیکھی جا سکتی ہے:

۱۔ ان آیات میں جن کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ وہ اسباب نزول کے علاوہ دیگر امور کی جانب متعدی ہیں۔

۲۔ ایسی جگہ جہاں کسی آیت کا سبب نزول خاص ہو مگر اس کے معنی و مفہوم کو عام رکھا جائے۔

۳۔ جن آیات کا تعلق ایسے انسانی اخلاق کے ساتھ ہو جو زمان و مکان اور اسباب و مناسبات کی حدود میں محدود نہ ہوں۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیاتِ ظہار حضرت اوسؓ بن صامت کے بارے میں نازل ہوئیں۔ اوس نے اپنی بیوی سے ظہار کر کے اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ آیات میں صراحتہً بیان کیا گیا ہے کہ ظہار کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا یا مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ پھر اسی قسم کا واقعہ سلمہ بن صخرؓ کو پیش آیا۔ چنانچہ اس نے بھی اپنی بیوی سے ظہار کیا۔ حتیٰ کہ ماہِ رمضان گزر گیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ضمن میں سوال کیا تو آپ نے وہی فتویٰ دیا جو اوس کے بارے میں قبل ازیں نازل ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ سلمہ کا واقعہ آیاتِ ظہار کا سببِ نزول نہ تھا۔ بلکہ یہ آیات اوس کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔ تاہم علماء ان آیات کو اصلی سبب سے ہٹا کر دوسرے سبب کی طرف متعدی کر کے مجازاً کہہ دیا کرتے ہیں کہ آیاتِ ظہار سلمہ بن صخر[۱] کے بارے میں نازل ہوئیں۔

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج ۴ - ص ۳۱۸ - ۳۲۲ -

جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی کی گئی تو اس موقعہ پر حدِ قذف[1] سے متعلق حکم نازل ہوا۔ بہتان میں حصہ لینے والے ڈھکے چھپے آدمی نہ تھے۔ مگر حدِ قذف سے متعلق آیات میں الفاظ عام استعمال کیے گئے۔ اس لیے کہ ام المومنین کو متہم کرنا عدد درجہ کا قبیح فعل تھا۔ جو شخص کسی قوم کی والدہ پر بہتان لگاتا ہے۔ گویا وہ پوری قوم کو متہم کرتا ہے۔ اس لیے آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ[2] جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں۔

عموم لفظ کا اعتبار ہے خصوص سبب کا نہیں:

آیات کو اسباب نزول کے علاوہ دیگر امور کی جانب منسوب کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہور علماء اس نظریہ کا اظہار کرنے لگے کہ لوگوں کے الفاظ کے عموم کو دیکھنا چاہیے۔ سبب کی خصوصیت کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جو نصِ قرآنی عام ہو مگر کسی خاص سبب کے پیش نظر نازل ہوئی ہو۔ وہ سبب اور غیر سبب سب کے افراد کو شامل ہو گی۔ اس لیے کہ قرآنی عمومات کو شخص معین تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی رائے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اگرچہ لوگوں نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ جو عام الفاظ کسی خاص سبب کی بناء پر وارد ہوئے ہوں آیا اپنے سبب کے ساتھ مختص ہوں گے؟ کسی شخص نے بھی یہ بات نہیں کہی کہ کتاب و سنت کے عمومات کسی خاص شخص کے ساتھ مخصوص ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ الفاظ اس شخص کی نوع کے ساتھ مختص ہوں گے۔ اور اس کے ساتھ ملتے جلتے اشخاص کو بھی شامل ہوں گے۔ ان میں جو عموم ہو گا وہ الفاظ اس شخص کی نوع کے ساتھ مختص

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۱۸-۳۲۲۔
[2] سورۃ النور، آیت ۷، ۹۔ [3] سورۃ النور، آیت ۴۔

جس آیت کا کوئی خاص سبب ہو اگر وہ امر یا نہی ہو تو وہ اس شخص کو بھی شامل ہو گی جس کے حق میں اتری۔ اور دوسروں کو بھی جو اس جیسے ہوں[1]۔

اس کی مثال یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے پر مدینہ میں نفاق کی جو تحریک اٹھی تھی اس نے اسلامی تاریخ کے رُخ کو موڑنے میں اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ اس تحریک نے آغاز ہجرت سے لے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات تک کئی رنگ بدلے۔ اس لیے یہ ایک فطری بات تھی کہ قرآن نے متعدد سورۃ و آیات میں اس تحریک اور منافقین کی دسیسہ کاریوں اور بے بنیاد افواہوں پر کاری ضرب لگائی۔ اس کی حد یہ ہے کہ ان منافقوں کے نام سے ایک اسم با مسمیٰ پوری سورت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

اس سورت کی آیات میں منافقین کی نہایت ذلت آمیز اور رسواکن تصویر کھینچی گئی ہے۔ کہیں ان کو پلید اور رغبی قرار دیا گیا ہے۔ اور کہیں دیوار پر آویزاں تصویر کی طرح ساکت و صامت اور بے حس و حرکت کہا گیا ہے۔ بعض جگہ ان کی بزدلی کی منظر کشی یوں کی گئی ہے کہ گویا وہ چوہے ہیں جو نہی کوئی آواز سنی یا کھٹکا ہوا یا کوئی چیز ہلی تو فوراً بل میں گھس گئے۔ حالانکہ بظاہر وہ بڑے تن و توش کے مالک فربہ اندام نظر آتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل آیت کے یکتا دیدہ آفرین اور معجزانہ اندازِ بیان پر غور کیجیے۔

وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ	اور جب تو ان کو دیکھے تو ان کا جسم آپ کو
وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ	بہت متاثر کرے گا اور اگر کوئی بات کہیں تو
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ[2]	تو آپ ان کی بات سنیں گے گویا وہ لکڑیاں ہیں جن سے ٹیک لگائی گئی ہے)

---

[1] الاتقان، ج ۱۔ ص ۵۱۔

[2] سورۃ المنافقون آیت ۴۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۴۔ ص ۳۶۸ پر فرماتے ہیں "منافق بڑے حسین جمیل اور فصیح و بلیغ تھے۔ سامع ان کی بات سن کر بڑا متاثر ہوتا تھا"

یہ بات کسی طرح قرین عقل و دانش نہیں کہ ان آیات میں صرف قبیلہ اوس و خزرج کے منافقین کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو عہد رسالت میں موجود تھے اور پھر ختم ہو گئے۔ جب قرآن منافقین کے اس گروہ کو قصداً و بالذات مراد لیتا اور ان کے اخلاق قبیحہ کی تصویر کھینچتا ہے۔ تو آخر اس میں کون سا مانع درپیش ہے کہ آیت کو ایک عمومی عبرت پر محمول کیا جائے؟ اور اس کو ان لوگوں کے لیے دائمی نمونہ قرار دیا جائے جو گزر چکے اور جو تا قیام قیامت آنے والے ہیں[1] خصوصاً جب کہ بعض مفسرین نے کہا بھی ہے کہ اس سے اوس و خزرج کے منافق اور ان جیسے لوگ مراد ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ابن عباسؓ اور ابوالعالیہ حسن قتادہ و سُدّی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت خاص طور پر اوس و خزرج کے منافقین کے بارے نازل ہوئی۔

آغاز اسلام میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات جو غزوات پیش آئے ان میں داخلی دشمنوں سے کنارہ کش رہنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا خارجی اعداء سے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ سورۃ النساء میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے زمرہ میں ایسے لوگ شامل تھے۔ جو بظاہر ان سے ملتے جلتے تھے۔ ان کا کام اسلامی لڑائیوں میں صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کی ہمت پست کریں اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کی افواہیں پھیلائیں ان کو جب غزوات میں شمولیت کی دعوت دی جاتی تو اس سے گریز کرتے اور مستقبل کی ٹوہ میں لگے رہتے کہ آیا تاریک ہے یا درخشاں؟

جب مسلم مجاہدین کسی ابتلاء سے دوچار ہوتے تو یہ جنگ میں شامل نہ ہونے پر بغلیں بجاتے پھرتے اور اس بات پر خوشی کے ترانے گاتے کہ شکست اور پکڑ دھکڑ سے بچ نکلے۔ جب مجاہدین فاتحانہ شان سے لوٹتے تو منافقین حسرت و ندامت کا اظہار کرنے لگتے۔ اور اس بات کے آرزو مند

---

[1] تفسیر المنار، ج ۱ - ص ۱۴۸-۱۴۹ - یہ تفسیر صاحب المنار نے سورہ بقرہ کی آیت، ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ﴾ کی تشریح کرتے ہوئے تحریر کی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ۱ - ص ۳۰ -

[3] تفسیر ابن کثیر ج ۱ - ص ۴۸

ہوتے کہ کاش وہ بھی اسلامی فوج میں شامل ہوتے تو مالِ غنیمت سے حصّہ پاتے۔

مندرجہ ذیل آیات میں اس فنی تصویر کی ایک جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے ارشاد فرمایا:۔

"تم میں وہ شخص بھی شامل ہے جو دوسروں کی ہمت پست کرتا ہے۔ اگر تم کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہو تو وہ کہتا ہے کہ خدا کا مجھ پر بڑا احسان ہوا کہ میں تمہارے ساتھ شامل نہ تھا۔ اگر تم پر عنایت ربانی ہوتی ہے تو یوں سمجھتا ہے کہ گویا اسے تمہارے ساتھ محبت کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے اے کاش! میں ان کے ساتھ شامل ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا"[1]

مگر قرآن نے منافقین کی نفسانی حالت کی منظر کشی کے لیے جب ان دو مختصر آیتوں کو چنا تو اس کا اشارہ چند مخصوص ضعیف الایمان اشخاص کی طرف نہ تھا جو عہد رسالت میں کسی خاص معرکہ میں شریک ہوئے۔ اگرچہ بعض مفسرین مثلاً مجاہد قتادہ اور دیگر تابعین کی رائے یہی ہے بلکہ قرآن نے اپنے انوکھے اور نرالے اسلوب بیان میں لوگوں کے ایک گروہ کی ایسی تصویر کھینچی ہے۔ جو ہر زمان و مکان میں دہرائی جاتی ہے اور جو اقوام و ازمنہ کے محدود دائرہ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ ابن جریج نے مذکورہ صدر دونوں آیتوں کی تفسیر میں جو کچھ کہا ہے اس کا لبِ لباب یہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ آیتیں منافق کے حال پر روشنی ڈالتی ہیں جو مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے باز رکھنے کے لیے مصروفِ جہد و سعی ہوتا ہے۔ جب مسلمان کسی لڑائی میں شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ جب اہل اسلام فتح یاب ہوتے ہیں تو وہ حسد و بغض کا اظہار کرنے لگتا ہے"[2]

---

[1] سورۃ النساء، آیت ۷۲-۷۳۔ [2] تفسیر طبری ج ۵- ص ۱۰۵-

[3] امام ابن جریر طبری کا زاویۂ نگاہ بھی یہی ہے، دیکھیے تفسیر طبری، ج ۵- ص ۱۰۵-

ہم دوسری سورتوں اور آیتوں کو بھی مذکورہ صدر بیان پر قیاس کر سکتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الہمزۃ کے آغاز کو دیکھیے۔ اس میں ایک حقیر اور کمینہ شخص کے عادات و اطوار پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ ایک زبان دراز گستاخ شخص ہے اس کا کام لوگوں پر نکتہ چینی کرنا ان کے عیب شمار کرنا اور ان کا مذاق اڑانا ہے۔ یہ کم تولنے کا عادی ہے۔ لوگوں کی ناموس وآبرو کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کی معراج یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کی جائے۔ اس کا خیال ہے کہ جب ہر چیز فنا سے ہمکنار ہو جائے گی تو دولت و ثروت اسے ابدی زندگی بخشے گی۔ یہ سورت فردِ واحد سے مختص نہیں بلکہ ہر کمینہ اور ذلیل منش انسان پر منطبق ہو سکتی ہے۔

بعض مفسرین نے سورۃ الہمزہ کے دائرہ کو اخنس بن شریق[1] نامی شخص تک محدود کر دیا ہے علامہ زمخشری دانشگاف الفاظ میں ان کی تردید کرتے اور کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سورت کا سببِ نزول خاص ہو مگر جس وعید کو یہ شامل ہے وہ عام ہو۔ تاکہ ہر وہ شخص اس سورت کا مصداق ہو جو بھی اس قسم کے قبائح کا ارتکاب کرتا ہے۔ اگرچہ سورت کے ورود و نزول کا سبب کوئی خاص شخص ہو مگر جب نام لیے بغیر تعریض کے طور پر اس کی مذمت کی جائے گی تو یہ اس کے حق میں زیادہ مؤثر ثابت ہو گی[2]

امام زرکشی خصوصِ سبب اور عمومِ صیغہ کی ایک فصل باندھ کر اس میں رقم طراز ہیں:-

"بعض اوقات کسی آیت یا سورت کا سببِ نزول خاص ہوتا ہے۔ مگر اس کے الفاظ عام ہوتے ہیں۔ تاکہ اس بات سے آگاہ کیا جائے کہ اعتبار عمومِ الفاظ کا

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۴۔ ص ۵۴۸۔ علامہ زمخشری نے اس ضمن میں نہایت کمزور الفاظ میں چند نام اور بھی ذکر کیے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اُمیہ بن خلف کے بارے میں اتری۔ اور بعض کے نزدیک ولید بن مغیرہ کے بارے میں" (کشاف، ج ۴۔ ص ۲۳۲)

[2] کشاف، ج ۴۔ ص ۲۳۲۔

ہونا ہے خصوصِ سبب کا نہیں۔ پھر وہ زمخشری کے قول سے اس ضمن میں احتجاج کرتے ہیں۔[1]

علاوہ ازیں قرآن کریم میں جن مثالی اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے ان کا براہِ راست اور اولین تعلق اگرچہ خاص اور متعین اشخاص سے ہے۔ مگر یہ امور ہر معاشرہ اور سوسائٹی میں دہرائے جاتے اور ہر ماحول میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں کچھ ایسے مثالی انسانوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن کو مفسرین سد با سائی کے باوجود متعین نہیں کر سکتے۔ اور یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس لیے کہ قرآن میں ان کا ذکر زمان و مکان اور اشخاص کی حدود سے بالا ہو کر کیا گیا ہے۔ ایسی آیات ابتداءً بلا اسباب و مقدمات اور حاصر و محصور کی پابندی کے بغیر نازل ہوئی ہیں۔ گویا یہ ایک فنی چارٹ ہے جس میں وحدتِ جنسِ انسانی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یا جنسِ انسانی کے ایسے افراد کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یگانہ خصوصیات کے حامل ہیں۔

آیت قرآنی :۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ۔	جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ پہلو کے بل بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہو کر ہمیں پکارتا ہے جب ہم اس کی تکلیف کو رفع کر دیتے ہیں تو یوں چلا جاتا ہے گویا اس نے کسی تکلیف کے ازالہ کے لیے ہمیں پکارا ہی نہیں۔

کی تفسیر میں مفسرین جو چاہیں کہیں مگر وہ یہ بتانے سے قاصر رہیں گے کہ اس آیت میں کس متعین شخص کی زندۂ جاوید اور یگانہ تصویر کھینچی گئی ہے۔ میرے خیال میں اس آیت کی تفسیر میں سب سے بہتر

---

[1] البرہان، ج ۱۔ ص ۳۲۔

[2] التصویر الفنی فی القرآن ص ۸، طبع ثانی۔ اس کتاب کی فصل "نماذج انسانیۃ" قابل مطالعہ ہے یہ فصل قرآن کی فصاحت و بلاغت کے ضمن میں بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

خیالات کا اظہار ہمارے معاصر عزیز مشہور اسلامی مصنف سید قطب[1] شہید صاحب تفسیر "ظلال القرآن" نے کیا ہے۔

سید قطبؒ فرماتے ہیں :

"درحقیقت انسان ایسا ہی ہے۔ جب حوادث کی لپیٹ میں آتا ہے اور اس کی قوت جواب دے جاتی ہے تو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے خداوند جبار و قہار کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی پناہ میں آتا ہے۔ جب تکلیف دور ہو جاتی ہے موانع کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس کی قوت و شوکت لوٹ آتی ہے۔ اور زندگی کے دواعی و محرکات اس میں دوڑنے لگتے ہیں۔ اس کی دعا قبولیت سے آراستہ ہو جاتی ہے۔ تو پیٹھ پھیر کر یوں چل دیتا ہے گویا اس نے ازالہ مشکلات کے لیے خدا کو کبھی پکارا ہی نہ تھا"

انسانی اخلاق و خصائل کی تصاویر اسی طرح متعدد و متنوع ہیں جس طرح کہ خود انسان چنانچہ انسان پاکباز بھی ہیں اور خبیث النفس بھی۔ بلند پایہ بھی ہیں اور کمینے بھی، مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ جلد باز بھی ہیں اور بادقار بھی۔ امین بھی ہیں اور خیانت کار بھی۔ دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ عالم بھی ہیں اور جاہل بھی، قرآن میں ان سب کی تصویریں اسی طرح بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ جس طرح انسانی معاشرہ اور ماحول میں ایسے انسان ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں۔

اگر ہم اس مقام پر قرآن کے ادبی پہلو پر بحث کرنے کے خواہاں ہوتے تو قرآن کی روشنی میں ہم انسانی اخلاق و خصائل کی پوری رُوداد پیش کرتے۔ مگر ہمارا مقصد یہاں عالمانہ انداز سے اسباب النزول کی تفصیلات بیان کرنا ہے نہ کہ ادبا کی طرح قرآن کی ادبی خصوصیات گنوانا۔ چنانچہ جن آیات کے اسباب نزول تک ہمیں رسائی حاصل نہیں ہوئی۔ ہم ان کے

[1] سید قطب اخوان المسلمون مصر کے مشہور رہنما تھے۔ مصر کے صدر ناصر نے جب اخوان پر مظالم ڈھائے تو موصوف کو کسی گناہ کے بغیر پھانسی پر لٹکا دیا تھا رحمہ اللہ غفرلہ (غلام احمد حریری)

بارے میں اس لحاظ سے مطمئن ہیں کہ ہر زمان و مکان میں جو لوگ زندہ موجود ہیں وہ خود ان آیات کی عملی تفسیر و تصویر ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کے واقعات ہی سے آیات کی توضیح کا کام لیا جائے۔ اس لیے کہ جس چیز پر اعتماد و اعتبار کیا جاتا ہے وہ ابدی اور دائمی زندگی ہے نہ کہ موجودہ زندگی کی کہانی۔

فصل سوم

مکی اور مدنی سورتیں

بعثت سے قبل آنحضورؐ کی عمر:

مشرف برسالت ہونے سے قبل سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر کا ایک حصہ گزارا جس میں کتابِ مقدس اور ایمان کی حقیقت سے آشنا نہ تھے۔ پھر آپ کو رسالت و نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ انبیائے سابقین کی طرح آپ کو چالیس سال کی عمر میں یہ شرف عطا ہوا تاکہ آپ میں فکر و نظر کی پختگی عزمِ صادق قوتِ ارادی جرأت و جلادت وسعتِ تجربہ اور ثباتِ قلب کے اوصافِ جلیلہ پیدا ہو جائیں۔

بعض مفسرین نے قرآنی نصوص سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر قبل از بعثت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے مگر تلاشِ بسیار کے بعد ان کو صرف ایک آیت مل سکی ہے کہ:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ - [1] — میں اس سے پہلے بھی عمر بھر تمہارے اندر رہا ہوں۔

اس آیت سے مفسرین نے یہ سمجھا کہ لفظ "عمر" کا اطلاق ہمیشہ چالیس سال پر کیا جاتا ہے[2] اس قسم کی عاجلانہ تفسیر بیان کر کے انھوں نے تاریخی حقائق کو لغوی مفہوم کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے۔

مفسرین نے جس قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی ہے عمر کے لفظ میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں۔ بلکہ اس کے لغوی مدلول و مفہوم میں صراحتہً کسی عدد کا ذکر ہی نہیں پایا جاتا۔ البتہ یہ ممکن

---

[1] سورۂ یونس آیت ۱۰۔ [2] تفسیر طبری ج ا ص ۲۶۸ - ۱۱ - ۹ بروایت قتادہ۔

ہے کہ سیاق عبارت یا تاریخی حقائق عدد کی جانب کوئی خفیف سا اشارہ کرنے میں مدد دیتے ہوں مفسرین میں سے جس نے قطع و جزم کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ چالیس سال اور "عمرًا من قبلہ" کے الفاظ باہم مترادف ہیں۔ اس نے سیرتِ مطہرہ کے واقعات کو پڑھا اور پھر قرآنی عبارت کو ان واقعات پر منطبق کر دیا ہے۔

مستشرقین کے شکوک و شبہات:

مستشرقین نے اس آیت کی تفسیر میں جو شکوک و شبہات پیدا کیے ہیں اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔

۱۔ یا تو دیدہ دانستہ انہوں نے یہ شکوک ازرہِ تعصّب پیدا کیے ہیں۔

۲۔ یا یہ اعتراضات ان کی جہالت و بلادت کے آئینہ دار ہیں۔

مستشرقین نے دعویٰ کیا ہے کہ کوئی محقق یقینی طور پر بیان نہیں کر سکتا کہ آغازِ وحی کے وقت آپ کی عمر کیا تھی[1] بعض مستشرقین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس ضمن میں وارد شدہ روایات میں اضطراب و تناقض پایا جاتا ہے[2]۔ بعض نے یوں کہا ہے کہ عرب اور اکثر سامی لوگوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ چالیسؔ کے عدد میں بڑے باریک سحری خصائص پائے جاتے ہیں[3]۔ مستشرقین کا مغالطہ اگر علم و بصیرت پر مبنی ہے تو اضطراب روایات کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ کیونکہ تعددِ روایات سے اضطراب لازم نہیں آتا۔ روایات میں تناقض اس وقت پایا جاتا ہے جب وہ مساوی درجہ کی ہوں اور ان میں ترجیح کا کوئی امکان نہ ہو۔ جیسا کہ نقادِ حدیث نے اپنی اصطلاحات میں ذکر کیا ہے[4]۔ جب ایک روایت کو دوسری کے مقابلہ میں ترجیح

---

[1] دیکھیے مقدمہ ترجمۃ القرآن از بلاشیر (BLACHERE)

[2] مقالہ پادری لامنس (LAMMENS) در ایشیاٹک جرنل سنہ ۱۹۱۱ء۔

[3] بلاشیر نے یہ بات دو مقالوں کے حوالہ سے لکھی ہے جو جرمنی کے ایک رسالہ میں شائع ہوئے تھے۔ پہلا مقالہ RONIG نے لکھا تھا جو رسالہ مذکور کی مجلد ۱۶ میں چھپا تھا دوسرا ریشر (RESCHER) نے تحریر کیا تھا۔ وہ مجلد نمبر ۵ میں شائع ہوا۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

حاصل ہو تو وہاں تناقض کا کوئی امکان نہیں۔ مورخین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے بارے[۱] میں دسیوں روایات کیوں نہ لکھیں اس ضمن میں مشہور تر رائے وہی ہو گی جو مقابلۃً زیادہ صحیح ہو۔ جیسا کہ محققین اہل تفسیر نے بیان کیا ہے[۲]۔

مستشرقین کی شعوری یا غیر شعوری جہالت اس وقت منظر عام پر آتی ہے۔ جب وہ سامیوں اور عربوں کے نزدیک جادو کے اسرار سے بھرپور ہندسے پر اپنی اصلی یا مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کہتے ہیں کہ وہ چالیس[۴۰] کا ہندسہ ہے۔ گاہے ساٹھ[۶۰] یا ستر[۷۰] کے بارے میں وہ یہی خیال کرتے ہیں[۳]۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ بعض اعداد میں فی الواقع مبالغہ پایا جاتا ہو۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ کے لیے اس کا عددی مفہوم باطل ہو کر رہ جائے خصوصاً جب کہ عددی مفہوم کی تائید تاریخی حقائق سے ہوتی ہو تو اس صورت میں لازماً خاص عدد ہی مراد لیا جائے گا۔

مذکورہ بالا حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ مستشرقین ——— جاہل ہوں یا متجاہل ——— کے اعتراضات کا منہ توڑ جواب دینا ہمارے لیے ازبس ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس[۴۰] سال کی عمر میں رسالت و نبوت سے نوازا یہ بات ہم اس لیے نہیں کہہ رہے کہ آیت میں "العمر" کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے بھی نہیں کہ سامی لوگ چالیس کے ہندسہ کو حامل اسرار بتاتے ہیں۔ بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ یہ بات ایسی روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے جو متواتر کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ عوام و خواص

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ۴ تدریب الراوی للسیوطی ص ۹۳ و توضیح الافکار للصنعانی ج ۲۔ ص ۷۴ نیز ہماری کتاب علوم الحدیث ص ۱۹۲۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ اس سلسلہ کی اہم روایات کے لیے دیکھیے الطبقات الکبریٰ لابن سعد قسم دوم، ج ۲۔ ص ۸۲

۲ تفسیر ابن کثیر، ج ۴۔ ص ۱۰۳۔ ابن کثیر نے مشہور رائے پر عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعثت کے وقت آپ کی عمر چالیس[۴۰] سال تھی۔ سعید بن المسیب کے نزدیک آپ تینتیس[۴۳] برس کے تھے پہلی رائے صحیح اور مشہور ہے

۳ ہم حروف سبعہ کی بحث میں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔

سب ان سے آگاہ ہیں۔ اور یہ روایات زمانہ قدیم و جدید میں زبان زد عام رہی ہیں۔

مستشرقین کا خبثِ باطن:

اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ آغازِ وحی کے وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے بارے میں شکوک و شبہات اس سلسلہ کی اولین کڑی ہیں کہ دعوت اسلامی کے نقطۂ آغاز ہی کو مشکوک ثابت کیا جائے۔ اس کے بعد شکوک پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بذریعہ وحی جو معلومات پہلے مکہ میں اور پھر مدینہ میں حاصل ہوئے ان کی قدر و قیمت کو گھٹایا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب آغاز وحی ہی کو مشکوک بنا دیا جائے تو کسی محقق کے لیے اس بات کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے کہ وہ یکے بعد دیگرے نازل ہونے والی وحی پر غور و فکر کرے۔

جب ہم آغاز وحی کے سلسلہ میں پیدا کردہ ابہام و غموض کا ازالہ کر چکے۔ اور ہم نے تفصیلاً بتا دیا کہ بعثت کے وقت آپ کی عمر مبارک کتنی تھی۔ تو اب مناسب ہے کہ ہم نزول قرآن کے ساتھ قدم بقدم چلیں۔ اور اس راہ پر گام زن رہیں جو نزول قرآن کے ابتدائی متوسط اور آخری مراحل کے بارے میں علمائے محققین نے ہمارے لیے ہموار کر دی ہے۔ جس طرح قبل ازیں ہم وحی کے تحلیل و تجزیہ قرآن کے قسط وار نزول قرآن کی جمع و تدوین اور کتابت حروفِ سبعہ اسبابِ نزول اور وجوہِ ربط کی تفصیلات بیان کر چکے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ہمارے سابقین مفسرین نے اشخاصِ روایت اور متون و اسانید کے بارے میں حد درجہ تقویٰ سے کام لیا۔ قرآنی نظم و ربط اور فنی تناسق و تطابق کا خیال رکھا اور تاریخی حقائق کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا

مکی و مدنی سورتوں کی پہچان میں تاریخ و روایات کی اہمیت:

قرآنی علوم کا تقابل کرنے سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ مکی و مدنی سورتوں کی پہچان میں دیگر علوم القرآن کی نسبت نقد روایات تحقیق نصوص اور تاریخ صحیح کی طرف رجوع کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ بلکہ مکی و مدنی سورتوں کے فن میں اسباب نزول سے بھی زیادہ تاریخ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ اسباب نزول کا فن ایسی خاص جزئیات کو شامل ہوتا ہے

جو انفرادی و اجتماعی مواقع کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور ان قرآنی آیات کو شامل نہیں ہوتا جو ابتداءً بلا اسباب نازل ہوئی ہیں۔

بخلاف ازیں مکّی و مدنی سورتوں کا علم قرآن کریم کی تمام آیتوں اور سورتوں سے بحث کرتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کی ہر سورت مکّی ہو گی یا مدنی۔ پھر مکّی سورتوں میں کچھ مدنی آیات اور مدنی سورتوں میں مکّی آیات بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر قرآنی آیت کی ماہیت و حقیقت معروف ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے دائرہ کو چھوڑ کر دوسری آیات کے زمرہ میں شامل ہو جاتی ہے، تو علمائے محققین اس کو تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھتے اور اس بات کا حتمی فیصلہ کرتے ہیں کہ آیا وہ مکّی آیت ہے یا مدنی۔

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ مکّی و مدنی آیات و سُوَر کی پہچان کا علم درحقیقت اس اہتمامِ تبلیغ کا حامل ہے جو اس کی خاطر عمل میں لایا گیا ہے۔ دعوتِ اسلامی کے مراحل و ادوار سے بحث کرنے والے علماء ——— جو اسلامی دعوت کی حکیمانہ اور حالات و واقعات سے ہم آہنگ رفتار سے آشنائی حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ دعوت مکہ و مدینہ اور شہر و دیہات کے عربی ماحول سے کس قدر سازگار رہے۔ اور اس کا اندازِ تخاطب مومنین مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ کس طرز و انداز کا ہے ——— اسی علم کی شاہراہ پر گامزن رہ کر منزلِ مقصود کو پہنچے۔

اس علم کی مختلف اقسام:

ان وسیع معلومات کا حق ادا کرنے کے لیے اس علم کے مباحث کئی قسموں میں بٹ گئے چنانچہ یہ علم بہ یک وقت ترتیب زمانی بھی ہے، اور تحدیدِ مکانی بھی، ترتیب موضوع بھی ہے اور تعیین شخصی بھی۔ ہمارا خیال ہے کہ جب علماء کے مابین مکّی و مدنی کی تقسیم میں زمان و مکان یا اشخاص کی اساس پر اختلاف پیدا ہوا تو ان مختلف انواع و اقسام کا تصور ان کے ذہن میں موجود تھا۔

(۱) مکی = مکی سورت یا آیت وہ ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہو خواہ وہ ہجرت کے بعد کیوں نہ اتری ہو۔

(۲) مدنی = اس کے مقابلہ میں مدنی وہ ہے جو مدینہ میں اتری۔

اس تعریف میں مکان کا لحاظ کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے مکی و مدنی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

(۱) مکی = مکی سورت یا آیت وہ ہے جس میں اہل مکہ کو مخاطب کیا گیا ہو۔

(۲) مدنی = مدنی وہ ہے جس کے مخاطب اہل مدینہ ہوں۔

اس تعریف میں اشخاص کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جو علماء مشہور اصطلاح کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ مکی مدنی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

(۱) مکی = مکی سورت یا آیت وہ ہے جو ہجرت سے قبل نازل ہوتی ہو۔ خواہ مکہ میں نازل ہوئی ہو یا کسی اور جگہ۔

(۲) مدنی = مدنی وہ ہے جو ہجرت کے بعد اُتری ہو۔ اگرچہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہو۔

اس تعریف میں اسلامی دعوت کی ترتیبِ زمانی کا خیال رکھا گیا ہے۔

اگرچہ ہمارے نزدیک سب سے عمدہ تعریف یہ آخری ہے۔ مگر ہم قاری سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتے کہ تینوں تعریفوں میں مساوی طور پر زمان و مکان اور اشخاص کے عناصر کو پیش نظر رکھا گیا ہے[۱]۔ بلکہ ان میں ایک چوتھا عنصر بھی پایا جاتا ہے جو کسی صاحب بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اور وہ موضوع کا عنصر ہے۔

سورہ الممتحنہ کو دیکھیے جو شروع[۲] سے لے کر آخر تک مکان کے اعتبار سے مدینہ میں نازل

---

[۱] البرہان، ج ۱- ص ۱۸۷، نیز الاتقان، ج ۱- ص ۱۳-۱۴۔

[۲] اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت ابن ہشام ص ۱۶-۱۷ا یہ سورت اس وقت اتری جب حاطب بن ابی بلتعہ نے اپنا خط قریش مکہ کو دیا جس میں تحریر تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر حملہ آور ہونے والے

ہوئی۔ زمانی اعتبار سے وہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ اشخاص کو ملحوظ رکھیں تو اس کے مخاطب اہل مکہ ہیں۔ اس کا موضوع اہل ایمان کا تزکیۂ قلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو علماء نے ان سورتوں میں شامل کیا ہے جو مدینہ میں اتریں مگر بہ حکم کے اعتبارات مکی ہے۔[1]

اسی طرح یہ آیت: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ:

مکان کے لحاظ سے مکہ میں اتری۔ زمانی اعتبار سے فتح مکہ کے دن ہجرت کے بعد نازل ہوئی اس کی غرض و غایت اور موضوع انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ ان کی اصل و اساس ایک ہی ہے۔ اگر اشخاص کو ملحوظ رکھیں تو اس کے مخاطب اہل مکہ بھی ہیں اور اہل مدینہ بھی علماء نے واضح طور پر نہ اس کو مکی آیت کہا ہے اور نہ مدنی۔ بلکہ اس کو ان آیات میں شامل کیا ہے جو مکہ میں اتریں مگر حکم کے لحاظ سے مدنی ہیں۔[2]

مکی و مدنی کی تقسیم زمانی کی افضلیت:

ہمارے نزدیک ان اقسام میں بلاشبہ سب سے اچھی قسم مکی و مدنی کی تقسیم زمانی ہے اس لیے کہ اس تقسیم کا تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ چونکہ ہمارا مطمح نظر اس بات کی تعیین ہے کہ یا مدینہ میں کون سی آیتیں یا سورتیں شروع میں اتریں؟ کون سی وسط میں اور کون سی سب سے آخر میں؟ اس لیے ہم ترتیب مکانی کو کسی حال میں بھی ترجیح نہیں دے سکتے۔ ان امور کا تقاضا ہے کہ ہم بداہتہً زمانی ترتیب کو بلاتردد افضل قرار دیں۔ جہاں تک اشخاص اور موضوعات کی تعیین اور استخراج کا تعلق ہے ان کی حیثیت ثانوی ہے اور ترتیب زمانی میں انکو مناسب مقام حاصل ہے چنانچہ ہمارے علمائے محققین نے اسی تاریخی طرز و منہاج کو اپنایا اور اس پر سختی سے کاربند رہے۔ یہ تاریخی تقسیم ایسی جامع ہے کہ اس کی لپیٹ سے نہ انفرادی امور خارج ہیں

---

[1] البرہان، ج ۱، ص ۱۹۵۔
[2] البرہان، ج ۱، ص ۱۹۵۔
[3] سورۃ الحجرات آیت ۱۳۔

نہ اجتماعی احوال و اطوار۔ نہ یہ زندگی پر ان کے اثرات سے بے بہرہ ہے اور نہ زندوں پر اس ضمن میں ہمارے علماء کے تشدد کا یہ عالم ہے کہ جو شخص اسلامی دعوت کے تاریخی مراحل سے نابلد ہو نہ وہ قرآن کی تفسیر بیان کر سکتا ہے۔ نہ اس کی آیات میں غور و فکر کرنے کا مجاز ہے

چنانچہ ابوالقاسم حسن بن محمد بن حبیب نیسابوری فرماتے ہیں[1]

"علوم القرآن میں سب سے افضل اس کے نزول کا علم ہے۔ نیز اس بات کا علم کہ مکہ اور مدینہ میں نزولِ آیات کی ترتیب کیا تھی؟ کون سی آیات پہلے نازل ہوئیں؟ کون سی درمیان میں اور کون سی آخر میں؟ پھر یہ کہ کون سی آیات مکہ میں نازل ہوئیں مگر ان کا حکم مدنی ہے؟ اور کون سی آیات مدینہ میں نازل ہوئیں مگر ان کا حکم مکی ہے[2]"

نزولِ قرآن کے چھ مراحل:

ابوالقاسم نیسابوری کے قول میں اہم بات یہ ہے کہ اس نے پورے قرآن کو چھ زمانی مراحل و ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان مراحل کی تفصیل یہ ہے۔ مکہ:

(۱) وہ آیات و سُوَر جو ابتداء میں اتریں۔

(۲) وہ آیات و سُوَر جو درمیانی زمانہ میں نازل ہوئیں۔

(۳) جو مکہ کے آخری دَور میں نازل ہوئیں۔

مدینہ = (۱) وہ آیتیں اور سورتیں جو مدنی زندگی کے آغاز میں نازل ہوئیں۔

(۲) جو مدنی زندگی کے درمیانی عرصہ میں اتریں۔

(۳) جو مدنی زندگی کے آخری دَور میں نازل ہوئیں۔

---

[1] نیسابوری بہت بڑے نحوی اور مفسر تھے۔ آپ فنِ قراءت میں امام العصر تھے۔ ۴۰۶ھ میں وفات پائی (بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷)۔

[2] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۱۹۲؛ نیز الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۲-۱۳۔

مستشرقین نے قرآن کریم کو اسباب نزول پر مرتب کر کے اسے چھ[1] یا چار مراحل میں تقسیم کیا ہے بذاتِ خود اس تقسیم میں ضرر کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ بشرطیکہ ہمارے بلند پایہ علماء ایسی تقسیم کی اجازت دیتے ہوں۔ البتہ اس تقسیم میں ضرر رسانی کا پہلو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ ترتیب روایاتِ صحیحہ کے عین برعکس من گھڑت خیالات پر مبنی ہو۔

ابوالقاسم نیسابوری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا تقاضا ہے کہ ایسی جزئیات کو بھی ان کے اختیار کردہ تاریخی طرز و منہاج کے ساتھ ملحق قرار دیا جائے جو ہماری نگاہ میں نہایت معمولی ہیں۔ مگر اس کی رائے میں بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی صورت سے نیسابوری کے نظریہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ نیسابوری کے نزدیک یہ جزئیات اپنے اندر اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ جو شخص کتاب اللہ کی تفسیر بیان کرنا چاہے اس کے لیے ان سے آشنائی ناگزیر ہے۔ اسی طرح ایک بالتحقیق مفسر کے لیے بھی ان کا جاننا ضروری ہے۔ ان علوم کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

پچیس ۲۵ علوم جو مفسر کے لیے ناگزیر ہیں :

(۱) جو سورتیں یا آیتیں مکہ میں اہل مدینہ کے بارے میں اتریں۔

(۲) وہ سورتیں جو مدینہ میں اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔

(۳) جو پہلی قسم سے ملتی جلتی ہوں۔

(۴) جو دوسری قسم سے ملتی جلتی ہوں۔

(۵) جو سورتیں یا آیتیں جحفہ (مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے ایک مقام کا نام) میں اتریں۔

(۶) جو بیت المقدس میں نازل ہوئیں۔

---

[1] ہمارا اشارہ اس جانب ہے کہ مشہور مستشرق مویر نے نزول قرآن کو چھ مراحل پر تقسیم کیا ہے۔ ان میں سے پانچ مکہ میں اور ایک مدینہ میں۔ مستشرق ویل نے قرآن کو چار مراحل پر تقسیم کیا ہے۔ تین مکہ میں اور ایک مدینہ میں۔ مستشرقین میں سے نولدیکی، شفالی، بل، روڈویل اور بلاشیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ہم ان مراحل کی تفصیل آگے چل کر بیان کریں گے۔

(۷) جو طائف میں اتریں۔

(۸) جو حدیبیہ کے مقام پر اتریں۔

(۹) جو رات کو اتریں۔

(۱۰) جو دن کو اتریں۔

(۱۱) جو آیت یا سورت دوسری آیات یا سورتوں کے ساتھ اتری ہو۔

(۱۲) جو اکیلی نازل ہوئی ہو۔

(۱۳) مکی سورتوں میں جو مدنی آیات ہوں۔

(۱۴) مدنی سورتوں میں جو مکی آیات ہوں۔

(۱۵) جو سورتیں مکہ سے مدینہ لے جائی گئیں۔

(۱۶) وہ سورتیں یا آیتیں جو مدینہ سے مکہ لے جائی گئیں۔

(۱۷) جو مدینہ سے حبشہ لے جائی گئیں۔

(۱۸) جو مجمل نازل ہوئیں۔

(۱۹) جو مفصل صورت میں اتریں۔

(۲۰) جو مشار الیہ ہونے کی صورت میں اتریں۔

(۲۱) جن سورتوں یا آیتوں کو بعض نے مکی کہا اور بعض نے مدنی۔

کل پچیس ۲۵ علوم ہیں (جن میں سے بعض یہاں مذکور نہیں ہیں) جو شخص ان سے آگاہ نہ ہو اس کے لیے کتاب خداوندی کی تفسیر بیان کرنا حلال نہیں ہے[1]

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ان سب علوم کی تفصیلات پیش کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک علم اتنا طویل الذیل ہے کہ اس پر کامل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اور اس سے بھی نہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اور نہ علمی پیاس بجھ سکتی ہے۔ علماء نے وحی کے

[1] البرہان، ج ۱، ص ۱۹۲۔

مراحل و ادوار کی تلاش میں جس محنت و کاوش سے کام لیا ہے اس کا اجمالی ذکر کرنے کے لیے ہم بعض روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انہوں نے قرآنی سورتوں کے بارے میں صرف یہی ذکر نہیں کیا کہ آیا وہ مکہ میں اتریں یا مدینہ میں۔ ہجرت سے پہلے اتریں یا بعد میں بلکہ کتابِ خداوندی کے ساتھ ان کی دلچسپی تحقیق و تدقیق کی آخری حد کو پہنچی ہوئی تھی۔

چنانچہ وہ قرآن کی چھوٹی یا بڑی کسی چیز کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

قرآن کا جو حصہ دن یا رات کے وقت اُترا:

علماء نے نزولِ قرآن کے بارے میں یہ عام قاعدہ ذکر کیا ہے کہ قرآن کا اکثر حصہ دن کے وقت نازل ہوا[1] مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض جزوی حالات پر یہ قاعدہ منطبق نہیں ہوتا۔ مثلاً سورہ مریم رات کے وقت نازل ہوئی۔ محدث طبرانی[2] نے ابو مریم غسانی سے روایت کیا ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی کہ آج شب میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا:

"آج رات مجھ پر سورۂ مریم نازل ہوئی ہے۔ لڑکی کا نام مریم رکھ دو۔"[3]

سورۃ الفتح کا ابتدائی حصہ رات کے وقت اترا۔ بخاری میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا آج شب مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر ہے پھر آپ نے یہ سورت تلاوت فرمائی:

---

[1] یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب منسوب ہے (البرہان، ج ۱ ص ۱۹۸) امام سیوطی الاتقان، ج ۱ ص ۳۴ پر رقم طراز ہیں، "قرآن کا جو حصہ دن کے وقت نازل ہوا اس کی مثالیں بہت ہیں۔" ابن حبیب فرماتے ہیں "قرآن کا اکثر حصہ دن کے وقت اترا" ابن حبیب سے ابوالقاسم حسن بن محمد بن حبیب نیشاپوری مراد ہیں۔ جن کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔

[2] طبرانی عظیم محدث اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ ان کی معجم صغیر، معجم اوسط اور معجم کبیر بہت مشہور ہیں۔ سنہ ۳۶۰ھ میں سو سال اور دس ماہ کی عمر میں وفات پائی۔ (الرسالۃ المستطرفۃ از محمد بن جعفر الکتانی ص ۳۰)

[3] الاتقان، ج ۱ ص ۳۵۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا: آخر تک[1]۔ (ہم نے آپ کو نمایاں فتح عطا کی)

سورۃ الحج کی ابتدائی آیات غزوۂ بنی المصطلق میں جو قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ ہے رات کے وقت نازل ہوئیں لوگ اس وقت جنگ میں شمولیت کے لیے جا رہے تھے[2]۔

روایات صحیحہ پر اعتماد کرنے سے یہاں تک پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں آیت رات کے کس حصہ میں نازل ہوئی، آیا آغاز شب میں یا وسط میں یا رات کے آخری حصہ میں، گویا میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نگاہ تصور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ نماز فجر کی آخری رکعت میں مشغول ہیں جب آپ پر روایات صحیحہ کے مطابق یہ آیت نازل ہوئی۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ: آپ کو کچھ اختیار حاصل نہیں۔

اسی طرح آپ چمڑے کے خیمہ میں استراحت فرما ہیں چند صحابہ دروازہ پر پہرہ دے رہے ہیں۔ جب رات کا کچھ حصہ گزرا تو یہ آیت اتری۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔

اسی طرح حضور گویا میری نگاہ کے سامنے حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف فرما ہیں۔ رات کا ایک تہائی حصہ باقی ہے[5]۔ اسی دوران جنگ سے پیچھے رہنے والے تین صحابہ سے متعلق آیت کریمہ نازل ہوئی[6]۔

قرآن کا وہ حصہ جو شدید سردی یا گرمی میں نازل ہوا:

شدید سردی کا موسم ہوتا لوگ سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہوتے۔ مگر قرآن کی روایت کرنے

---

[1] صحیح بخاری، ج ۶۔ ص ۳۵،
[2] البرہان، ج ۱۔ ص ۱۹۸۔
[3] سورۂ آل عمران آیت ۱۲۸، الاتقان ج ۱۔ ص ۳۶)
[4] سورۃ المائدۃ آیت ۶۷۔
[5] صحیح مسلم بروایت حضرت انس (الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۸۔)
[6] سورۃ التوبۃ آیت ۱۱۸۔

وا ے صحابہ اس ناسازگار فضا میں نازل شدہ قرآن کی نقل و روایت سے بھی نہ چوکتے۔ قرآن سے متعلق جن جزئیات کو ہم کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ صحابہ کے نزدیک وہ عظیم دینی و اجتماعی اہمیت کی حامل تھیں اور وہ ان کو بکمال امانت و دیانت بلاکم و کاست و بلا اضافہ ہم تک پہنچانا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔

غزوۂ خندق کی ایک رات میں لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا چھوڑ کر چل دیے صرف بارہ آدمی آپ کے پاس موجود رہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جلیل القدر صحابی حضرت حذیفہؓ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ "اٹھ کر دشمن کے لشکر کی طرف جائیے" حذیفہؓ عرض کرتے ہیں:

"مجھے اس ذات کی قسم جس نے حق کے ساتھ آپ کو مبعوث فرمایا سردی سخت پڑ رہی ہے میں صرف تعمیل ارشاد کے لیے لشکرِ اعدا کی طرف جا رہا ہوں"

اسی دوران یہ آیت نازل ہوئی:

"اے ایمان والو! خدا کے احسان کو یاد کیجیے جب تم پر بڑے بڑے لشکر حملہ آور ہوئے تو ہم نے ان پر آندھی اور ایسے لشکر بھیجے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور جو کام تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ ان سے بخوبی آگاہ ہے[1]"

بخلاف ازیں غزوۂ تبوک سے متعلق جو آیات اتری تھیں وہ گرمی کی شدت میں نازل ہوئیں۔ اس روز ایک منافق نے کہا "لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ" (گرمی کی شدت میں جنگ کے لیے نہ جاؤ) اس پر یہ آیت اتری:

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا۔ آپ فرما دیں کہ جہنم کی گرمی اس سے بھی سخت ہے[2]

---

[1] سورۃ الاحزاب آیت ۹۔ اس حدیث کو محدث بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے (الاتقان۔ ج ۱، ص ۳۷) امام بیہقی کی نسبت بیہق کی طرف کی گئی ہے نیسابور سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر بیہق چند دیہات کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ امام بیہقی کی تصانیف ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں سے السنن الکبریٰ اور دلائل النبوۃ زیادہ مشہور ہیں۔ امام بیہقی نے ۴۵۸ھ میں وفات پائی۔ (الرسالۃ المستطرفۃ ص ۲۵-۲۶)

[2] سورۃ التوبۃ آیت ۸۱۔ (الاتقان ج ۱ ص ۳۱)

حضر و سفر میں نازل شدہ قرآن :

اگرچہ قرآن کا اکثر حصہ حضر میں نازل ہوا۔ تاہم دعوتِ اسلام کے پیش نظر آپ نے جو سفر اختیار کیے بعض اوقات اطمینانِ قلب اور تائید جہاد کے سبب ان کے دوران بھی وحی نازل ہوتی رہی صحابہ اس ضمن میں تعبیر و بیان کا یہ انداز اختیار کرتے ہیں کہ "یہ آیت یا آیات آپؐ پر دورانِ سفر نازل ہوئیں" بلکہ اکثر و بیشتر وہ سفر کے زمان و مکان کی تعیین بھی کر دیتے ہیں۔

حدیثِ صحیح میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آیت کریمہ[1] اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ عرفہ کے دن پچھلے پہر بروز جمعہ حجۃ الوداع کے سال نازل ہوئی۔ دلائل النبوۃ میں مرقوم ہے کہ سورۃ النحل کی آخری آیات غزوۂ اُحد میں اس وقت نازل ہوئیں جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید اعظم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑے تھے۔ حضرت حمزہؓ اس وقت شہادت سے سرفراز ہو چکے تھے[2]

غزوات میں نزولِ قرآن :

صادق اکبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ جہاد مسلسل کی آئینہ دار تھی۔ اس لیے غزوات میں قرآن کا بہت سا حصہ نازل ہوا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے بعد سورۂ انفال کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں[3]

مندرجہ ذیل آیت عمرۂ حدیبیہ میں نازل ہوئی :

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ	گھروں کو چھتوں کی طرف سے آنے میں کوئی
مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ	نیکی نہیں، نیکی والا وہ ہے جو تقویٰ سے
مَنِ اتَّقٰى ۔	بہرہ ور ہو۔

۱؎ سورۃ المائدۃ آیت ۳ ۔ (الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۱) ۲؎ الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۲)

۳؎ الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۲۔

۴؎ سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۹ (الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۰) بعض علماء کے نزدیک یہ آیت فتح مکہ یا حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔

یہ آیت غزوۂ تبوک میں نازل ہوئی:

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ : آخر تک

امام سیوطی نے الاتقان[2] میں اس کی بہت سی مثالیں ذکر کی ہیں۔

شب معراج زمانی اعتبار سے ایک رات ہی تھی۔ مگر علم الٰہی میں وہ ازل بعید و عمیق کا ایک عظیم جزو تھی۔ قرآن کی بہت سی آیات اس مقدس رات میں نازل ہوئیں۔

بشرط صحت روایت مندرجہ ذیل آیت بیت المقدس میں اتری جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے (محمد[3]) کو رات کے وقت سیر کرائی تھی۔

وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ	آپ سے پہلے جو رسول ہم نے بھیجے ہیں
مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ	ان سے پوچھیے کہ کیا ہم نے رحمٰن کے سوا
الرَّحْمَٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ :	کوئی معبود بنائے ہیں جن کی عبادت کی جائے

بقول ابن العربی[4] سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں آسمان و زمین کی درمیانی فضا[5] میں اس وقت نازل ہوئیں جب آپ نے شب معراج میں آیات خداوندی ملاحظہ کیں۔

بظاہر ایسی غیر اہم باتوں کے سلسلہ میں ان ہمہ گیر اور ان تھک مساعی کی وجہ علماء اور رواۃ حدیث کے نزدیک صرف یہ تھی کہ کتاب خداوندی میں وارد شدہ مکی و مدنی آیات و سور کی امکانی حد تک تحدید و تعیین ہو جائے اور اس میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

اسی دقت فکر و نظر اور ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ علماء نے قرآنی آیات میں یوں فرق کیا ہے۔

(۱) وہ آیات جو ان آیتوں سے ملتی جلتی ہیں جو مکی سورتوں میں ہونے کے باوجود مدینہ میں نازل ہوئیں۔

---

[1] سورۃ الاسراء آیت ۷۶ (الاتقان ج ۱ ص ۳۲)۔

[2] الاتقان ج ۱ ص ۳۰-۳۴۔ [3] سورۃ الزخرف آیت ۴۵۔

[4] البرہان ج ۱ ص ۱۹۷۔ [5] الاتقان ج ۱ ص ۳۸۔

(۲) وہ آیات جو ان آیتوں سے ملتی جلتی ہیں جو اگرچہ مدنی سورتوں میں ہیں مگر وہ مکہ میں نازل ہوئیں۔
اس ضمن میں مفسرین نے تشبیہ (دوسری آیات کے ساتھ ملتے جلتے ہونے) کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس سے ان کا مقصود واضح ہے۔ مفسرین نے ہر سورت کے لیے مکی یا مدنی کا امتیاز قائم کر رکھا ہے پھر جو اس سورت سے ملتی جلتی ہوتی ہے اس کو بھی اسی سورت کے ساتھ ملحق کر دیتے ہیں۔

مثلاً جب آپ سورۂ ہود میں جو مکی سورت ہے یہ آیت پائیں۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ۔ آخر تک (اور دن کے دونوں طرفوں میں نماز قائم کیجیے) تو ضروری نہیں کہ اس کو مدنی سمجھنے لگیں۔ اگرچہ یہ مدنی سورتوں سے ملتی جلتی ہے۔

اسی طرح جب سورۂ انفال میں جو مدنی ہے یہ آیت پائیں۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا	اور یاد کیجیے جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ
هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا	اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم
حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔	پر پتھروں کی بارش برسا۔

تو اس سورت کو مکی نہیں قرار دینا چاہیے۔ اگرچہ بظاہر اس پر مکی ہونے کے علامات واضح ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جلد باز محققین کسی آیت یا سورت کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اور بنظر غائر یہ نہیں دیکھتے کہ دعوتِ اسلامی

---

[1] البرہان، ج ۱- ص ۱۹۹۔

[2] تفسیر قرطبی، ج ۹- ص ۱۱۰- ۱۱۱ پر لکھا ہے کہ یہ آیت انصار کے ایک آدمی ابو الیسر بن عمر کے بارے میں نازل ہوئی۔ البرہان، ج ۱- ص ۱۹۶ پر مرقوم ہے کہ یہ آیت ابو مقبل حسین بن عمر بن قیس اور اس عورت کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اس سے کھجوریں خریدی تھیں۔ اور اس نے اس عورت کو ورغلانا چاہا (سورۂ ہود)

[3] سورۂ انفال آیت ۳۲ (البرہان، ج ۱- ص ۱۹۷) یہ بات بھی اسی قبیل سے ہے کہ بعض علماء نے سورۂ انفال کی آیت نمبر ۳۰ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کو مکی قرار دیا ہے حالانکہ سورۂ انفال مدنی ہے۔ مگر یوطی (الاتقان، ج ۱- ص ۴۰) میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی۔ جیسا کہ ہم نے اسباب النزول میں بیان کیا ہے۔"

کی تاریخ ہیں اس کا مرتبہ و مقام کیا ہے۔ ایسا وہاں ہوتا ہے جہاں خاص حالات قرآن کے نازل شدہ حصہ کو دوسری جگہ لے جانے کے مقتضی ہوتے ہیں۔ مگر علمائے ثقات کا دامن ایسی کوتاہی سے پاک ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی ہر آیت اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے بلکہ قرآن کا ہر لفظ ایک جداگانہ خاصیت اور عنوان کا حامل ہوتا ہے۔

شیخ المفسرین طبری کے ذریعہ ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ آیت قرآنی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ[۱] — آپ سے اس مہینہ کے بارے میں پوچھتے ہیں جس میں لڑائی حرام ہے۔

مدینہ سے مکہ لے جائی گئی تھی[۲]

مفسر قرطبی[۳] نے ہمیں بتایا کہ مندرجہ ذیل آیت:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا[۴] — اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو سود باقی ہے اسے چھوڑ دو۔

سورۂ توبہ کی ابتدائی چند آیات کے ساتھ مدینہ سے مکہ لائی گئی اور حضرت علی نے یوم النحر کے دن یہ آیات پڑھ کر لوگوں کو سنائی تھیں[۵]

مستشرقین کا دجل وفریب:

ایک طرف ہمارے علماء قرآنی سورتوں کو اسلامی دعوت کے مختلف مراحل وادوار کے مطابق مرتب کرنے کے لیے روایات کی نقد وجرح میں حد درجہ جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیتے ہیں۔ دوسری طرف مستشرقین کا یہ حال ہے کہ روایات و رُواۃ دونوں کو نفرت وحقارت

---

[۱] سورۃ البقرہ آیت ۲۱۷۔

[۲] تفسیر طبری ج ۲۔ ص ۲۰۱ - ۲۰۶ دالبرھان ج ۱۔ ص ۲۰۳ - ۲۰۴

[۳] امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح انصاری خزرجی جو قرطبی کے نام سے مشہور تھے۔ "الجامع لاحکام القرآن" آپ کی تصنیف ہے ۶۷۱ھ میں وفات پائی۔

[۴] سورۃ البقرہ آیت ۲۷۸۔

[۵] تفسیر قرطبی ج ۳۔ ص ۳۶۳ - ۳۶۴

کی نگاہ سے دیکھتے اور اس بات پر شک و شبہہ کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآن کریم کو سیرت رسول کی روشنی میں بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر ہمارے لیے بے حد حیرت و استعجاب کا موجب ہے[۱]۔

یہ بڑی انوکھی منطق ہے کہ مستشرقین اس بات کے دعویٰ دار بھی ہیں کہ وہ قرآن کو ترتیب زمانی کے مطابق مرتب کر سکتے ہیں۔ اور دوسری جانب ان کا یہ حال ہے کہ ترتیبِ قرآن میں وارد شدہ کسی صحیح روایت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اگر تشدد فی الروایات کی بناء پر صرف صحیح روایات کو تسلیم کرتے ہوتے تو معاملہ چنداں دشوار نہ ہوتا۔ اس لیے کہ ہمارے علماء بھی مکی و مدنی سورتوں ترتیبِ سُوَر تدریجی تعلیمات و ارشادات اور دیگر مضامین کے بارے میں ضعیف روایات کو مسترد کر دیا کرتے ہیں۔

البتہ مستشرقین میں کچھ باانصاف لوگ ایسے بھی ہیں جو اس ضمن میں مسلم علماء سے بالکل مختلف نہیں۔ مثلاً پروفیسر غریم (H. GRIMME) قرآنی سورتوں کی ترتیب میں روایاتِ صحیحہ اور اسانیدِ اسلامیہ پر اعتماد کرتا ہے[۲] مگر اس پر دو اعتراض وارد کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) پروفیسر غریم روایاتِ صحیحہ و سقیمہ کے مابین کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھتا اور دوسرے مستشرقین کی طرح نقد و جرح کی صلاحیت سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ترتیب قرآن کی اساس اسانیدِ ضعیفہ و باطلہ پر رکھی ہے۔

(۲) غریم نے از خود اپنے اوپر یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ ترتیبِ قرآن میں روایات پر اعتماد کرے گا مگر وہ اکثر جگہ اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ انحراف کا یہ رویہ اس نے مستشرق نولدیکی (NOLDEKE) کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ نولدیکی نے وحی قرآنی کے مراحل و ادوار کے سلسلہ میں جو خامہ فرسائی کی ہے غریم نے اکثر اس کا تتبع کیا ہے۔

دراصل مستشرق نولدیکی (NOLDEKE) نے قرآن کی ترتیبِ زمانی غیر اسلامی طریقہ

---

[۱] BLACHERE, INTRO. COR, 252

[۲] H. GRIMME, MOHAMMED, 2E, PARTIE (MUNSTER, 1895

پرانجام دی ہے۔ اس نے اس ضمن میں ایک نئی راہ اختراع کی ہے جس سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ خصوصاً تمام مستشرقین اس ڈگر پر چلتے رہے۔ حالانکہ یہ راہِ قرآنی دراسات و علوم کے حق میں زہرِ ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں۔

ولیم موبر اور ترتیب قرآن:

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں قرآنی سورتوں کی ترتیب اور قرآن کے تاریخی ادوار کے درس و مطالعہ کے بارے میں متعدد کوششیں کی گئی تھیں۔ اس ضمن میں ولیم موبر (WILLIAM MUIR) نے یہ کام کیا کہ نزول قرآن کے مراحل کو چھ حصوں میں تقسیم کر دیا ان میں سے پانچ مکہ میں اور ایک مدینہ میں[۱]۔ موبر نے زیادہ تر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اس کی اسانید پر اعتماد کیا۔ آپ کی سیرت کا تنقیدی مطالعہ کیا اور بہت سے تاریخی معلومات[۲] جمع کر دیے۔ مگر اس کے باوصف اس سے بکثرت غلطیاں صادر ہوئیں اور اس نے بہت سی ضعیف روایات کا سہارا لیا۔ اس ضمن میں مستشرق غریم کے ساتھ اس کا تقابل چنداں دشوار نہیں۔

ترتیب قرآن میں مستشرق ویل (WEIL) کی مساعی:

ترتیب قرآن کے سلسلہ میں ویل (WEIL) کی کاوش بھی قابل ذکر ہے جس کا آغاز اس نے ۱۸۴۴ء میں کیا اور اس کی تکمیل ۱۸۷۲ء میں ہوئی۔ وہ ترتیب قرآن کے ضمن میں اسلامی روایات[۳]

---

۱ موبر کی کوشش کے ثمرات اس کی دو تصانیف میں دیکھے جا سکتے ہیں:

(1) LIFE OF MUHAMMED (LONDON 1858 - 61)

یہ کتاب بڑی عمدہ طباعت کے ساتھ ۱۹۲۳ء میں ایڈنبرا ..... (EDINBARGH) سے شائع ہو چکی ہے

(2) THE CORAN, ITS COMPOSITION AND TEACHING (LONDON. 1878) دوسری کتاب کا نام ہے۔

۲ CF. BLACH, INTRO. COR. 248

۳ G. WEIL, HISTORISCH-KRITISCHE.

اسانید کو کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ بلاشیر نے اس کے طریق کار کو "یکتا اور ثمر آور" قرار دیا ہے[1]۔ نولدیکی نے بھی اس کی پر زور حمایت کی ہے۔ چنانچہ ترتیب قرآن کے سلسلہ میں نولدیکی کی کاوش کا بڑا ماخذ زیادہ تر ویل کی دراسات ہی ہیں۔

ویل نے نزولِ قرآن کو چار مراحل میں تقسیم کیا تھا۔ تین مکہ میں اور ایک مدینہ میں نولدیکی نے اپنی "تاریخ القرآن" شائع کردہ ۱۸۶۰ء میں اسی کا تتبع کیا ہے۔ البتہ ہر مرحلہ میں نولدیکی نے اس سے معمولی سا اختلاف بھی کیا ہے۔ جب نولدیکی نے مستشرق شفالی (SCHWALLY) کی رفاقت سے اس کتاب کا طبعِ ثانی شائع کیا تو اس میں مزید اضافے کیے۔

بلاشیر کا ترجمۃ القرآن:

مستشرقین میں سے آر۔ بیل (R.BELL) اور روڈویل (RODWELL) اور بلاشیر (BLACHERE) ویل سے حد درجہ متاثر ہوئے ہیں۔ ہماری نگاہ میں بلاشیر کا ترجمۃ القرآن اپنی علمی روح کی بناء پر منفرد حیثیت کا حامل ہے مگر اس میں یہ خامی پائی جاتی ہے کہ قرآنی سورتوں کی ترتیبِ زمانی کے سلسلہ میں بلاشیر نے تکلف اور کھینچا تانی سے کام لیا ہے۔ اور وہ خود بھی اس کا معترف ہے۔ دراصل بلاشیر کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ تاریخی مراحل ترتیب سُوَر اور تدریجی تعلیمات کی طلب و تلاش میں قرآن دیگر امور سے بے نیاز ہے۔ قرآن جس بات سے خاموش ہو سیرت رسول اور صحابہ کی نقل کردہ احادیث بذاتِ خود اس کی توضیح نہیں کر سکتیں۔ البتہ قرآن آپ اپنی تشریح و توضیح کر سکتا ہے۔

مکی و مدنی آیات و سُوَر سے متعلق اپنے علماء کا تشدد بیان کرنے کے بعد ہم بلاشک و شبہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب زمانی کے سلسلہ میں روایاتِ صحیحہ سے بڑھ کر دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔ اس ضمن میں جو روایات وارد ہوئی ہیں۔ وہ یا تو صحابہ سے منقول ہیں جو وحی کے زمان و مکان کے عینی شاہد تھے۔ یا ان تابعین سے جنہوں نے وحی کی تفصیلات صحابہ کی زبانی سنی

[1] BLACH., INTRO. COR., 251

تھیں۔ اس قبیل کی کوئی چیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں۔ جیسا کہ قاضی ابوبکر باقلانی[1] نے اپنی کتاب "الانتصار" میں لکھا ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے مامور نہ تھے اور نہ اس علم کو خدا نے اُمّت کے فرائض میں سے قرار دیا۔[2]

بہت سے صحابہ مکی و مدنی آیتوں اور سورتوں سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ضمن میں انہوں نے بڑی دقیق جزئیات بیان کی ہیں جن سے ہماری کتب تفسیر اور علوم القرآن پر مشتمل کتب بھرپور اور معمور ہیں۔ ہم قبل ازیں تمثیل و استشہاد کے طور پر ان کا ذکر کر چکے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول سے اس بات کی ایک جھلک نمایاں ہوتی ہے کہ صحابہ اس علم میں کتنی مہارت رکھتے تھے۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

"اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں قرآن کی جو آیت بھی نازل ہوئی مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں اتری اور کس کے بارے میں اتری۔"[3]

مگر ابن مسعودؓ کتنے بڑے عالم ہی کیوں نہ ہوں، ایسا حلف اٹھانے کے سلسلہ میں صحابہ میں منفرد نہ تھے۔ بلکہ حضرت علیؓ نے بھی ایسی قسم کھائی تھی۔ صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو ان مناظر کو بچشم خود دیکھ چکے تھے جو انہوں نے ملاحظہ کیے۔ بلکہ بعض صحابہ اس ضمن میں ان سے بھی سبقت لے گئے تھے۔ یہ امر بھی کچھ بعید نہیں کہ غیر معروف صحابہ میں بعض ایسے بھی ہوں جو مشاہیر صحابہ سے زیادہ علم رکھتے ہوں۔[4]

روایات صحیحہ پر اعتماد اجتہاد کے منافی نہیں:

یہی وجہ ہے کہ روایات صحیحہ پر اعتماد فکر و نظر اور اجتہاد کے منافی نہیں۔ خصوصاً ایسے موضوعات

---

[1] قاضی ابوبکر بن الطیب باقلانی۔ [2] البرھان، ج ۱- ص ۱۹۱- (الاتقان، ج ۱- ص ۱۴)

[3] الاتقان، ج ۱- ص ۱۴- اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ ابونعیم الحلیۃ میں ایوب سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عکرمہ سے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا تو عکرمہ نے کہا "یہ آیت سلع پہاڑ کی وادی میں نازل ہوئی۔"

[4] ہم قبل ازیں "علم اسباب نزول" کی فصل میں صحابہ کے علم پر روشنی ڈال چکے ہیں۔

میں جہاں روایت نصِ صریح کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ مکی و مدنی آیتوں اور سورتوں میں اجتہاد کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً گاہے بعض سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اور گاہے بعض مکی سورتوں میں سے مدنی آیات اور مدنی سورتوں میں سے مکی آیات الگ کرنے کے بارے میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح مکہ یا مدینہ میں نازل شدہ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات مکی مدنی سورتوں کے اسلوبی یا موضوعی خصائص کے بارے میں بھی جدل و نزاع کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ سارے اختلافات اجتہاد کی روشنی میں حل کیے جاتے ہیں۔

ابو جعفر نحاس[1] کا قول ہے کہ سورۃ النساء اس لیے مکی ہے کہ آیت کریمہ:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔[2]

بالاتفاق مکہ میں کعبہ کی کنجی کے بارے میں نازل ہوئی۔ سیوطی اس پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ابو جعفر نحاس کا یہ استدلال نہایت کمزور ہے۔ اس لیے کہ کسی مدنی سورت میں ایک مکی آیت یا چند آیات کے ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ پوری سورت مکی ہو، خصوصاً جب کہ مذہب راجح یہ ہے کہ قرآن کا جو حصہ ہجرت کے بعد نازل ہوا اس کو مدنی کہتے ہیں جو شخص بھی اسباب نزول کے فن سے آگاہ ہو گا ابو جعفر کی بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں بخاری کی حضرت عائشہ رض سے روایت کردہ حدیث سے بھی اس بات کی تردید ہوتی ہے۔" فرمایا جب بھی آنحضور ﷺ پر سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کی آیات نازل ہوتیں تو میں آپ کے پاس ہوتی۔ حضرت عائشہ رض بالاتفاق آپ کے

---

[1] ابو جعفر نحاس کا نام و نسب احمد بن اسماعیل بن یونس مرادی ہے۔ آپ مصر کے بہت بڑے فاضل اور لغت دان تھے۔ ۳۳۸ھ میں وفات پائی۔ موصوف نے "الناسخ والمنسوخ" نامی بڑی قابل قدر کتاب تحریر کی ہے (انباہ الرواۃ، ج ۱، ص ۱۰۱)۔ ابو جعفر نحاس کی مذکورہ کتاب قاہرہ کے مطبعۃ السعادۃ میں ۱۳۲۳ھ میں طبع ہو چکی ہے۔

[2] سورۃ النساء، آیت ۵۸۔

گھر مدینہ میں آئیں۔[1]

اس میں شبہ نہیں کہ مکی اور مدنی سورتوں میں کچھ آیتیں مستثنیٰ بھی ہیں۔ بعض علماء ان کے مستثنیٰ ہونے میں نقل پر نہیں بلکہ اجتہاد پر بھروسہ کرتے ہیں[2]۔ یہ امر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل شدہ قول کے معارض نہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"جب کسی سورت کا ابتدائی حصہ مکہ میں نازل ہوتا تو وہ سورت مکہ میں لکھی جاتی تھی پھر اللہ تعالیٰ اس میں جو چاہتے اضافہ کرتے۔"

اس لیے کہ مکی سورتوں میں جو مدنی آیات ہیں یا برعکس اس کی حکمت و مصلحت بطریق اجتہاد معلوم کی جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ الاسراء مکی ہے، مگر اس کی مندرجہ ذیل آیت مدنی ہے۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ[3]

مذکورہ صدر آیت وفد ثقیف کے بارے میں نازل ہوئی۔ قبیلہ ثقیف کے لوگوں نے بارگاہِ اقدس میں حاضر ہو کر مختلف سوالات کیے۔ کہنے لگے ہمیں اپنے معبودوں سے فائدہ حاصل کرنے دیجیے۔ جو چڑھاوے ان پر چڑھائے جاتے ہیں وہ لے کر ہم ان کو توڑ دیں گے اور اسلام لے آئیں گے۔ ہم اپنی وادی کو اسی طرح حرم قرار دیں گے جیسے مکہ کو حرم ٹھہرایا گیا ہے تاکہ عرب ہماری فضیلت کو تسلیم کر لیں[4]۔

نزول قرآن کا آغاز و انجام

روایات و اسانید کے پیش نظر علماء مکی اور مدنی سورتوں کی تعیین کرتے ہیں[5]۔ پھر نزول کے

---

[1] الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۹ سیوطی نے الاتقان کی ایک فصل میں ان سورتوں کا ذکر کیا ہے جن کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے (الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۸-۲۳)

[2] الاتقان، ج ۱۔ ص ۲۳۔ [3] سورۃ الاسراء آیت ۷۳۔

[4] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ج ۹۔ ص ۲۹۹۔

[5] مشہور عالم حسن بن حصار نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں چند اشعار رقم کیے ہیں۔ ان سے مستفاد ہوتا ہے کہ علماء کے نزدیک مندرجہ ذیل بیس سورتیں بالاتفاق مدنی ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

اعتبار سے باری باری ان کو مرتب کرتے ہیں۔ علماء کے یہاں یہ امر متنازع فیہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن کا کون سا حصہ نازل ہوا اور سب سے آخر میں کون سا[1]؟ اس کی حد یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ تک میں ——— جس کو مسلمان نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں ——— اختلاف پایا جاتا ہے بعض اس کو مکی کہتے ہیں۔ اور بعض مدنی[2]۔ تیسرا فریق اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ یہ سورت دو دفعہ نازل ہوئی[3]۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ اس اعتبار سے سورۂ فاتحہ علی الاطلاق سب سے پہلے نازل ہوئی[4]۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کے نزدیک چند سورتیں سورۂ فاتحہ سے پہلے نازل ہوئیں۔

ایسی اختلافی امور میں علماء اپنے نقطۂ نظر کے اثبات کے لیے براہین و دلائل پیش کرتے ہیں۔ یہ دلائل زیادہ تر نقل کی نسبت اجتہاد سے قریب تر ہوتے ہیں۔ چنانچہ واحدی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) وہ حسب ذیل ہیں:۔

بیس[20] مدنی سورتیں:

البقرہ[1]۔ آل عمران[2]۔ نساء[3]۔ المائدہ[4]۔ الانفال[5]۔ التوبہ[6]۔ النور[7]۔ الاحزاب[8]۔ محمد[9]۔ الفتح[10]۔ الحجرات[11]۔ الحدید[12]
المجادلۃ[13]۔ الحشر[14]۔ الممتحنہ[15]۔ الجمعہ[16]۔ المنافقون[17]۔ الطلاق[18]۔ التحریم[19]۔ النصر[20]

بارہ سورتیں مختلف فیہا ہیں:

بارہ سورتوں کے بارے میں متعدد اور مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔
الفاتحہ[1]۔ الرعد[2]۔ الرحمٰن[3]۔ الصف[4]۔ التغابن[5]۔ التطفیف[6]۔ القدر[7]۔ لم یکن[8]۔ اذا زلزلت[9]۔ الاخلاص[10]
الفلق[11]۔ الناس[12]۔

۸۲ مکی سورتیں:

مندرجہ بالا بتیس سورتوں کے علاوہ باقی سب بالاتفاق مکی ہیں (الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۰۔۱۸) سیوطی نے ابن حصار کے اشعار نقل کیے ہیں۔ اس طرح مکی سورتوں کی تعداد ۸۲ ہو گی کیونکہ تمام قرآنی سورتیں ۱۱۴ ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] البرهان، ج ۱۔ ص ۱۹۳۔۱۹۴۔ زرکشی کے نزدیک مختلف فیہا سورتوں میں سے اکثر مدنی ہیں، لہٰذا ان کے نزدیک مکی سورتوں کی تعداد ۸۵ اور مدنی سورتیں کل ۲۹ ہیں۔

[2] ابن عباس ضحاک مقاتل اور عطاء سورۂ فاتحہ کو مکی اور مجاہد مدنی قرار دیتے ہیں (البرهان، ج ۱۔ ص ۱۹۴)

[3] البرهان، ج ۱۔ ص ۲۹۔ [4] الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۸۔ نیز البرهان، ج ۱۔ ص ۲۰۷۔

اس پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عرصۂ دراز تک مکہ میں فاتحہ کے بغیر نماز ادا کرتے رہیں۔[۱] جیسا کہ ہم جانتے ہیں واحدی کی کتاب "اسباب النزول" کا ماخذ اکثر و بیشتر صرف اسانید و روایات ہیں۔ مگر اجتہاد و استنباط کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہے۔ حتیٰ کہ اصحابِ نقل اور نصوص سے احتجاج کرنے والے بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

مکی و مدنی کی پہچان کے دو طریقے:

مستشرق بلاشیر کا یہ حال ہے کہ بجائے اس کے کہ واحدی کے قول کو اجتہاد و استنباط پر محمول کرتا۔ وہ اس میں اپنی مایوسی کا سامان دیکھتا ہے۔ اس کا حال اس شخص کی مانند ہے، جو کسی بات کا فیصلہ صادر کرنے میں ہر طرف سے ناامید ہو گیا ہو۔ چنانچہ وہ واضح الفاظ میں اپنی جہالت کا اعتراف کرتا اور اس میں اس کو سلامتی کی راہ نظر آتی ہے۔[۲]

ہمارے نزدیک بلاشیر کا یہ طرزِ عمل اس کی مبالغہ پسندی کی دلیل ہے۔ علماء کی یہ شان نہیں کہ ترتیبِ قرآن جیسے اہم امور کے بارے میں کسی حتمی یا قطعی رائے کا اظہار کریں۔ ان کا کام تو صرف یہ ہے کہ واحدی کی طرح صرف ترجیح سے کام لیں۔ جہالت کا علاج ہمیشہ قطعی و حتمی امور ہی سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ علم و معرفت کے حصول کے لیے صرف ترجیح ہی کافی ہے۔

ہمارا مقصد یہاں واحدی سے دفاع کرنا نہیں۔ دراصل ہم اس بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ مکی و مدنی کی بہت سی جزئیات کا علم ہمیں اجتہاد کے ذریعے حاصل ہوا۔ نیز یہ کہ عقل نقل کی طرح اور قیاس سماع کی مانند ہوتا ہے۔ کسی چیز کا علم دونوں سے حاصل ہو جاتا ہے۔ الجعبری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مکی اور مدنی کی پہچان کے دو طریقے ہیں (۱) سماعی (۲) قیاسی[۳]

---

[۱] اسباب النزول للواحدی، ص ۱۳۔ [۲] BLACHERE, INTRO. COR., 263

[۳] البرھان، ج ۱ ص ۱۸۹۔ نیز الاتقان، ج ۱ ص ۲۹۔

سماعی :۔ سماعی کی تعریف یہ ہے کہ جس کے نزول کی اطلاع ہم تک دونوں میں سے ایک طریقہ سے پہنچی ہو۔ پھر قیاسی کے شواہد و امثلہ بیان کیے ہیں۔"

جب ہم الجعبری کی نقل کردہ امثلہ کا موازنہ ان علماء کی بیان کردہ مثالوں سے کریں جو قرآن میں مہارت رکھتے اور اس کے فنون و اسالیب کے ذوق آشنا تھے۔ تو ان کے مجموعہ سے ہم یہ قیاسی ضابطہ اخذ کرتے ہیں جس کی مدد سے ہم مکی و مدنی سورتوں کے مابین فرق و امتیاز کر سکتے اور ان کی جداگانہ خصوصیات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ ہم آگے چل کر واضح کریں گے کہ یہ ضابطہ ہر سورت پر منطبق ہوتا ہے۔ اس ضابطہ کے تحت مکی سورتوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

مکی سورتوں کی خصوصیات :۔

(۱) جس سورت میں سجدہ ہو وہ مکی ہوتی ہے[1]

(۲) جس سورت میں "کَلَّا" (ہرگز نہیں) کا لفظ ہو وہ مکی ہے۔ یہ لفظ قرآن کے نصف آخر میں وارد ہوا ہے[2]

---

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۲۹۔ مستشرق بہل (BUHL) لکھتا ہے کہ اسماء الٰہی میں سے "الرحمٰن" مدنی سورتوں میں مذکور نہیں ہے۔ بلکہ یہ مکی سورتوں کی خصوصیات میں سے ہے۔ جو لوگ سورہ الرحمٰن کو مدنی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بہل کی تردید کے لیے سورۂ الرحمٰن ہی کافی ہے۔ مگر جمہور اس کو مکی سورت قرار دیتے ہیں (الاتقان، ج ۱، ص ۲۰) اس کی تردید کے لیے سب سے بہتر یہ آیت ہے "وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَّا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" (سورۃ البقرہ آیت ۱۶۳) یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے۔

[2] الدیرینی فرماتے ہیں ؎

وَمَا نَزَلَتْ كَلَّا بِيَثْرِبَ فَاعْلَمَنْ ۔۔۔ وَلَمْ تَأْتِ فِي الْقُرْآنِ فِي نِصْفِهِ الْأَعْلٰى

العمانی اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس کی حکمت و مصلحت یہ ہے کہ قرآن کے نصفِ آخر کا زیادہ حصہ مکہ میں اترا جہاں کے رہنے والے سرکش لوگ تھے۔ اس لیے ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے بار بار "کَلَّا" کا لفظ نازل ہوتا رہا۔ قرآن کے نصفِ اول میں یہ بات نہیں یہود کے بارے میں قرآن کا جو حصہ نازل ہوا اس میں" (باقی آئندہ)

(۳) جس سورت میں "یَاَیُّهَا النَّاسُ" ہو اور "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" نہ ہو وہ مکی ہوگی۔ مگر سورۃ الحج اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس صورت کے آخر میں "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ ہیں۔ حالانکہ اکثر علماء کے نزدیک یہ مکی سورت ہے۔[۱]

(۴) جس سورت میں انبیاء اور امم سابقہ کے واقعات ہوں وہ مکی ہے۔ مگر سورۂ بقرہ اس سے مستثنیٰ ہے۔[۲]

(۵) جس سورت میں آدم و ابلیس کا واقعہ مذکور ہو وہ مکی ہے سورہ بقرہ کے سوا۔[۳]

(۶) ہر سورت جو حروفِ تہجی مثلاً "الٓمٓ" "الٓرٰ" وغیرہ پر مشتمل ہو وہ مکی ہوگی۔ مگر سورۃ بقرہ اور آل عمران اس سے مستثنیٰ ہیں۔ سورہ الرعد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ مدنی سورت ہے مکی نہیں۔[۴]

(بقیہ صفحہ گزشتہ) یہ لفظ وارد نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ ذلیل اور کمزور تھے" (الاتقان ج ۱-ص ۲۹)، نیز البرہان، ج ۱-ص ۳۶۹-العمانی کا نام ونسب ابوالحسن علی بن سعید العمانی المغربی ہے۔ "المرشد" آپ کی مشہور کتاب ہے ذکریا انصاری نے اس کا اختصار بنام "المقصد لتلخیص ما فی المرشد" تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب قاہرہ میں ۱۹۳۴ء میں طبع ہو چکی ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] سورۃ الحج کا نمبر ۲۲ ہے۔ بخلاف ازیں جن سورتوں میں "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ ہوں وہ مدنی ہیں (البرہان، ج ۱-ص ۱۸۹) زرکشی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اگر اس قول کو علی الاطلاق تسلیم کیا جائے تو درست نہیں۔ کیونکہ سورۃ البقرہ مدنی ہے حالانکہ اس میں یہ آیت بھی ہے "یَاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا" (سورۃ بقرہ آیت ۲۱) نیز اس سورت میں یہ آیت بھی ہے "یَاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا" (آیت نمبر ۱۶۸) اسی طرح سورۃ النساء مدنی ہے اور اس میں یہ آیت بھی ہے۔ "یَاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ" (سورۃ النساء آیت ۱-) نیز یہ آیت "اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ" (آیت نمبر ۱۳۳) سورۃ الحج مکی ہے۔ اور اس میں یہ آیت ہے: "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا" (سورۃ الحج آیت ۷۷)، اگر مفسرین کی مراد یہ ہو کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے تو یہ بات درست ہے (البرہان، ج ۱-ص ۱۹۰) اصل بات یہ ہے کہ زرکشی نے جن استثنائی آیات کا ذکر کیا ہے ان کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ قاعدہ اکثریہ نہیں بلکہ کلیہ ہے۔ یہ استثنائی آیات زرکشی کی بیان کردہ آیات سے زائد ہرگز نہیں ہیں۔

[۲] الاتقان، ج ۱-ص ۲۹- [۳] البرہان، ج ۱-ص ۱۸۹- (باقی برصفحہ آئندہ)

مکی سورتوں کی بیان کردہ خصوصیاتِ شش گانہ کے پہلو بہ پہلو اگر مستثنیٰ آیات کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ مکی سورتوں کی قطعی علامات ہیں جو ہر مکی سورت پر منطبق ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ علامات اکثریہ (کلیہ نہیں) بھی ہیں جو اکثر و بیشتر مکی سورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ خصوصیات حسبِ ذیل ہیں

مکی سورتوں کی خصوصیاتِ غالبہ:

(۱) مکی سُوَر دآیات ایجاز و اختصار کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کا اندازِ بیان جوشیلا ہوتا ہے اور ان میں صَوتی تجانس و تماثل پایا جاتا ہے۔

(۲) مکی سورتوں میں ایمان باللہ والیوم الآخر کی دعوت دی گئی۔ اور جنت و جہنم کی منظر کشی کی گئی ہے۔

(۳) ان میں اخلاقِ عالیہ اور نیکی پر قائم رہنے کی دعوت دی گئی ہے۔

(۴) مکی سورتوں کا طُرّۂ امتیاز مشرکین کے ساتھ جدل و نزاع اور ان کی کم عقلی کا اثبات ہے۔

(۵) عربوں کے اسلوب کے مطابق مکی سورتوں میں قسمیں کھائی گئی ہیں[۱]

مَدنی سورتوں کی قطعی خصوصیات:

(۱) جس سورت میں جہاد کی اجازت دی گئی اور اس کے احکام پر روشنی ڈالی گئی ہو وہ مدنی ہے

(۲) جس سورت میں حدود و فرائض کے احکام اور مدنی اجتماعی اور دُوَلی حقوق و قوانین بیان کیے گئے ہوں وہ مدنی سورت ہے[۲]

(۳) جس سورت میں منافقین کے عادات و اطوار پر روشنی ڈالی گئی ہو وہ مدنی ہے۔ بخلاف ازیں سورۃ العنکبوت مکی ہے[۳] مگر اس کی گیارھویں آیت مدنی ہے اور اس میں منافقین کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) [۴] البرھان، ج ۱، ص ۱۸۸۔ ارجح قول یہی ہے کہ سورۃ الرعد مکی ہے فکر و نظر اور اسلوب کے لحاظ سے (دحواشی صفحہ ہذا) [۱] بروکلمان (BROCKELMANN) نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں علاماتِ غالبہ کے بارے میں کچھ جدید نظریات کا اظہار کیا ہے۔ جن میں سے اکثر قرآنی اسلوب و انداز کے اعتبار سے صحیح ہیں

[۲] الاتقان، ج ۱، ص ۲۹۔ [۳] البرھان، ج ۱، ص ۱۸۸

(۴) اہل کتاب کے ساتھ جدال و نزاع اور ان کو عدم غلو کی دعوت مدنی سورتوں کی خصوصیت ہے[1]

مدنی سورتوں کی علاماتِ غالبہ:

مدنی سورتوں کی علاماتِ غالبہ حسب ذیل ہیں[2]:-

(۱) مدنی آیات و سُوَر زیادہ تر طویل ہیں اور ان کے انداز بیان میں سکون و اطمینان کی جھلک نمایاں ہے۔

(۲) مدنی سورتوں میں دینی حقائق کے دلائل و براہین بیان کیے گئے ہیں۔

یہ موضوعی و اسلوبی خصوصیات خواہ قطعی ہوں یا اکثری اس بات کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ اسلام نے اپنی دعوت و تبلیغ کے پھیلانے میں کس قدر حکیمانہ تدریج سے کام لیا تھا۔ لہٰذا یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اہل مدینہ کو اسی طرح مخاطب کیا جاتا جیسے اہل مکہ کو اس لیے کہ مدینہ کے نئے ماحول کا تقاضا یہ تھا کہ جدید سوسائٹی کی تشکیل میں وارد شدہ احکام میں تفصیل سے کام لیا جائے۔ اور اس کی آیات و سُوَر میں مخاطبین کی ضروریات اور حالات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ مکہ کے باسی باغی و طاغی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا من بھاتا مشغلہ آنحضور ﷺ اور مومنین کو ستانا اور رلانا تھا۔ اس لیے مکہ میں عموماً مندرجہ ذیل قسم کی آیتیں نازل ہوئیں۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ[3]	ہم جانتے ہیں کہ آپ ان (کفار مکہ) کی باتوں سے غم زدہ ہوتے ہیں۔

فرمایا:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ[4]	آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا۔

---

[1] جیسا کہ سورۃ البقرہ آل عمران، نساء، مائدہ اور توبہ میں ہے۔

[2] اس ضمن میں بلاشیر نے جو نظریات پیش کیے ہیں اگرچہ ان میں جدت پائی جاتی ہے مگر وہ اسلامی دعوت کی روح کے منافی ہیں۔

[3] سورۃ الانعام، آیت ۳۳۔

[4] سورۃ الانعام، آیت ۳۴۔

ارشاد ہوا:

"اور اگر ہم ان پر آسمان کا دروازہ کھول دیتے اور وہ اس میں چڑھنے لگتے تو کہتے کہ ہماری آنکھوں پر نشہ طاری کیا گیا ہے، بلکہ ہم جادو زدہ قوم ہیں[1]"

اسی طرح مکہ میں زیادہ تر ایسی آیتیں نازل ہوئیں جو مشرکین کے زجر و عتاب ان کی کم عقلی کے اثبات رسول کریمؐ اور مومنین کے اطمینانِ قلب اور عفو و درگزر کی تعلیمات پر مشتمل تھیں۔

مدینہ کا معاملہ مکہ سے یکسر مختلف تھا۔ اس میں ہجرت کے بعد تین طرح کے لوگ بستے تھے

(۱) اہل اسلام مہاجرین و انصار۔

(۲) منافقین۔

(۳) یہودی۔

جہاں تک یہود کا تعلق ہے قرآن نے ان کو دعوتِ اسلام دی۔ منافقین کو رسوا کیا اور ان کے دجل و فریب کا پردہ چاک کیا۔ اہل اسلام کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو صلح و جنگ کے قواعد اور انفرادی و اجتماعی اور سیاسی و اقتصادی زندگی کے مسائل و احکام سے روشناس کرایا۔ اگر زکوٰۃ کی فرضیت کے احکام مکہ میں نازل ہوتے تو وہ بے معنی ہوتے۔ کیونکہ مکی زندگی میں مسلمان مفلس و قلاش تھے۔ اسی طرح صلوٰۃ الخوف کا تعلق حرب و قتال سے ہے۔ لہٰذا وہ مکہ میں مشروع نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ قتال کی اجازت مسلمانوں کو مدینہ میں دی گئی تھی۔ مکی سورتیں جہاد اور اس کے متعلقات کے ذکر و بیان سے مکمل طور پر خاموش ہیں

اگر ہم ابوالقاسم نیسابوری کے ہمنوا ہوتے ——— جس نے مکی و مدنی کی ترتیب میں تاریخی ادوار کو پیش نظر رکھا تھا ——— تو اس کے زیر اثر مکی مدنی سورتوں کو تین مراحل میں تقسیم کرتے۔ (۱) ابتدائی (۲) متوسط (۳) آخری۔ مگر اسانیدِ صحیحہ اور محدثین کے معیار نقد و جرح کی موجودگی میں ہم یہ زحمت اٹھانے سے بے نیاز ہیں۔ مدنی سورتوں میں شک و شبہ

---

[1] سورۃ الحجر آیت ۱۴-۱۵۔

کی گنجائش بہت کم ہے اس لیے کہ مدینہ میں اسلام پھیلا۔ قرآن کریم کو سینوں اور سفینوں میں محفوظ کیا گیا۔ قاری اور کاتبوں کی تعداد بڑھ گئی۔ نقل و کتابت روایتِ حدیث اور دین کے فہم ادراک کے وسائل میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

مکی زندگی کے تقاضے اس سے یکسر جداگانہ نوعیت کے تھے۔ مکی احوال و واقعات خود شک و تردد کے مقتضی تھے۔ خصوصاً مکی زندگی کے ابتداء میں۔ کیونکہ اسلام مکہ میں پہلے پہل بے کس اور لاوارث تھا۔ صرف چند اشخاص اسلام لائے تھے۔ سابقین اولین کے سوا دوسرے مسلمان نزولِ قرآن کے مراحل اور ابتدائی سورتوں کی تعیین سے قاصر تھے۔

مگر بات یہ ہے کہ اگر ہم ان سورتوں کو نظر انداز کر دیں جن کی ترتیبِ زمانی اور سابق و مسبوق کی تعیین میں علمائے محققین کے یہاں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ تو ہم ایسی مشترکہ خصوصیات کی نشان دہی کر سکتے ہیں جن سے پورے جزم و وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں سورت آیا آغازِ اسلام میں اتری یا وسط اور آخر میں۔ نیز یہ کہ مکہ میں اتری یا مدینہ میں۔

مکی و مدنی سورتوں کے تین مراحل :

جن سورتوں کے بارے میں مورخین اور مفسرین نے بالاتفاق کہا ہے کہ وہ آغازِ وحی میں نازل ہوئیں۔ یا یوں کہیے کہ مکی زندگی کے پہلے مرحلہ میں اتریں۔ وہ یہ سورتیں ہیں۔

ابتدائی مرحلہ :۔ العلق[1] ۔ المدثر[2] ۔ التکویر[3] ۔ الاعلیٰ[4] ۔ اللیل[5] ۔ النشرح[6] ۔ العادیات[7] ۔ التکاثر[8] النجم[9] ۔

درمیانی مرحلہ :۔ مکی زندگی کے درمیانی مرحلہ میں یہ سورتیں اتریں۔
عبس[1] ۔ التین[2] ۔ القارعۃ[3] ۔ القیامۃ[4] ۔ المرسلات[5] ۔ البلد[6] ۔ الحجر[7] ۔

آخری مرحلہ : آخری مرحلہ پر یہ سورتیں نازل ہوئیں۔
الصافات[1] ۔ الزخرف[2] ۔ الدخان[3] ۔ الذاریات[4] ۔ الکہف[5] ۔ ابراہیم[6] ۔ السجدۃ[7] ۔

اگرچہ سورتوں کی ان اقسام سہ گانہ پر مکی ہونے کے علامت روشن ہیں تاہم فکر و نظر اور اسلوب

انداز کے اعتبار سے ان میں تھوڑا سا فرق بھی پایا جاتا ہے یہاں تک کہ تینوں قسموں میں سے ہر قسم بلکہ ہر سورت کی اپنی ایک فکری وحدت ہے جو اسی کے ساتھ قائم ہے مندرجہ ذیل سطور میں ہم ان سورتوں کا ہلکا سا تجزیہ پیش کریں گے۔ جس میں ان سورتوں کے الفاظ و فواصل اور ان میں بیان کردہ عقائد کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

ابتدائی سورتوں میں مندرجہ مضامین

سورۃ العلق:

ہم قبل ازیں سورۃ العلق کے بارے میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ سب سے پہلے نازل ہوئی[1]۔ اس سورت میں ایک عظیم ترین واقعہ کی منظر کشی کی گئی ہے جو انسانی تاریخ میں رونما ہوا۔ انسانیت نے بچشم خود دیکھا کہ اس کو ایک نئی زندگی نصیب ہوئی ہے جس نے اس کو خاکدانِ ارضی سے اٹھا کر عالم بالا تک پہنچا دیا۔ چنانچہ اس سورت کا نقطۂ آغاز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملأ اعلیٰ کی صف میں شامل کر دینا اور خدا کا نام زبان پر لانے کی ہدایت[2] کرتا ہے۔ اس لیے کہ ذاتِ ایزدی انسان کی ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی۔ اسی ذات نے انسان کو اسرارِ وجود کی تعلیم سے بہرہ ور کرکے اسے عزت بخشی۔ قلم کو استعمال کرنے کا طریقہ سکھلا کر اسے علم و تعلیم کا رمز آشنا بنایا حالانکہ اسے حقیر چیز یعنی جامد خون سے بنایا گیا ہے جو رحم میں قرار گزین رہا[3]۔

---

[1] صحیح بخاری، ج ۱۔ ص ۷۔ باب بدء الوحی۔

[2] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا جو حکم دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر جو وحی نازل ہوئی ہے الہام خداوندی کی مدد سے اس کی تلاوت کیجیے یہ مطلب نہیں کہ دیکھ کر پڑھیے جیسے کوئی خواندہ آدمی پڑھتا ہے۔ کیونکہ آپ اُمّی تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے آپ نے جبریل سے فرمایا تھا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ مستشرق بُہل نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس ضمن میں جو مقالہ لکھا ہے ہم اس سے متفق ہیں۔

[3] تفسیر طبری، ج ۳۰۔ ص ۱۶۱۔

سورۃ المدثر :

سورہ المدثر وحی کی رکاوٹ کے بعد نازل ہوئی۔ آغاز سورت میں آپ کو خبردار کیا گیا ہے۔ کہ خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں ۔غفلت کو چھوڑ کر مستعدی اور چستی اختیار کریں۔ اپنا نرم و گرم بستر چھوڑ دیں۔ کیونکہ آپ کو ایک عظیم و ضخیم کام انجام دینا ہے۔ جو لوگ خواب غفلت میں گرفتار ہیں ان کے لیے خطرے کی گھڑی جلد آ رہی ہے۔ رسول کا کام یہ ہے کہ خواب غفلت کے ماتوں کو بیدار کرے۔ اپنے رب کی عظمت کے گن گائے۔ اور اس راہ کی مشکلات کو خاطر میں نہ لائے۔ اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھے۔ شرک اور نجاست کو خیرباد کہہ دے۔ عذاب کے موجبات سے کنارہ کش ہو۔ مجاہدین کی طرح کسی قربانی سے گریز نہ کرے۔ اور کسی پر احسان نہ دھرے[۲]

سورۃ التکویر :

سورہ التکویر میں تین حقائق کی عقدہ کشائی کی گئی ہے جن کا ایمان و عقیدہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے

۱ وہ انقلاب جو روز قیامت برپا ہوگا

۲ ابدی وحی کی حقیقت اور عالمی دعوت

۳ انسانی ارادہ کی حقیقت جو خدا کی مشیت سے وابستہ ہے[۳]

آغاز سورت میں قیامت کے روز بپا ہونے والے انقلاب کی بڑی مہیب اور خوفناک تصویر کھینچی گئی ہے۔ جب قیامت آئے گی تو آفتاب کی روشنی بجھ جائے گی۔ اس کی حرارت و تمازت برودت میں بدل جائے گی۔ ستارے بکھر جائیں گے اور ان کی روشنی مٹ جائے گی۔ پہاڑ پارہ پارہ ہو کر بادلوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے۔ دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں جو عربوں کو جان سے بھی عزیز تر ہوتی ہیں بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔ کوئی ان کا قدردان نہ ہوگا۔ جنگلی جانور ڈر کے مارے اکٹھے ہو جائیں گے۔ سمندروں کا پانی آگ کی تپش سے ابل ابل کر بہنے لگے گا۔ جو

---

۱ صحیح بخاری ج ۶ ص ۱۰۱ ۲ تفسیر طبری ج ۲۹ ص ۹۰

۳ تفسیر کبیر امام رازی ج ۸ ص ۲۲۷

روحیں دنیا میں باہم مانوس ہوں گی وہاں اکٹھی ہوں گی۔ جس لڑکی کو بکمالِ سنگ دلی زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ اس سے دریافت کیا جائے گا کہ یہ سزا اس کو کس جرم میں دی گئی تھی؟ آخر ایک انسان سے ایسی جسارت کیوں کر سرزد ہو سکتی ہے؟

اُخروی انقلاب جب بپا ہو گا تو اعمال نامے کھل جائیں گے اور کوئی بات پوشیدہ نہ رہے گی۔ نیلا آسمان اپنی جگہ چھوڑ دے گا۔ لوگوں اور پتھروں کے ایندھن سے جہنم کی آگ کو بھڑکایا جائے گا۔ جنت کو نیک لوگوں کے قریب لایا جائے گا۔ وہ نئی نویلی دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ ہو گی اور مومنین کو لطف اندوزی کی دعوت دے گی۔ اس روز ہر شخص اپنے اگلے پچھلے اعمال سے آگاہ ہو جائے گا۔ اور جان لے گا کہ عذاب سے بچنے کے لیے اس نے کن اعمال کا ذخیرہ جمع کیا ہے۔

انقلاب قیامت کے ذکر و بیان کے بعد وحی اور اس کے متعلقات کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ تمہید کے طور پر مشاہد کونیہ کی قسم کھا کر وحی کی حقیقت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ستاروں کی قسم کھائی کہ وہ آسمان پر چلتے اور پھر واپس لوٹ کر یوں چھپ جاتے ہیں جس طرح ہرنیاں اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی ہیں۔ پھر آ کر اپنی کمین گاہ میں چھپ جاتی اور آرام کرتی ہیں۔ پھر رات کی قسم کھائی جو پوری کائنات کو اپنے پردۂ ظلمت میں چھپا لیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ پھر صبح کی قسم کھائی جو رات گزرنے پر جنم لیتی ہے ہر طرف روشنی کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور ہر چیز میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے مذکورہ بالا مشاہد کونیہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ وحی کے لانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے[1] بلکہ ایک باعزت فرشتہ بامرِ خداوندی آپ کو وحی سکھاتا

---

[1] اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راولپنڈی میں ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمن نے ایک کتاب "اسلام" نامی بزبان انگریزی لکھی ہے جو یورپ میں چھپی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس میں فرماتے ہیں کہ سارا قرآن کلام الٰہی نہیں ہے بلکہ اس کا معتدبہ حصہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہے۔ اس کو یہ قوت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ اس عظیم امانت کو آسمان سے زمین تک پہنچا دے اس کو دیگر فرشتوں میں یہ مرتبہ حاصل ہے کہ سب اس کی اطاعت پر فخر کرتے ہیں۔

زندہ مشاہد کی قسم کھا کر فرمایا کہ محمدؐ وحی کا پیغام ادا کرنے میں امین ہیں۔ آپ دانشمند ہیں بعثت سے قبل اہل مکہ آپ کو چالیس[۲] سال تک آزما چکے ہیں۔ اہل مکہ نے آپ کو صادق وامین کے لقب سے ملقب کیا تھا۔ اب وہی محمدؐ ان کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے بچشم خود فرشتہ وحی کو افق پر دیکھا۔ اس میں آپ سے ہرگز کسی غلطی کا صدور نہیں ہوا اور نہ نگاہ اچٹی۔[۱] حیرت ہے کہ اب کفار مکہ کن خیالات کا اظہار کر رہے ہیں؟ اور کس طرح اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ آپ مجنوں ہیں اور آپ پر شیاطین نازل ہوتے ہیں؟

سورت کے خاتمہ پر اہل مکہ کو اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ تنہا صرف وہی وحی الٰہی

(حاشیہ صفحہ سابقہ) آنحضورؐ کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ صوبائی اسمبلی میں اس پر بحث ہو چکی ہے اور آج کل اخبارات میں اس کا بہت چرچا ہے۔ ایک مسلمان حکومت کے اپنے ادارہ سے جب ایسی غیر اسلامی باتوں کی اشاعت ہونے لگے تو مستشرقین کی خرافات پر اظہار قلق وملال بے معنی ہے۔ (غلام احمد حریری)

[۱] قرآن کریم میں فرشتہ وحی (حضرت جبریل) کے احوال واوصاف اور ان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا ذکر واشگاف الفاظ میں کیا گیا ہے۔ مگر اس کے باوصف مستشرقین پر عجیب قسم کا خبط سوار رہتا ہے اور وہ اس ضمن میں طرح طرح کے شکوک وشبہات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس امر پر معترض ہوتے ہیں کہ مکہ میں قرآن کا جو حصہ نازل ہوا اس میں جبریل کا نام مذکور نہ تھا۔ شاید آپ نے مدینہ جا کر یہ نام یہود سے سیکھا۔ حالانکہ مکہ مکرمہ میں قرآن کا جو حصہ نازل ہوا اس میں جبریل کے احوال واوصاف واضح الفاظ میں بیان کیے گئے تھے۔ ان اوصاف کے ہوتے ہوئے نام کی ضرورت نہ تھی۔ مگر مستشرقین کے نزدیک اہمیت اسماء کی ہے مسمیات کی نہیں۔ از روئے انصاف مسمیات اسماء سے اور حقائق ظاہری صور واشکال سے مقدم ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ اوصاف صرف جبریل پر صادق آتے ہیں نیز یہ کہ صفات کا بیان کرنا جبریل کا نام لینے سے بہتر ہے۔ کیونکہ اُمّی لوگوں کو وحی کے حقائق سے بتدریج آگاہ کرنا ہی قرین مصلحت ہے۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے وہ مدنی سورتوں میں جبریل کا ذکر ان کے لیے موجب حیرت نہ تھا۔ یہ حقائق ان کے یہاں پہلے بھی معروف تھے۔ قرآن نے صرف ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کیونکہ قرآن ان کے حقائق ثابتہ کا منکر نہیں بلکہ مؤید ہے۔

کے مخاطب نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمی[۵۱] دعوت ہے۔ وہ اس کی کس قدر بھی مخالفت کریں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کریں۔ مگر یہ ہر قیمت پر پھلے پھولے گی۔ نیز یہ کہ جو شخص بھی حق و ہدایت کی راہ پہ گامزن رہنا چاہے۔ اس کے لیے اس دعوت کا دروازہ چوپٹ کھلا ہے۔

سورۃ التکویر کی آخری آیت میں یہ حقیقت واضح کی کہ فاعلی اور حقیقی ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ خداوند علیم وخبیر کے ارادہ سے الگ ہو کر کسی کا ارادہ معتبر نہیں۔ اسی نے انسان کو ہدایت سے بہرہ ور کیا اور انسان کو اپنے ارادہ میں بااختیار بنایا اگر انسان فعل مختار نہ ہوتا تو اسے شرعی احکام کا مکلف و مامور نہ بنایا جاتا۔

سورۃ الاعلیٰ :

سورۃ الاعلیٰ میں خدا کی حمد وثنا کا ترانہ الاپا گیا ہے۔ وہی ذات خداوندی جس نے ہر چیز کو ٹھیک حالت میں بنایا اس کا راستہ معین کیا۔ اس کو غایت وجود سے آگاہ کیا۔ جملہ مخلوقات کے لیے رزق کا سامان کیا۔ خواہ وہ سبز چارے کی قسم سے ہو یا سیاہی مائل اس سورت میں اس بات کی ذمہ داری لی گئی ہے کہ قرآن کو آپ کے سینہ مبارک پر ثبت

---

[۵۱] اس آیت نے مکی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ اسلامی دعوت عام بھی ہے۔ اور عالمی بھی۔ اس لیے آیت قرآنی اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ کا مفہوم یہی ہے کہ یہ دعوت عالمی ہے۔ اس سے کوئی دوسرا مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اس بات کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ یہود بھی اس میں کوئی دسترس رکھتے تھے۔ کیونکہ جمہور علماء کے نزدیک بالاتفاق یہ سورت پوری کی پوری مکی ہے۔ بلکہ مکہ کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔ مستشرقین بھی حسب عادت اس سے منحرف نہیں ہو سکتے۔ سب مستشرقین نے اس کو مکہ کی ابتدائی سورتوں میں شمار کیا ہے۔ البتہ بعض مستشرقین نے یہاں سے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ آیا "عالمین" سے عموم محلی یعنی مکہ کے سب رہنے والے مراد لیے جا سکتے ہیں؟ یا یہ ضروری ہے کہ اس سے سب دنیا کے رہنے والے مراد ہوں؟ اس کے باوجود مستشرقین اعتراف کرتے ہیں کہ اسلامی دعوت کی توسیع کے سلسلہ میں یہ آیت عدیم النظیر ہے۔

دیکھیے : BLACHERE, TRAD, II, ۲۹

کرنا ہمارا کام ہے۔ اس ضمن میں آپ کو جہد و سعی سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ آپ ایک حرف بھی نہیں بھولیں گے۔ کیونکہ حفظ و نسیان کا تعلق مشیت ایزدی سے ہے۔ انسان سے نہیں۔ انسان تو ہمیشہ سہو و نسیان کا شکار رہتا ہے۔ اس سورت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو بشارت دی گئی ہے کہ آپ کے لیے اس دعوت کی ذمہ داریوں کو آسان بنا دیا گیا ہے۔ اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ اس دعوت کے سلسلہ میں لوگوں کا طرز عمل یکساں نہیں ہے۔ بعض لوگ وہ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

بعض وہ ہیں جو اپنی ظلمت و ضلالت اور ناشکری کی وجہ سے دنیا ہی میں بدبخت ہوتے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو آخرت میں دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔ یہ ان کی بدبختی ہے۔ نہ جہنم میں موت آئے گی کہ وہ اطمینان پا سکیں۔ نہ راحت و آرام کی زندگی نصیب ہوگی۔ اس سورت میں ہر سلیم الفطرت انسان کو بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ اور طہارت فلاح و نجاح کی موجب ہے۔ بخلاف ازیں نجاست و خباثت سبب خسران ہے۔ یہ دنیائے عاجلہ فنا پذیر ہے۔ آخرتِ خالدہ باقی رہے گی۔ سورت کے آخر میں وحدتِ دین پر روشنی ڈالی۔ ربِ خالق نے ہدایت کا جو پیغام قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا۔ قبل ازیں اسی قسم کا پیغام شیخ الانبیاء علیہم السلام حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ پر اتارا گیا تھا۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ ایک ہی دین ہے۔ اس کی تعلیمات میں وحدت و یگانگت پائی جاتی ہے۔ ان سب تعلیمات کا مصدر و ماخذ اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ رب العالمین کی ذات سے ہے[۵۲]

---

[۵۱] تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۹۸ ۳۔ نیز تفسیر نسفی ج ۴ ص ۲۶۰

[۵۲] اسلامی دعوت نے مکی زندگی کے اولین مرحلہ پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ وہ ایک عالمی پیغام ہے اور اس کے اصول باقی آسمانی مذاہب کی طرح ہیں۔ ان میں کوئی فرق و امتیاز (باقی بر صفحہ آئندہ)

سورۃ اللیل :

سورۃ واللیل[۱] میں خلاقِ عالم نے گردشِ لیل و نہار اور تخلیقِ نر و مادہ کی قسم کھا کر بتایا کہ دنیوی زندگی میں لوگوں کے طور طریقے مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا انجام بھی یکساں قسم کا نہیں ہوگا۔ جس طرح دن کی درخشاں صورت تاریک رات سے مختلف ہوتی ہے۔ اور صنفِ نازک کا مزاج مردوں کی تند و تیز طبیعت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اہلِ تقویٰ اور جرائم پیشہ لوگوں کے اعمال بھی یکساں نتائج کے حامل نہیں ہو سکتے۔ یہ یقینی بات ہے کہ سعادت مند لوگوں کا اجر و ثواب بدنصیب لوگوں کی سزا سے مختلف ہوگا۔ خدا کی خوشنودی کا انعام صرف اسی خوش نصیب کے حصہ میں آئے گا جو خدا سے ڈرتا اور بھلائی کی تصدیق کرتا ہو[۵۱]

سورۃ الشرح :

یہ سورت نہایت شیریں اور لذیذ مناجات پر مشتمل ہے۔ اس سورت میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مژدہ سنایا گیا ہے کہ جس گراں بار بوجھ نے آپ کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اس کو آپ سے دور کر دیا۔ مشکلات کی گرہ کشائی کر دی۔ آپ کا سینہ کھول دیا اور معاملہ آسان کر دیا۔ ارض و سماء میں آپ کے مقام کو بلند کر دیا۔ اور صبح و شام آپ کے نام کو اپنے نام کے ساتھ مقرون و متصل کر دیا۔ ارشاد فرمایا کہ جب آپ لوگوں کی ملاقات سے فارغ ہوں۔ اور اسلامی دعوت کے طویل مشاغل سے فرصت پائیں[۱]۔ تو دل لگا کر خدا کی عبادت کریں[۵۲]

(بقیہ صفحہ سابقہ) نہیں پایا جاتا۔ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں سے اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن نے اس امر کا انتظار نہیں کیا کہ آپ مدینہ ہجرت کر کے یہود سے ملیں اور سابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں سے باخبر ہوں۔ بلکہ مکہ میں ہی اسلامی دعوت کے عالمی ہونے اور وحدتِ دین کا اعلان کر دیا۔

[۵۱] تفسیر طبری ج ۳۰ ص ۱۲۸

[۵۲] تفسیر کبیر للرازی ج ۸ ص ۴۲۸

سورۃ العادیات[1]:

سورۃ العادیات میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم کھائی جو میدان حرب و قتال میں ہانپتے کانپتے اور ہر طرف بھاگتے پھرتے ہیں۔ دوڑتے وقت جب ان کے سم پتھروں سے ٹکراتے ہیں تو ان سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ وہ علی الصبح اچانک غبار اڑاتے ہوئے دشمن کی سرزمین پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ پھر دشمن کے لشکروں اور ان کے بلاد و دیار میں گھس جاتے ہیں۔ جس سے دشمن گھبرا جاتا اور راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے[2]

خداوندِ عالم ان ہانپنے کانپنے والے گھوڑوں کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ انسان رب قدیر کی نعمتوں کا منکر اور ناشکرا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اسے خود اپنی ناسپاسی کا اعتراف ہے ناسپاسی کی بڑی وجہ اس کی فطری حب مال و جاہ اور زندگی کے ساز و برگ سے بے پناہ تعلق خاطر ہے۔ انسان کے لیے زیبا ہے کہ اپنے آپ کو حرص و ہوا کی زنجیروں سے آزاد کرے اور اپنے بھائیوں کے انجام پر غور و فکر کی زحمت گوارا کرے۔ وہ ذرا اس منظر کو نگاہ تصور میں لائے جب بنی نوع انسان کو قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ ان کے اسرار نہانی کا پردہ چاک کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں بتائے گا کہ وہ منکر و ناسپاس تھے۔ اس وقت ان کو ان کے اعمال قبیحہ کی سزا دی جائے گی۔

---

[1] تفسیر کشاف ج ۴ ص ۲۲۸

[2] اس سورت میں بھاگتے دوڑنے اور ہانپنے کانپنے والے گھوڑوں کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ مجاہدین کے گھوڑوں کے سوا کسی چیز پر صادق نہیں آتی۔ مگر اس کا کیا جائے کہ مستشرقین اپنی روایتی بلادت و غباوت کے باعث اس کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ جب وہ گھوڑوں کی ہنہناہٹ سموں کے ٹکراؤ گرد و غبار کے پھیلاؤ اور فرار اعداد کے ذوق شناس نہ ہو سکے تو حسب عادت تاویلوں کا سہارا لینے لگے۔ انہوں نے کہا ان سے وہ اونٹ مراد ہیں جن پر حاجی سوار ہو کر عرفہ سے مزدلفہ جاتے ہیں۔ یا مزدلفہ سے منیٰ کا سفر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ عربی اشعار سے بھی استشہاد و استدلال کرتے ہیں۔

سورۃ التکاثر :

اس سورۂ کریمہ میں ان تغافل شعار اور بے کار لوگوں کو ڈرایا دھمکایا گیا ہے جو مال واولاد پر فخر کرتے کرتے قبر کے تنگ و تاریک گڑھے تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں حسد و رقابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب وہ خطرناک قسم کے مصائب سے دوچار ہوں گے تو ان پر عذاب الٰہی کی حقیقت عیاں ہو گی۔ وہ جہنم اور اس کے عذاب کو بچشم خود ملاحظہ کریں گے۔ عذاب میں مبتلا ہو کر وہ انواع و اقسام کی نعمتوں کو بھول جائیں گے[۱]

سورۃ النجم :

سورۃ النجم میں وحی کی حقیقت اس کے طریقِ اخذ و تلقی فرشتۂ وحی کے تعارف اور نزولِ قرآن کے اسلوب و انداز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس سورت میں بتوں اور ان کے پجاریوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ فرشتوں کے بارے میں عربوں کے غلط عقائد کی تصحیح کی گئی اور تخلیق کائنات کی حکمت و مصلحت کو واضح کیا گیا ہے۔ نیز بتایا کہ اصول عقائد اور جزا و سزا کے بارے میں سب انبیاء کی تعلیمات یکساں تھیں دین اسلام کی تضحیک کرنے والوں کو بتایا کہ ان کی تباہی و بربادی کا وقت قریب آگیا ہے اور ان کو اقوام سابقہ کی طرح کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔

خالقِ کائنات نے ستارے کی قسم کھائی جب وہ اپنی چمک دکھا کر جاتا اور وسطِ آسمان میں ہونے کے بعد نیچے لٹک جاتا ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے مبلغ اور ہدایت یافتہ ہیں۔ راہ ضلالت سے آشنا تک نہیں۔ جو قوم آپ کی وحی کی مخاطب ہے وہ عرصہ دراز پہلے آپ کو جانچ پرکھ چکی ہے۔ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس لیے آپ کی طرف

---

[۱] تفسیر کشاف ج ۴ ص ۲۸۰

[۲] تفسیر کبیر الرازی ج ۷ ص ۶۹۵ نیز تفسیر نسفی ج ۳ ص ۸۲ و تفسیر طبری ج ۲۷ ص ۲۴

نازل شدہ وحی شک و شبہ سے بالا ہے۔ جو فرشتہ آپ کی طرف وحی لے کر آتا ہے بڑا طاقتور اور عظیم الجثہ ہے۔ جب وہ پر پھیلاتا ہے تو فضا بھرپور اور معمور ہو جاتی ہے[1]

سالارِ رسل صلی اللہ علیہ وسلم جبریل سے مل چکے تھے اور دو دفعہ ان کو اصلی صورت میں دیکھا تھا۔

۱ ایک مرتبہ آغاز وحی میں آپؐ جبریلؑ سے ملے اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا تھا۔ آپ نے جبریل کو یقینی طور پر قریب سے دیکھا تھا۔ آپ کا دل اور نگاہ اس دید سے مطمئن تھی

۲ دوسری دفعہ شب معراج میں۔ جب آپ نے جبریل کی معیت میں آسمانوں کا واقعی اور حقیقی سفر کیا۔ اور خدا کے بڑے بڑے نشانات کو دیکھا۔ حتیٰ کہ سدرۃ المنتہیٰ تک[2] پہنچ گئے۔ جہاں ہر چیز پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے اور اولین و آخرین کا علم وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے آپ نے دیکھا کہ متقی لوگوں کی جنت فردوس سے قریب تر ہے صدیقین ملائکہ اور مقربین[3] کی روحیں اسی جنت میں راحت گزین ہوتی ہیں۔ جو نشانیاں آپ نے

---

[1] یہاں بھی جبریل کا ذکر اس کی نمایاں صفات کے پردہ میں کیا گیا ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا گویا مسمّٰی کی موجودگی میں اسم کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور ظاہری تشکل و صورت بیان کرنے کے بعد اس کی ماہیت و حقیقت سے تعرض نہیں کیا گیا بنا بریں سورۃ التکویر کی طرح اس سورت میں بھی تدریجاً کفار کو ملکی حقائق سے آگاہ کیا گیا ہے۔

[2] ہماری حیرت کی حد نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ "امیر کا بیتانی نے" مسلم مفسرین سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کے لفظ سے ایک مقام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مکہ کے قریب واقع تھا۔ دیکھئے

(CAETANI, ANNALI DELL ISLAM, ۲۳۱)

[3] مستشرقین کی ایک اور اعجوبہ پسندی ملاحظہ فرمایئے کہ اسپرنگر مور روادہ اور فیلا کی رائے میں "جنۃ الماویٰ" مکہ کے نواح میں ایک گھنے باغ کا نام ہے۔ SPRINGER —

— DAS LEBEN UND DIE LEHER DES MOHAMMAD 307

MULLER DER ISLAM. 65

دیکھیں ان کے بارے میں کون شخص آپ سے جھگڑا کر سکتا ہے؟ ان نشانات کو دیکھتے وقت آپ کی نگاہ نہ اچٹی اور نہ آگے بڑھی۔

وحی ایک زندہ اور مرئی حقیقت تھی۔ اس کے مقابلہ میں لات ومنات عُزّیٰ اور دیگر بتوں کی عبادت افسانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی عربوں نے ظن و ہویٰ سے کام لے کر اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ بت فرشتے ہیں اور فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ غیر عادلانہ تقسیم تھی۔ اس لیے کہ وہ خود تو بیٹیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اور ان کو خدا کی طرف منسوب کرتے تھے وہ فرشتوں کو جو خدا کے بندے تھے مادہ قرار دیتے تھے۔

عرب جن اسماء و القاب کو کبھی بتوں اور کبھی فرشتوں پر چسپاں کرتے تھے وہ مفہوم و مدلول سے عاری تھے۔ دلیل و منطق بھی ان کے حق میں نہ تھی۔ ایسی بے حقیقت اشیاء سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعراض و انحراف اور فاطر السموٰت والارض کی جانب توجہ آپ کے لیے کس قدر موزوں تھی؟

خداوند کریم نے جب سے انبیاء و رسل علیہم السلام کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا اسی وقت سے دنیا میں خدا کے یہاں باز پرس اور جزاء و سزا کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اصول عقائد میں سب کے یہاں اتفاق پایا جاتا ہے۔ سب مذاہب لوگوں کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہیں۔ ہر چیز کا مرجع و مرکز ذات الٰہی ہے۔ یہ سب باتیں حضرت ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں موجود تھیں۔ ان میں یہ بھی مذکور تھا کہ اللہ تعالیٰ جمع بین النقیضین پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ مرنے کے بعد وہ حیات نو بخشتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان میں ہنسنے اور رونے کے محرکات پیدا کر دیئے ہیں۔ پہلے انسان کو زندگی بخشی اور پھر اسے موت کے لیے تیار کیا۔ مادہ تولید میں نر یا مادہ کی خصوصیت پیدا کی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیا حیات نو عطا کرنا اس کے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنے سے آسان تر نہیں ہے؟

یہ سب کچھ اس لیے فرمایا تاکہ مشرکین اپنی قدرت کی حدود پہچانیں اپنی سرکشی سے باز آجائیں اور اس بات کو یاد کریں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح تکذیب کرنے والوں اور انکار کرنے والوں کو ہلاک کر دیا اور ان پر ہلاکت و بربادی نازل کی اور تاکہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ خطرہ ان کے سر پر منڈلا رہا ہے اور ان کی ہلاکت قریب ہے اور تاکہ وہ بارگاہ ایزدی میں اس سے قبل سجدہ ریز ہوں کہ حالت کفر میں ان کی روح قفس عنصری سے جدا ہو جائے۔

ابتدائی مکی سورتوں کا اسلوب و انداز:

ابتدائی مرحلہ کی مکی سورتوں میں جو کثیر مطالب و معانی پائے جاتے ہیں یہ ان کا ایک جزء ہے۔ ہم نے ان میں سے صرف انہی افکار و عقائد اور تعلیمات کا خلاصہ تحریر کیا ہے جو ہمارے اور علمائے محققین کے نزدیک ثابت ہیں۔ ان کے ابتدائی مرحلہ کی سورتیں ہونے میں شبہ نہیں ہمارا یہ تجزیہ قدرے مختصر ہے۔ مگر ان سورتوں میں بیان کردہ حقائق و مشاہد پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اس تجزیہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے ابتدائی مرحلہ کی سورتیں دوسری دونوں قسم کی مکی سورتوں سے اپنے اسلوب و انداز کی بناء پر ممیز و ممتاز ہو جائیں گی۔ اسی طرح مدینہ میں نازل شدہ ابتدائی درمیانی اور آخری سورتوں سے بھی ان کا فرق واقتیاز ظاہر ہو جائے گا۔

مکہ مکرمہ کی ابتدائی مرحلہ کی سورتوں میں زیادہ تر نزیج وحی خداوند تعالیٰ کی قدرت و رحمت حشر و نشر مناظر قیامت تخویف مشرکین اخروی باز پرس ثواب و عقاب کفار مکہ کے مظالم پر آنحضور کو تسلی دلانا دین کی اصولی وحدت دعوت اسلام کی ہمہ گیری سے متعلق مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ان سورتوں کے نمایاں مضامین ہیں۔ اگرچہ ان کا طرز و انداز جداگانہ نوعیت کا ہے۔

ہمارے لیے یہ بات بڑی آسان ہے کہ ہم ایک ایک کر کے ان سورتوں کو دوبارہ

پڑھیں۔ اس سے ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو گی۔ کہ یہ سورتیں قصیر النجم اور شدید الایجاز ہیں۔ ان میں اکثر مشاہد کونیہ کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان میں زیادہ تر انشا کے صیغے یعنی امر نہی استفہام تمنّی اور ترجی کے افعال استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ چیدہ و برگزیدہ الفاظ پر مشتمل ہیں۔ ان میں حروفِ مہموسہ بھی ہیں اور مجہورہ بھی۔ ان کے ہم وزن و ہم قافیہ فواصل بڑی خوش آہند آواز کے حامل ہیں۔ بعض اوقات ان سے لہریں پیدا ہوتی ہیں کبھی آواز میں تھرتھراہٹ اور کبھی کپکپاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی شدت پیدا ہو جاتی اور آواز زور سے نکلتی ہے۔ بعض اوقات معنوی اور جامد اشیاء کو مجسم صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ خاموش چیزوں کو حرکت زندگی اور کلام سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔ ان امور و اوصاف کی بناء پر ان سورتوں نے ایسی فنی صورت اختیار کر لی ہے جن میں زندگی کے آثار نمایاں ہیں۔

متوسط مرحلہ کی سات مکی سورتوں کا تجزیہ

جب ہم ان سورتوں کے تحلیل و تجزیہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جو مکی زندگی کے دوسرے مرحلہ پر اتریں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سورتوں میں بھی وہی موضوعی اور اسلوبی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ابتدائی سورتوں میں موجود تھیں۔ ہر سورت میں وہی افکار و تعلیمات اور وہی نغمے اور الحان پائے جاتے ہیں۔ البتہ بعض سورتوں میں چند عقائد و حقائق کا اضافہ ان کو ایک جداگانہ امتیازی شان بخشتا ہے۔ نیز ان کی ہم رنگی و ہم آہنگی کان و دل کو فرحت و مسرت سے بھر دیتی ہے۔

۱۔ سورۃ عَبَسَ:

مثلاً سورہ عَبَسَ مکی زندگی کے دوسرے مرحلہ سے تعلق رکھتی ہے یہ سورت یقیناً متوسط مرحلہ کی ابتدائی سورتوں میں شامل ہے۔ اس سورت میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے اس واقعہ کا حاصل یہ ہے کہ بظاہر ی

امور پر نہیں بلکہ حقائق پر مرکوز ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس ضمن میں انسانی قدر و قیمت حقیقت حیات حقیقتِ انسان حقیقتِ قیامت سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ حقائق عظیمہ انتہائی سحرانگیز اور اثرخیز انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے فواصل بڑے پرزور اور ہم آہنگ ہیں۔

حضرت ابن اُم مکتوم رضؓ ایک نابینا اور تنگدست صحابی تھے۔ ایک دفعہ بارگاہِ رسالت میں طلب علم کے لیے حاضر ہوئے تو آپ نے اظہار ناراضگی فرمایا۔ اس انفرادی حادثہ کے سلسلہ میں آپ پر شدید عتاب نازل ہوا[۱] اس سورت میں ارشاد ہوا کہ ارضی قیمت کے بجائے آسمانی قدر و قیمت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ انسانوں نے عزّ و وقار کے جو سانچے اور پیمانے تیار کر رکھے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں شریعت عادلہ کی میزان و مقیاس کو ترجیح دینا چاہیئے۔ فرمایا کہ اس واقعہ کو سرچشمہ بصیرت اور موجب عبرت و موعظت بنانے کی ضرورت ہے اس کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ[۲]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نابینا سے منہ موڑنا اور چین بجبین ہونا زیب نہیں دیتا تھا یہ نابینا اپنے تقویٰ کی وجہ سے خدا کے یہاں اصحابِ نسب و ثروت و جاہ سے زیادہ باعزت تھا۔ جب کوئی شخص ایمان و تقویٰ سے عاری ہو تو اقدار حیات سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

یہ ہے اقدار کی حقیقت! جہاں تک زندگی کی حقیقت کا تعلق ہے اس کے چند مراحل و فصول ہیں۔ خداوند رحیم و کریم بکمال شفقت و عنایت ہر مرحلہ پر حیوان و انسان کے لیے ان کی ضروریات و حاجات کا اہتمام کرتا ہے۔ ان کے کھانے کا انتظام کرتا ہے ان کی صحت کی حفاظت کرتا ہے۔ بادلوں سے پانی برساتا ہے جو زمین میں سرایت کر جاتا

---

[۱] دیکھئے اس کتاب کی فصل "الوحی"

[۲] کشاف ج ۴ ص ۱۸۵

ہے۔ پھر زرخیز زمین میں داخل ہو کر اس میں اگانے اور پھلوں پھولوں کو بڑھانے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ انگوریاں بڑھ کر دانوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جن کو چبایا جاتا ہے۔ یا انگور بن جاتی ہیں جن کو نچوڑا جاتا ہے۔ یا تازہ پھلوں کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ یا زیتون بن جاتی ہیں جس سے تیل نکلتا ہے۔ یا بلند و بالا کھجور کا درخت بن جاتی ہیں۔ باغات ہیں گھنے درخت پھلتے پھولتے ہیں۔ ان کی ٹہنیاں باہم گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ باغات کے پھلوں کو لوگ مزے لے کر کھاتے ہیں۔ سبز چارے سے حیوانات اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔

انسان کو چاہیئے تھا کہ حقیقت حیات کو جانتا پہچانتا۔ اقدار حیات سے آشنائی پیدا کرتا۔ مگر وہ ظالم و جاہل اور ناسپاس واقع ہوا ہے۔ وہ اپنی اصل و اساس کو بھول گیا کہ اس کی خلقت کس ذرّہ بے مقدار سے ہوئی تھی۔ زندگی کی مشکلات کو آسان بنا کر خداوند کریم نے اس پر جو احسان کیا تھا انسان نے اس کو گل دستۂ طاقِ نسیان بنا دیا مرنے کے بعد اس کو زمین کے پیٹ میں جگہ دی۔ انسان نے اپنے فرائض و واجبات کو پوری طرح ادا نہیں کیا۔

وہ مسلسل و پیہم احسانات خداوندی سے یوں انکار کرتا رہا۔ گویا اس سے حساب کتاب نہیں لیا جائے گا۔ پس انسان کی حقیقت کتنی عجیب ہے! اور اس کا کفر کس قدر حیرت خیز اور تاسف انگیز ہے!

ہر چیز کو بھلا دینے والی ایک حقیقت کبریٰ قیامت کے دن انسان کی منتظر ہے جب قیامت بپا ہو گی تو ایک انتہائی زور دار آواز اس کے کانوں سے ٹکرائے گی اس شدید آواز کے سوا دوسری کوئی آواز انسان کو سنائی نہ دے گی۔ قیامت کا ہولناک منظر انسان کو اپنے قریبی عزیزوں سے بھی غافل کر دے گا۔ انسان صرف اپنے آپ میں محو ہو گا۔

۱۔ سعادت مند لوگوں کے چہرے تاباں و درخشاں ہوں گے۔

۲۔ بدبختوں کے چہرے اداس سیاہ اور محزون و مغموم ہوں گے۔

اہل ایمان شاداں و فرحاں ہوں گے۔ کفار اور بدکار لوگوں کا انجام بڑا عبرت ناک ہو گا۔[۱]

۲۔ سُورۃ التین:

اس سورت میں قرآن کریم اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ انسانی فطرت جب صحیح و سالم ہو تو کیسے ہوتی ہے؟ اور جب صراط مستقیم سے بھٹک جاتی ہے تو اس وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اس سورت کا مرکزی مضمون یہی ہے۔

بعض بابرکت پھلوں اور مقامات مقدسہ[۲] کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو اعزاز و اکرام سے نوازا۔ اس کو فطرتِ صحیحہ سے بہرہ ور کیا۔ اس کو سیدھا اور مبنی بر اعتدال جسم عنایت کیا۔ اس کے جسد و روح کو بلند مقام پر فائز کیا۔ پھر اس کے انحطاط و انحلال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اس تنزل کے باعث انتہائی پستی میں جا گرتا ہے۔ بجز اس صورت کے کہ فطرت سلیمہ اس کے لیے راہ ہدایت کو روشن کر دے اسے حقیقت ایمان سے آگاہ کر دے اور اس میں اعمال صالحہ کی رغبت پیدا کر دے

---

[۱] تفسیر طبری ج ۳۰ ص ۴۲ نیز کشاف زمخشری ج ۴ ص ۱۸۴

[۲] بابرکت پھلوں سے انجیر اور زیتون مراد ہیں۔ ممکن ہے کہ ان سے انجیر اور زیتون کے لگنے کی جگہ یعنی دو پہاڑ مراد ہوں۔ التین دمشق کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے زیتون نامی پہاڑ بیت المقدس میں ہے مقدس مقامات سے طور سینا اور مکہ مکرمہ مراد ہیں۔ التین اور الزیتون میں اختلاف مشہور ہے۔ امام المفسرین ابن جریر طبری فرماتے ہیں "صحیح بات یہ ہے کہ التین سے انجیر مراد ہے جو کھائی جاتی ہے اور زیتون وہ ہے جس سے زیت کا تیل نچوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ عربوں کے نزدیک یہی معروف ہے التین اور زیتون کے نام سے کوئی پہاڑ مشہور نہیں ہے۔ مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ خداوند کریم نے انجیر اور زیتون کی قسم کھائی۔ البتہ ان سے وہ جگہ مراد ہے جہاں یہ اگتے ہیں" (تفسیر طبری ج ۳۰ ص ۱۵۴)

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اوجِ کمال پر فائز ہو کر جنات النعیم کا وارث قرار پائے گا۔ انسان کے لیے یہ بات کیونکر موزوں ہے کہ حقیقت کو پا لینے کے بعد نورِ فطرت کو مٹا دے اور دین الٰہی کی تکذیب کرنے لگے۔ حکمت خداوندی کو بھول جائے اور ہوا وہوس اور سرکشی کی راہ پر گامزن ہو[۵]

۴۔ سورۃ القارعۃ:

سورہ القارعۃ کی بارعب اور مہیب آیات میں اللہ تعالیٰ روزِ قیامت کے ہولناک مشاہد ومناظر کی تصویر کھینچتے ہیں۔ اس کے بعد جزا وحساب کا منظر سامنے آتا ہے یہ سورت اسم بامسمّٰی ہے اور اپنی ہولناکی سے ہر چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قیامت کے روز لوگ غمرات وشدائد میں پروانوں کی طرح بے مقصد ادھر ادھر بھاگتے پھر رہیں گے جس طرح پروانہ ہر سو اڑتا پھرتا ہے اور اپنی منزل سے ناآشنا ہوتا ہے۔ پہاڑ غبارِ راہ کی طرح پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ جس طرح ہوا دھنی ہوئی اون کو ادھر ادھر اڑاتی ہے اسطرح وہ ہواؤں میں اڑنے لگیں گے۔ جن کے پاس اعمال صالحہ کا ذخیرہ ہوگا وہ عیش ومسرت کی زندگی بسر کریں گے۔ جو بدکار ہوں گے وہ ابدی ہلاکت اور جہنم کی تپتی ہوئی آگ کی نذر ہوں گے۔

جب گراں بار پہاڑ روزِ قیامت اُون اور غبار کی طرح اڑنے لگیں گے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ انسان کو گراں قدر اعمال کی کس قدر ضرورت ہے تاکہ وہ ہلکا پھلکا ہونے کی صورت میں پروانوں کی طرح اڑنے نہ لگے[۶]

---

[۵] تفسیر الدر المنثور للسیوطی ج ۶ ص ۳۶۵ نیز تفسیر کبیر للرازی ج ۸ ص ۴۲۱

[۶] تفسیر کشاف ج ۴ ص ۲۴۲۔ زمخشری فرماتے ہیں "روزِ قیامت میزان اعمال کے بوجھل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں حق کی پیروی کرتے اور وہ اعمال انجام دیتے تھے جو دنیا میں بھی بڑے گراں قدر تھے۔ آخر جس ترازو میں صرف نیکیاں ہی ہوں وہ بھاری کیوں نہ ہو؟ میزان اعمال کے خفیف ہونے کی (باقی برصفحہ آئندہ)

۴ - سُورۃ القیامۃ :

اس سورت میں بعث ونشر کی تاکید اور اس سے انکار کرنے والوں کی تردید کی گئی ہے۔ قرآن کریم اس سورت میں انقلابِ قیامت کی منظر کشی کرتا ہے۔ یہ انقلاب حد درجہ ہمہ گیر ہولناک اور سریع الاثر ہوگا۔ ہر چیز اس کی لپیٹ میں آجائے گی۔ اس سورت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ کہ آپ کو عاجلانہ طور پر وحی کے یاد کرنے کی فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ جس طرح انسان دنیائے فانی کی محبت میں عجلت سے کام لینے کا عادی ہے۔ کیونکہ وحی کو آپ کے سینہ میں محفوظ کرنا ہمارا کام ہے۔ اس میں مختصراً صلحاء و اشقیاء کے انجام کی خبر دی گئی ہے یہ سورت آخری وقت کی تصویر پیش کرتی ہے جو ہر زندہ کا مقدر ہے۔ اس سورت میں انسان کو اس کی ابتداء سے آگاہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے انجام کو اس پر قیاس کرے۔

انقلابِ قیامت کے نوطیہ و تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اور نفس لوامہ کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ حشر و نشر وقوع پذیر ہوگا اور قیامت بلاشک و شبہ ضرور آئے گی انسان بوسیدہ ہڈیوں کے جوڑنے پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے کام پر قادر ہے۔ خلاقِ عالم انسان کی انگلیوں کے پوروں کو درست کرتا ہے اور دوبارہ ان کی جگہوں پر نصب کرتا ہے۔ پھر گناہوں کے ارتکاب کا کیا جواز ہے؟ اور انسان بعث ونشور پر اظہارِ حیرت کیوں کرتا ہے؟

اس سورت میں بعث و نشر کی ایسے زوردار طریقہ سے تاکید کی گئی ہے کہ براہِ راست قلبِ غافل پر اثر انداز ہوتی اور اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔ قیامت کے دن پیدا ہونے والے انقلاب کی یہ بہترین تمہید ہے۔ روزِ قیامت ہر چیز میں جو انقلاب آئے گا وہ کس قدر سرعت پذیر ہوگا؟ بے قرار اور مضطرب انسان پوری کائنات کے نظام کو اپنی حیران

(بقیہ صفحہ سابقہ) وجہ اتباع باطل ہے۔ وہ دنیا میں ایسے کام کرتے تھے جو بے وزن تھے اور کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے جس طرح زمین میں صرف برائیاں ہی نوئی جائیں آخر وہ ہلکی کیوں نہ ہوں"۔

دیرانیٔ ان اور اچٹ جانے والی نگاہ کے ساتھ درہم برہم اور خلل پذیر صورت میں دیکھے گا۔ چاند بے نور ہو جائے گا۔ سورج کی تابانی و درخشانی عنقا ہو جائے گی۔ انسان کو کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی جو اسے خطرہ سے بچا سکے۔ اب بنی نوع آدم کو بارگاہ ربّانی میں اخروی محاسبہ کے لیے پیش کیا جائے گا۔

انسان بعث و نشور اور اخروی محاسبہ پر حیرت و استعجاب کا اظہار صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ خواہشات کی پیروی کرے۔ لذات حیات سے جس قدر ممکن ہو جلد از جلد بہرہ یاب ہو انسانی زندگی خواہ جس قدر بھی طویل ہو فنا سے ہمکنار ہو گی۔ اس لیے عجلت بے کار ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عجلت انسانی فطرت ہے؛ حتیٰ کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات عجلت پسندی کا ثبوت دیتے۔ جب وحی نازل ہوتی تو جلدی جلدی زبان ہلاتے مبادا وحی کا کوئی جزو بھول جائے۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ رسالت و نبوت کے پہلو کو فطری عجلت پسندی پر غالب کریں۔ اور اس بات پر بھروسہ کریں کہ وحی کے نازل کرنے والے نے اس بات کی ذمہ داری لی ہے کہ وہ اس کو آپ کے دل میں محفوظ و مصئون کر دے گا۔ اور پھر اس کی تشریح و توضیح کا اہتمام بھی کرے گا۔[۱]

اس انسان کی سعادت مندی کے کیا کہنے جو خدا کی محبت کو دنیائے فانی کی محبت پر ترجیح دیتا ہو۔ اس کا دل مطمئن اور رضائے الٰہی کا طلب گار ہو۔ اس کو ہر لحظہ روحانی نعمتوں کی طلب و تلاش ہو۔ بروز قیامت جب وہ جمالِ خداوندی سے بہرہ اندوز ہو گا تو

---

[۱] ہماری نگاہ میں آیت قرآنی لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ اور كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ باہم متوازن و مربوط ہیں بخلاف ازیں بعض لوگ ان دونوں کو ایک دوسری سے الگ تھلگ خیال کرتے ہیں دونوں آیتوں کے درمیان ربط و تعلق معلوم کرنے کے لیے قاری کو ذہانت و فطانت کے علاوہ عربی اسلوب و انداز کا ذوق آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ پادری لامنس جیسا عجمی ایسی نازک اور لطیف بات کو کیسے سمجھ سکتا تھا؟ (LAMMENS, FATIMA, 113)

سکون و طمانیت کی جھلک اس کے چہرہ پر نمایاں ہو گی۔ بخلاف ازیں جو شخص دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہو اور اتباع خواہشات کو اطاعت خداوندی سے افضل سمجھتا ہو۔ اس کا انجام کس قدر برا ہے۔ اور وہ کس قدر بدبخت انسان ہے۔ وہ نور بصیرت سے محروم ہو گا اس کے چہرہ پر غم و ہم کے آثار نمایاں ہوں گے۔ جو اس کی کمر کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور اس کو دردناک عذاب سے ڈرائیں گے۔

اگر منکرین حشر و نشر ایک دفعہ بھی حالت نزع پر زحمت غور و فکر گوارا کرتے جو روزانہ ان کے سامنے پیش آتی ہے۔ اور اس بات کو ذہن نشین کرتے کہ مرنے والا کس طرح اپنے احباب و اقارب کو چھوڑ کر ایک غیر معروف دنیا کی طرف چل دیتا ہے تو انہیں یقین آجاتا کہ خداوند جبار و قہار جو زندوں کو مارتا ہے۔ وہ مردوں کو زندہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ جب کسی کا آخری وقت آجاتا ہے تو دم درود اور تعویذ اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتے۔ نہ اس کے سکرات الموت میں کمی کر سکتے ہیں جو شخص نہ موت سے ڈرتا ہو۔ نہ احباب کی جدائی سے بے قرار ہوتا ہو۔ وہ بے شک دنیا میں فخر و غرور کی زندگی بسر کرے۔ اپنی پیٹھ کو عُجب و کبر سے اکڑاتا پھرے اور حق سے منہ موڑتا رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہلاکت اس کی منتظر ہے۔ اور خدا کا غضب اس کے صحن میں نازل ہو چکا ہے

منکرین بعث و نشر اگر اپنی اوّلین خلقت پر غور کرتے تو فطری طور پر نشاۃِ اُخریٰ کو اس پر قیاس کرنا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ کیا انسان ایک معمولی قطرہ آب نہ تھا؟ اور کیا یہ پانی جامد خون کی صورت میں تبدیل ہو کر رحم کے ساتھ وابستہ اور پیوستہ نہیں رہا؟ اور کیا اس کے ٹھکانے میں مختلف مراحل و ادوار سے گزر کر اس میں نر یا مادہ کی خصوصیات پیدا نہیں ہوئیں؟ کیا جس ذات نے اس کو عدم سے پیدا کیا تھا اس کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے کیا خالق حکیم اس کو بے کار چھوڑ سکتا ہے کہ اس سے کچھ باز پرس نہ ہو؟ کیا فطرت سلیمہ

---

۱ تفسیر کبیر للرازی ج ۸ ص ۲۵۹

بعث و نشر، اور جزاو سزا کی شہادت نہیں دیتی ؟[51]

۵۔ المرسلات :

اس سورت میں دنیا کے حسین ترین اور آخرت کے شدید ترین منظر کی تصویر بڑے یکتا اور منفرد انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں حقائق کونیہ اور نفس انسانی کے عمق کی بڑی سچی اور ربط منظر کشی کی گئی ہے۔ اس سورت کے فواصل بڑے شفا بخش اور اس کے نغمے بڑے خوش آیند ہیں۔ آیت وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ اس سورت میں دس دفعہ دہرائی گئی ہے۔ اس سورت کا آخری حصہ تند و تیز ہونے کے باوجود آغاز سورت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

سورت کے نقطۂ آغاز میں ملائکہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ آخرت کے بارے میں جو وعدہ کیا گیا ہے بلا شبہ وہ پورا ہو کر رہے گا۔

اس سورت میں "مرسلات" کی جو قسم کھائی گئی ہے اس میں غموض و خفاء پایا جاتا ہے یہ غموض عالم الغیب کے ساتھ یک رنگ و ہم آہنگ ہے۔ جو چیز بھی غائب ہو وہ مجہول اور غیر معروف ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں مرسلات سے فرشتے مراد ہیں۔ اس کی تفسیر میں جو طویل اختلاف پایا گیا ہے ہم اس مختصر کتاب میں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتے۔ اللہ تعالےٰ عالم الکل ہے اور اپنی قسم سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس نے ان فرشتوں کی قسم کھائی جن کو وہ پیہم و مسلسل بھیجتا رہتا ہے۔ وہ اس کے احکام کو لے کر ہوا کی طرح تیزی سے ہر جگہ پہنچ جاتے اور زمین میں ہر جگہ اس کے شرائع و احکام کو پھیلاتے ہیں۔ فرشتے انبیاء کی طرف جو پیغام لے کر آتے ہیں۔ اس میں لوگوں کو معذور قرار دینے اور ان کو عذاب الٰہی سے ڈرانے کا پیغام بھی شامل ہوتا ہے نیز اس سے حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز بھی قائم کیا جاتا ہے۔[52]

---

[51] تفسیر طبری ج ۲۹ ص ۸۰ نیز الکشاف ج ۴ ص ۱۶۳ تفسیر النسفی ج ۴ ص ۲۲۵

[52] سورۃ المرسلات کی تفسیر کے لیے دیکھیے تفسیر طبری ج ۲۹ ص ۱۴۰ و ۱ باقی حاشیہ بر صفحہ آیندہ:

سورۃ المرسلات میں ایک عجیب اور پیرانہ اسرار قسم کھانے کے بعد قیامت کے ایک جدید منظر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ منظر اتنا کرب ناک ہوگا کہ آنکھ اس کی تاب لانے سے قاصر ہوگی۔ دل بے چین ہو جائے گا۔ عالم ارضی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ یا پژمردہ اور پگھل جائے گی۔ ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ آسمان پھٹ جائے گا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ٹیلے کی طرح زمین کے برابر ہو جائیں گے۔ رسولوں سے بارگاہ ایزدی میں کھڑے ہو کر فیصلہ چکانے کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا کیا جائے گا۔ وہاں فیصلہ حق و انصاف کی رو سے کیا جائے گا۔ کسی پر ظلم و ستم نہیں ڈھایا جائے گا۔ جھٹلانے والے مجرموں کا کتنا برا حشر ہوگا۔

انبیاء کے اعداء سابقہ اقوام و ازمنہ میں ہمیشہ اپنے کیفر کردار کو پہنچتے رہے ہیں۔ کفار مکہ کوئی انوکھے مجرم نہیں ہیں۔ یہ دنیا ہی میں عذاب الٰہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر آخری عذاب کتنا سخت ہوگا؟

اے کاش! کہ بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونے سے قبل یہ اپنے آپ اور اس زمین میں غور کرتے جس کو یہ اپنے پاؤں کے ساتھ پامال کرتے ہیں۔ اگر اپنی ذات کے بارے میں غور کرتے تو خداوند عالم کی صنعت گری پر سر دھنتے۔ جس نے ان کو ماں کے پیٹ میں پیدا کیا۔ کئی مراحل طے کرنے کے بعد وہ پورے قد و قامت کو پہنچے۔ اور اگر وہ زمین کے بارے میں غور کرتے تو اس کو شفیق ماں سمجھنے لگتے۔ جو زندوں اور مردوں کو اپنے سینہ سے لگاتی ہے۔ انسانوں کو اسی سے پیدا کیا گیا۔ وہ اسی میں لوٹ کر جائیں گے۔ اور دوبارہ ان کو اسی سے پیدا کیا جائے گا۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) وتفسیر کبیر امام رازی ج ۸ ص ۲۶۸ وکشاف زمخشری ج ۴ ص ۱۷۳۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ زمخشری کی رائے سے قریب تر ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی قسم دینی کتب کے لیے ادب جلیل کا ایک حصہ ہے۔ مگر عیسائی علماء ہر ایسی دینی کتاب کو جعلی اور مصنوعی قرار دیتے ہیں جس کے فصول و ابواب کو ایسی ادبی قسموں کے ساتھ شروع کیا گیا ہو۔

کیا انہوں نے بلند و بالا پہاڑوں کو نہیں دیکھا؟ ان کی بلند چوٹیوں سے مینہ برستا ہے جس سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اور ان سے بنی نوع انسان کو ٹھنڈا اور شیریں پانی میسر آتا ہے۔

اگر وہ آفاق وانفس میں غور و فکر کرنے سے قاصر ہیں تو انہیں بکمال سُرعت عذاب الٰہی کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔ جہنم کا دھواں تین سایوں پر مشتمل ہے۔ یہ جُھلسا اور جلا دینے والے ہیں اور ان میں جہنم کی آگ سے بھی زیادہ تپش وسوز پایا جاتا ہے۔ کفار ان کی تپش اور حرارت و تمازت کا مزا چکھیں گے۔ جب جہنم کا دھواں اور اس کے سائے اپنے اندر اتنی تپش اور حرارت رکھتے ہیں تو اس کے شعلوں اور آگ کا کیا حال ہوگا! جہنم کا ہر شعلہ جسامت اور بلندی میں ایک عالیشان محل کی طرح ہوگا۔ جہنم سے چھوٹے چھوٹے شعلے بلند ہوں گے وہ قد آور زرد رنگ اونٹوں کی طرح ہوں گے جو صحرا میں بھاگ رہے ہوں لہ

روزِ قیامت سب آوازیں دب جائیں گی۔ زبانیں حلق میں خشک ہو جائیں گی۔ مجرم چپ چاپ اپنے عذرات کو سینوں میں چھپائے ہوں گے۔ اس ہولناک موقع پر کوئی شخص اپنا عذر بیان نہیں کر سکے گا۔ خدا نے سب پہلے اور پچھلے لوگوں کو جمع کر رکھا ہوگا۔ اور ان کے روبرو اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔ جو شخص کوئی پوشیدہ تدبیر کرنا چاہے کر کے دیکھ لے۔ جو قوت سے بہرہ ور ہو وہ مناسب تدبیر اختیار کرلے۔

قرآن کا یہ عام انداز ہے کہ ترہیب کے بعد وہ ترغیب کو جگہ دیتا ہے۔ اکثر سورتوں میں جنت و جہنم کا ذکر ساتھ ساتھ اس طرح کیا جاتا ہے جس طرح قصیدے کے دو بیت ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں۔ متقی لوگ جنۃ الفردوس کے گھنے سایوں میں استراحت

لہ یہ مضمون اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ۔ اس آیت کی تاویل میں جو اقوال وارد ہوئے ہیں ہم نے ان میں سے یہ تفسیر اختیار کی ہے۔ (کشاف ج ۴ ص ۱۷۷)

فراہم ہوں گے۔ جہنم کے جھلس دینے والے سایوں میں نہیں۔ ان کے آس پاس ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے رواں دواں ہونگے جلانے والی آگ کے شعلے ان کے آس پاس بکھرے ہوئے نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو شرفِ ہم کلامی اور دعوتِ اکل و شرب سے نوازے گا۔ اور ان پر غم افزا سکوت مسلط نہیں کرے گا۔

مجرم خود اپنے آپ کو کیوں نہیں ڈانٹتے؟ یہ بات ان کی سمجھ میں کس لیے نہیں آتی کہ دنیوی ساز و برگ فنا پذیر ہے؟ وہ حق کے پیرو ہو کر نماز باجماعت کیوں ادا نہیں کرتے؟ کیا بدبختی ان کا مقدر بن چکی ہے اس لیے وہ ایمان نہیں لائے؟[1]

۶۔ سورۃ البلد:

سورۃ البلد میں ایک عظیم قسم کے بعد فرمایا کہ انسانی زندگی جد و جہد اور کلفت و مشقت کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ یہاں دو چیزوں کی قسم کھائی ہے۔

(۱) بیت اللہ[2] جس کے عز و شرف کو اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کی بود و باش سے دوبالا کر دیا ہے۔

(۲) ہر والد و مولود اور اس محنت و مشقت کی قسم کھائی جس سے وہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں دوچار ہوتا ہے۔

مگر انسان اپنی قوت و شوکت پر نازاں ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ جس ذات نے یہ قوت اس کو ودیعت کی ہے وہ اس کو سلب بھی کر سکتی ہے۔ وہ اپنے مال سے بھی دھوکہ کھا جاتا ہے۔ وہ اس زعم کا شکار ہو کر اپنے مال کو جمع کرتا جاتا ہے کہ اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرے گا۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ علم خداوندی اس پر حاوی ہے۔

---

[1] تفسیر طبری ج ۲۹ ص ۱۴۰ نیز تفسیر نسفی ج ۴ ص ۲۴۱، بیضاوی ج ۲ ص ۴۷۷، کشاف ج ۴ ص ۱۷۳

[2] مستشرق میور نے "البلد" سے بیت اللہ مراد لیا ہے۔ یہ تفسیر درست ہے۔ دیکھیے طبری ج ۳۰ ص ۱۲۳ (MUIR, TRAD, 14)

خداوند عالم جانتا ہے کہ اس نے یہ مال کیسے جمع کیا؟ کس طرح خرچ کیا؟ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے گرفتار ہے۔ اپنے مال میں غلط تصرف کر کے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی خصوصیات بخشی تھیں جو اسے صراطِ مستقیم پر لگا سکتی تھیں۔ دیکھنے کے لیے دو آنکھیں دیں۔ بولنے کے لیے زبان عطا کی۔ خیر و شر میں امتیاز کرنے کے لیے اسے صلاحیت و استعداد سے نوازا۔

چونکہ انسان کو ہدایت کے کامل وسائل و ذرائع سے بہرہ ور کیا گیا۔ اس لیے اس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس گھاٹی کو عبور کر کے جنات عدن کا راستہ اختیار کرے۔ یہ گھاٹی ایمان و عمل کی طاقت ہی سے سر کی جا سکتی ہے۔ اس کے حصول کے لیے غلاموں[۵۱] کے آزاد کرنے اور بھوکے مساکین و یتامی اور نادار سب کو کھانا کھلانے کی ضرورت ہے۔ ان سب امور کو ایمان کا حق ادا کرنے حوادث و آلام میں صبر کے مقام بلند تک پہنچنے اور انسانی زندگی میں رحم و کرم کے احساسات اختیار کرنے کے لیے انجام دینا لازم ہے۔ ایسے اعمال ہی کی بناء پر انسان کو سعادت مندوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور اسے اصحاب الیمین میں شمار کیا جاتا ہے۔

کبر و غرور جس انسان کو ایمان سے روک دے اور وہ بغاوت و سرکشی پہ مصر رہے۔ تو اس کا انجام جہنم ہے۔ جہنم کے دروازے اس پہ بند کر دیئے جائیں گے۔ اور وہ اس میں نہ زندہ ہوگا نہ مردہ[۵۲]

۷۔ سورۃ الحجر:

دوسرے مرحلہ کی مکی سورتوں کے تحلیل و تجزیہ کو سورۃ الحجر کے ذکر و بیان پر ختم کرتے

۵۱۔ اس سے معلوم ہوا کہ آغازِ اسلام ہی میں مسلمانوں کو غلاموں کے آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ حالانکہ مکہ کے مسلمان بھی مظلوم اور کمزور تھے۔

۵۲۔ تفسیر طبری ج ۳۰ ص ۱۲۳ نیز تفسیر کبیر للرازی ج ۸ ص ۴۰۳

ہیں۔ یہ سابق الذکر دونوں قسم کی سورتوں کی نسبت طویل تر ہے۔ اس میں ننانوے (۹۹) آیات ہیں۔ اس کی آیات بھی مقابلتہً زیادہ لمبی ہیں۔ اس سورت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ حروف مقطعات میں سے "ا ل ر" کے ساتھ شروع ہوئی۔ حروف مقطعات کے ضمن میں ہم نے ایک مستقل فصل باندھی ہے اس لیے یہاں ان کی تفصیلات ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سورہ الحجر میں جو نمایاں حقائق بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ کفار کو انجام بد سے ڈرانا۔

۲۔ تکذیب کرنے والوں کے بارے میں سنت اللہ کا بیان۔

۳۔ آسمان و زمین میں خدا کے نشانات کی تفصیل۔

۴۔ واقعہ آدم و ابلیس۔

۵۔ فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا اور ابلیس کا انکار۔

۶۔ انبیاء کے واقعات بیان کر کے آپ کو تسلی دلانا۔

۷۔ پیرانہ سالی میں حضرت ابراہیم کو بیٹے کی بشارت۔

۸۔ حضرت لوط اور ان کے اہل کی عذاب سے نجات۔

۹۔ قوم لوط پر پتھروں کی بارش اور اس کی ہلاکت۔

۱۰۔ قوم شعیب کی بربادی۔

۱۱۔ حضرت صالحؑ کی قوم اصحاب الحجر کی زوردار آواز سے ہلاکت۔

۱۲۔ اس حق کی توضیح و تشریح جس کے باعث آسمان و زمین قائم ہیں۔

۱۳۔ آنحضورؐ کو عفو و درگزر اور علانیہ دعوت کی تلقین۔

۱۴۔ آخری دم تک خداوندی حمد و ثنا کی تاکید[1]

---

[1] تفسیر طبری ج ۱۴ ص ۱ نیز تفسیر کبیر للرازی ج ۵ ص ۲۵۲۔

آغاز سورت میں کفار کو ضمنی و اجمالی طور پر عذاب الٰہی سے ڈرا کر اسلام کو قبول کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ اس کام میں امکانی عجلت چاہیئے۔ جانے کب زندگی ختم ہو جائے اور اس کار خیر کی مہلت نہ ملے۔ جھوٹی امنگیں کس قدر بھی غلط طمع دلاتی رہیں وہ مقدر انجام کو دور نہیں کر سکتیں۔ عنقریب یہ حقیقت ان پر وا انشگاف ہو جائے گی کہ اقوام سالقہ کے بارے میں خدا کی سنت کبھی تبدیل نہ ہو گی۔ ہر قوم کا ایک وقت معین ہے۔ ان کی زندگی کے ایام گنے چنے ہیں۔ جب وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جائے گی تو خدا کا عذاب کسی وقت بھی آ جائے گا۔ خواہ دن کو یا رات کو ــــــ اور ان کو ملیا میٹ کر کے رکھ دے گا۔

مگر مشرکین شدید انذار و تخویف کے باوصف کفر سے باز نہ آئے۔ بلکہ بدستور اپنے بے کار مشاغل میں مشغول و منہمک رہے۔ آپؐ کا مذاق اڑاتے۔ آپ کو مجنون قرار دیتے اور یہ مطالبہ کرتے کہ فرشتے آسمان سے اتر کر آپ کی تصدیق کریں اگرچہ ملائکہ کا نزول بذاتِ خود محال نہیں۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کفار اپنے لیے خود عذاب کے طالب ہیں؟ اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ ہلاکت کا وعدہ پورا ہو کر رہے؟[۲]

---

[۱] ان آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۝ ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

ان دونوں آیتوں میں کفار کو اجمالی طور پر ڈرایا اور ان کا مذاق اڑایا گیا ہے اگرچہ یہ آیتیں اس مفہوم میں داخل نہیں ہیں۔ زمخشری فرماتے ہیں "ان آیات میں کفار پر حجت قائم کی گئی اور پرزور انداز میں ان کو ڈرایا گیا"۔ (الکشاف ج ۲ ص ۳۱۰)

[۲] جب مشرکین نے فرشتوں کے اترنے کا مطالبہ کیا تو قرآن نے ان کی تردید میں فرمایا،

(باقی بر صفحہ آئندہ)

آنحضورؐ کا ارشاد گرامی بجا ہے کہ اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ تعصب و عناد کے اسالیب واطوار کفار کے یہاں یکساں تھے۔ مشرکین مکہ کا طرز و انداز ہر زمانہ کے مکذبین کا آئینہ تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ آسمان کو پھاڑ کر ان کے لیے ایک دروازہ بنا دیتے اور ان کے لیے ایک سیڑھی تیار کر دیتے جس میں سے وہ آسمان پہ چڑھ جاتے۔ تاہم وہ بے حیائی کے انداز میں جھگڑنے لگتے۔ اور آنکھوں دیکھے حقائق کو بکمال ضد و عناد جھٹلا دیتے۔ وہ یوں سمجھتے کہ ان کی آنکھوں پہ جادو کیا گیا ہے۔ یا ان پر نشہ کی کیفیت طاری ہے کہ ان کو وہمی اور خیالی چیزیں نظر آ رہی ہیں [1]

مرحلہ ثانیہ کی سورتوں پر مجموعی تبصرہ:

یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ قرآن کفار کو اسی ضد و عناد ہی پر نہیں چھوڑتا۔ بلکہ ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا۔ ان میں نیکی کے خوابیدہ جذبات کو ابھارتا۔ اور ان کو ہدایت کرتا ہے کہ کائنات کے حسین و جمیل مظاہر و مناظر کو آنکھیں کھول کر دیکھیں اور ان سے خلاق عالم کی ہستی پر استدلال کریں۔ آسمان کے تاباں و درخشاں ستاروں کو دیکھئے۔ کس طرح ادھر ادھر حرکت کرتے ہیں اور بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بلند و بالا پہاڑوں کے بوجھ نے زمین کو دبا رکھا ہے۔ یہ بڑے پرشکوہ اور ہیبت ناک ہیں۔ سبز گھاس نے زمین پر ہرا بھرا فرش بچھا رکھا ہے۔ فصلیں ہوا میں لہرا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو انواع و اقسام کے مزے، رنگ اور خوشبو سے نوازا ہے۔ تاکہ وہ بندوں کے لیے رزق اور معاش کا کام

(حاشیہ صفحہ سابقہ) اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے جھٹلانے والوں کو عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے آتے ہیں جب اترتے ہیں تو مہلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (الطبری ج ۲ ص ۶)

[1] زمخشری لکھتے ہیں "مشرکین مکہ کے غلو فی العناد کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے لیے آسمان کا دروازہ کھول دیا جائے۔ اور ان کے لیے ایک سیڑھی مہیا کی جائے جس کے ذریعہ وہ آسمان پر چڑھ جائیں اور سب حقائق بچشم خود دیکھ لیں تو وہ یوں کہیں گے کہ یہ سب وہمی اور خیالی چیزیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں یا یوں کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر جادو کر دیا ہے" (کشاف ج ۲ ص ۳۱۲)

دیں۔ خدا کے پاس رزق کے خزانے ہیں۔ ایک خاص انداز سے کے مطابق وہاں سے رزق نازل ہوتا ہے۔ ہوائیں پانی کو اٹھائے پھرتی ہیں۔ اور پھر موسلا دھار بارش کی صورت میں اس کو زمین پر انڈیل دیتی ہیں ؎۱ یہ پانی پیاسوں کی تشنگی دور کرتا اور مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے۔ پوری کائنات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ زمین و آسمان کا وارث ہے۔ وہ زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے اور وہی ہر چیز کا مرجع و مرکز ہے۔

خوابِ غفلت کے ماتوں کو جگانے کے لیے قرآن نے بڑا انوکھا اور نرالا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس کے بیان کردہ واقعات بند دلوں کو کھولتے، اندھی آنکھوں کو روشن کرتے اور بہرے کانوں کو سماعت بخشتے ہیں۔ قرآن اسرار وجود پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحجر میں قصۂ آدم و ابلیس سے اخذ کر کے ہدایت و ضلالت کے حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ جن و انسان دو الگ الگ مخلوق ہیں جس طرح اصل و اساس کے اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح کچھ عجیب نہیں کہ ان کا انجام بھی مختلف ہو۔ حضرت آدم خشک مٹی کی ڈلیوں سے پیدا کیے گئے۔ جن کو باہم ٹکرایا جائے تو وہ بجتی ہیں۔ ان میں روح خداوندی کارفرما تھی۔ جس کی بنا پر آپ فرشتوں کی اعلیٰ جماعت کی طرف متوجہ رہتے۔ نظر بریں وہ اس لائق تھے کہ فرشتے ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے۔ ابلیس کو زہریلی آگ ؎۲ سے پیدا کیا

؎۱ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آیت کریمہ وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ کی تفسیر فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہواؤں کو بھیجتے ہیں وہ بادل سے پانی اٹھاتی اور بادلوں کی طرح ادھر ادھر جاتی ہیں اور پھر یوں برس پڑتی ہیں جس طرح دودھ دینے والی اونٹنی دودھ دیتی ہے۔" ابن عباس، ابراہیم نخعی اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۴۹)

؎۲ آیت کریمہ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "نار السموم" سے زہریلی آگ مراد ہے۔" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں" دنیا میں جو زہر پایا جاتا ہے اس زہر کا بجے ہے جس سے جنوں کو پیدا کیا تھا"۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۵۰)

گیا تھا۔ اس لیے وہ چاروں جانب شرت گھرا ہوا تھا تکبر و غرور اس کو اظہار فخر پر اکسا رہا تھا۔ نتیجہ کے طور پر اس نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ عہد کیا کہ حضرت آدم کی اولاد کو ——— خدا کے مخلص بندوں کے سوا ——— گمراہ کرتا رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ نوعِ انسانی دو قسموں میں بٹ گئی۔

۱۔ اتباعِ ابلیس جو انتہائی رسوائی کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ جہنم کے سات دروازوں میں سے ہر دروازہ کے لیے ان میں سے ایک جماعت مخصوص ہو گی[۱]

۲۔ خدا کے نیک بندے جو جنت اور چشموں میں جائیں گے۔ نہ ان پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔

انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں ہدایت وضلالت کے حقائق ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ جو حضرت لوطؑ کی جانب فرستادہ فرشتوں کے ساتھ پیش آیا مشرکین کے سننے کے لائق ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت ابراہیم پہلے خوف زدہ ہوئے۔ جب پیرانہ سالی کے باوجود فرشتوں نے ان کو بیٹے کی بشارت دی تو مطمئن ہو گئے حضرت لوط اپنی بدکار قوم کے رویہ سے سخت گھبرائے۔ چنانچہ راتوں رات اہل خانہ کو لے کر وہاں سے نکل گئے۔ ظہورِ صبح سے پہلے منکرین پر پتھروں کی بارش ہوئی۔

اسی طرح حضرت شعیب کی قوم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تکذیب کی بناء پر کس طرح اپنے کیفر کردار کو پہنچی۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت صالح کو جھٹلانے والے اصحاب الحجر کا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے پہاڑ کے دامن میں پتھروں کو کرید کر بڑے مضبوط قلعے بنا رکھے تھے۔ جس وقت وہ امن وسکون سے ان مکانات میں اقامت گزیں تھے کہ ایک زوردار آواز آئی اور

---

[۱] تفسیر طبری ج ۱۴ ص ۳۴

[۲] اصحاب الحجر کا نام ثمود ہے۔ الحجر کو آج کل "مدائن صالح" کہتے ہیں۔ یہ مقام حجاز وشام کے درمیان وادی القریٰ کے پاس واقع ہے۔

اچانک ان کا خاتمہ کر گئی۔

انبیاء کے ان واقعات میں مشرکین کے لیے کوئی عبرت کا سامان ہو یا نہ ہو اس میں شبہ نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ واقعات ضرور سبق آموز ہیں۔ آپ کی قوم آپ پر جو مظالم ڈھا رہی ہے اس سلسلہ میں انبیاء کے یہ واقعات آپ کے لیے وجہ اطمینان ہیں۔ ان واقعات میں اس حق کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے جس پر آسمان و زمین قائم ہیں۔ آپ کے لیے موزوں ترین طریق یہ ہے کہ جاہل دشمنوں سے درگزر کریں اور غافلوں کو ڈراتے اور اسلامی دعوت کے پہنچانے کا کام جاری رکھیں۔ دنیائے فانی کے ساز و برگ سے صرف نظر کر کے السبع المثانی[1] اور قرآن عظیم پر قناعت کریں۔ اس وحی کو علانیہ لوگوں تک پہنچا دیں جس کی مثل پہلے انبیاء پر نازل ہو چکی ہے کیوں کہ آخر کار متقی لوگ ہی کامیاب ہوں گے۔

درمیانی مرحلہ کی مکّی سورتوں کا جو مختصر تجزیہ ہم نے شروع کیا تھا اس کو سورۃ الحجر پر ختم کرتے ہوئے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آخری مرحلہ کی مکّی سورتوں میں جو طوالت پائی جاتی ہے سورۃ الحجر کی جسامت و ضخامت ان کی تمہید اور پیش خیمہ ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ اس خصوصیت میں دونوں مرحلوں کی سورتوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تینوں قسموں کی سورتوں میں صرف اعتباری فرق پایا جاتا ہے جس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ ہر مرحلہ کی سورتیں گویا سابقہ مرحلہ کا تتمہ اور ضمیمہ ہیں۔ یہ بات اس وقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے جب ایک مرحلہ ختم ہوتا اور دوسرے کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ بات بھی ہماری نگاہ سے پوشیدہ نہیں کہ حروفِ مقطعات کے ساتھ سورۃ الحجر کا آغاز

---

[1] السبع المثانی کی تفسیر میں دیکھئے تفسیر طبری ج ۱۴ ص ۳۵ - ۴۱ و ابن کثیر ج ۲ ص ۵۵۷ - طبری کے نزدیک اصح یہ ہے کہ اس سے سورۃ الفاتحہ مراد ہے۔ کیونکہ اس سورت کی سات آیتیں ہیں اور وہ نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں۔ مستشرق نلسکے کہتے ہیں کہ عربی لفظ "مثناۃ" اور عبرانی "مشنا" دونوں میں اعادہ اور تکرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

تیسرے اور آخری مرحلہ کی سورتوں کے لیے پیش خیمہ کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر سورتیں ان حروف کے ساتھ شروع ہوتی ہیں۔ اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جو ہم قبل ازیں کہہ چکے ہیں کہ مختلف مراحل میں نازل شدہ مکی سورتیں موضوعی اور اسلوبی خصوصیات میں باہم شریک ہیں۔ اور اگر ہم مکی و مدنی سورتوں کی ترتیب میں زمانہ کو ملحوظ رکھیں اور دونوں قسموں کو مختلف مراحل میں تقسیم کریں تو ہم مکی سورتوں کو ایک قسم اور مدنی سورتوں کو اس کے مقابلہ میں دوسری قسم قرار دیں گے۔

اگر ہم تیسرے اور آخری مرحلہ کی مکی سورتوں کے خصائص و ممیزات کا آغاز کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا چاہیں کہ مکی سورتوں کے مرحلہ اُولیٰ و ثانیہ کے مابین کیا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ تو ہم بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے مرحلہ کی سورتوں میں جو اضافے کیے گئے ہیں ان کی بناء پر ان میں بیان کردہ حقائق گویا ایک مستقل حیثیت کے حامل بن گئے ہیں۔ علاوہ ازیں مرحلہ ثانیہ کی سورتوں کو جس رنگ آمیزی کے ساتھ مزین و منقش کیا گیا ہے۔ اس سے ان کے اسلوب بیان نے ایک منفرد اور یکتا حیثیت حاصل کر لی ہے۔ حالانکہ دونوں سورتوں میں بیان کردہ اصول و ضوابط نمایاں اور یکساں ہیں۔

مرحلۂ اولیٰ کی سورتوں میں کائنات زندگی اور انسان سے متعلق جو حقائق بیان کیے گئے تھے دوسرے مرحلہ میں بھی وہی بیان ہوئے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ دوسرے مرحلہ میں ان کے دائرہ میں وسعت پیدا ہو گئی۔ جزئیات کو تفصیلاً بیان کیا گیا۔ اور ان کی خصوصیات کو خوب واضح کیا گیا۔ دعوت اسلامی کے آغاز کے ساتھ ہی کفار کو خوف زدہ کیا گیا۔ اور ان کے دل پر رعب طاری کیا گیا۔ کفار کو انجام بد سے ڈرایا گیا۔ قرآن نے بتایا کہ اقوام سابقہ کو کس طرح تہس نہس کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدت۔ وحی کی صداقت۔ قیام قیامت بعث و نشر اور ثواب و عقاب پر دلائل پیش کیے گئے۔ جنت و جہنم کے متضاد و متقابل مناظر

مشاہد پیش کیے گئے۔ خدا کی وہ نعمتیں یاد دلائی گئیں جو ارض و سماء اور آفاق و انفس سے متعلق ہیں۔ انسانوں کو نورِ فطرت سے ہدایت یاب ہونے کی دعوت دی۔ اعمال صالحہ کی رغبت دلائی مومنین اور مشرکین کے درمیان تقابل کیا گیا۔ اشخاص و اخلاق اور افرادِ حیات کی جانچ پرکھ کے سانچے اور پیمانے بتلائے اس حقیقت کو واضح کیا کہ اصول ایمان کے اعتبار سے دین میں وحدت پائی جاتی ہے۔ تخلیق آدم و ابلیس پر روشنی ڈالی اور ہدایت و ضلالت کے اسرار و رموز بتائے۔

جہاں تک مرحلہ ثانیہ کی سورتوں کے تعبیر و بیان کا تعلق ہے۔ یہ اکثر جگہوں میں ایجاز و اختصار جوشِ بیان مقاطع و فواصل کے تماثل کثرت تجسیم و تشخیص و تخییل اور کثرتِ اصابع و الوان کے لحاظ مرحلۂ اولیٰ کی سورتوں کا نقش ثانی ہے۔

البتہ فرق یہ ہے کہ بعض آیتیں اور سورتیں مقابلتہً مرحلہ اولیٰ کی آیات و سُوَر سے طویل تر ہیں[۵۱]۔ بعض سورتوں میں صوتی یک رنگی و ہم آہنگی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ بعض جگہ مقاطع میں بھی صوتی حُسن کے لوازم دیکھنے میں آتے ہیں۔ بعض آیات کے اواخر میں اسماء اللہ الحسنیٰ میں سے باہم دو دو اسم وارد ہوئے ہیں[۵۲]۔ الفاظ بڑے چیدہ و برگزیدہ ہیں۔ البتہ بعض جگہ ان میں نرمی اور بعض جگہ سختی پائی جاتی ہے۔ نرم ہوں یا سخت دونوں حالات میں یہ الفاظ اپنے بلند پایہ طرزِ بیان اور ساحرانہ طرزِ تخاطب سے سامعین کے خوابیدہ جذبات و احساسات کو اس حد تک بیدار کرتے ہیں کہ آدمی جھوم جاتا ہے۔

اب ہم مکی سورتوں کے تیسرے اور آخری مرحلہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے

---

۵۱ جیسا کہ ہم سورۃ الحجر میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ اس مرحلہ کی سورتوں میں ایک شانِ حیثیت کی حامل ہے۔

۵۲ مشہور مستشرق دیمومبین نے اسماء اللہ الحسنیٰ پر بہترین مقالہ تحریر کیا ہے۔ دیکھیے۔
GAUDEFROY DEMOMBYNES NOMS D, ALLAH, 20

پہلی چیز جو ہمیں مشکل ہے وہ ان آیتوں اور سورتوں کی طوالت ہے۔ البتہ آیتوں کی نسبت ان کی سورتیں طویل تر ہیں۔ اگر ان سورتوں کی طوالت کا مقابلہ مدنی سورتوں کی آیات کی تعداد یا ایک ہی ملنی آیت کے حروف کے ساتھ کیا جائے تو اس طوالت کی اہمیت باقی نہیں رہتی تاہم تیسرے مرحلہ کی سورتوں کو بلاشبہ طویل ہی قرار دیا جائے گا۔ اس لیے کہ قاری مکی سورتوں کے تمام مراحل میں اختصار کی توقع رکھتا ہے۔ مزید برآں مکہ کے فصحاء و بلغاء پوشیدہ اشارات یا حکیمانہ عبارت پر بھروسہ کرتے ہوئے ایجاز و اختصار کے خواہاں تھے۔

ان سورتوں کی طوالت کے پیش نظر ہم ان تمام پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے ہم ان تمام سورتوں پر مختصر تبصرہ کرنے کے بجائے صرف تین سورتوں کی نمایاں خصوصیات بیان کریں گے۔ باقی سورتوں کو ان پر قیاس کر لینا چاہیئے۔[۵]

وہ تین سورتیں یہ ہیں۔

(۱) الصافات (۲) الکہف (۳) ابراہیم

سورۃ الصافات:

اس سورت میں ایک سو بیاسی ۱۸۲ آیات ہیں۔ اس سورت کی ابتدائی گیارہ آیات کا خاتمہ (فواصل) مختلف الفاظ پر ہوتا ہے۔ باقی سورت کی ہر آیت کے اختتام پر ایسا لفظ آتا ہے جو "واؤ نون" یا مد یاء نون" اور بعض اوقات "یاء اور میم" پر ختم ہوتا ہے۔ سورہ زیر نظر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل مضامین بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ شرک سے اظہار براءت۔

۲۔ مسئلہ توحید کا اثبات۔

---

[۵] ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ آخری مرحلہ کی مکی سورتوں میں حسب ذیل سورتیں شامل ہیں۔
الصافات۔ الزخرف۔ الدخان۔ الذریات۔ الکہف۔ ابراہیم۔ السجدہ
ہم نے تین سورتوں پر اس لیے اکتفاء کیا کہ یہ سورتیں باتفاق مورخین و مفسرین مکی زندگی کے آخری حصہ میں اتریں۔

٣۔ بعث و نشر اور قیامت کے بعض مناظر و مشاہد کا تذکرہ۔

٤۔ ملائکہ نیز شیاطین کا ذکر و بیان جو ملأ اعلیٰ کی گفتگو سننے کی کوشش کرتے ہیں اور شہاب ثاقب سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔

٥۔ مشرکین کی تکذیب رسولؐ۔

٦۔ انبیاء سابقین مثلاً حضرت نوحؑ و ابراہیم و موسیٰ و ہارون و الیاس و لوط و یونس علیہم السلام کے واقعات۔

٧۔ حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے ذبیح کا واقعہ۔

٨۔ عربوں کے فرشتوں کے بارے میں غلط توہمات

٩۔ انبیاء کی نصرت کا وعدہ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خداوند کریم نے ان فرشتوں کی قسم کھائی جو آسمان میں قطار باندھے[1] حکم الٰہی کے منتظر رہتے ہیں۔ اس کی مشیت کو نافذ کرتے۔ انبیا کی تکذیب کرنے والوں پر عذاب نازل کرتے۔ اور اس کے برگزیدہ بندوں کو قرآن کریم[2] کی تلاوت کر کے سناتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کوئی شخص ذات و صفات میں اس کا شریک نہیں۔

خداوند تعالیٰ کی وحدانیت کا اثبات مشرکین کے اس احمقانہ افسانہ کی تردید ہے جو انہوں نے ذاتِ خداوندی کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان قرابت دارانہ تعلقات پائے جاتے ہیں۔ عربوں کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورت سے نکاح کیا۔ اس کے بطن سے فرشتے پیدا ہوئے۔ اس

---

[1] مفسر طبری نے آیت "وَالصَّافَّاتِ صَفًّا" کی یہی تفسیر بیان کی ہے (طبری ج ٢٣ ص ٢٢)

[2] ذکر سے عام کتب مقدسہ مراد ہیں جو انبیاء سابقین پر نازل کی گئی تھیں۔ اگرچہ بالا ولیٰ ذکر کا اطلاق قرآن کریم پر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ قرآن کے ساتھ مختص ہے۔ قرآن کو ذکر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے اسماء میں سے ایک نام "الذکر" یا "الذکر الحکیم" بھی ہے۔ تفسیر ابن کثیر ج ٤ ص ٢۔)

لیے فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ سورۃ الصافات میں چار جگہ اس جاہلانہ بہتان تراشی کی تردید کی گئی ہے۔

۱۔ آغازِ سورت میں قسم کھا کر فرمایا کہ فرشتے صفیں باندھے بارگاہ ایزدی میں حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ انبیاء کی طرف خدا کا پیغام لے کر جاتے ہیں۔ اس لیے وہ خدا کی ایک مخلوق ہیں جو آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔

۲۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ[۱]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں جس قدر مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ اور جو پاکیزہ فرشتے اور ارواحِ علویہ آسمان و زمین کے درمیان اڑتے پھرتے ہیں۔ اس کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں جو اس کی الوہیت و وحدانیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری جگہ ان شیاطین کا ذکر کیا گیا ہے جو فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان پر شہاب ثاقب کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔ حالانکہ عربوں کے بقول یہ شیاطین جن تھے۔ جو ان کے نزدیک خدا کے قرابت دار تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قرابت داری کے علی الرغم ان کو سزا دینے کی کیا ضرورت تھی۔

۴۔ چوتھی جگہ فرشتوں کا ذکر سورت کے آخر پر کیا گیا ہے۔ اس مقام پر عربوں کے اس جاہلانہ بہتان و اتہام پر شدید حملہ کیا گیا ہے۔ قرآن ان احمقوں سے پوچھتا ہے کہ اس خود ساختہ افسانہ کی حقیقت کیا ہے؟ وہ فرشتوں کو کیوں کر خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں؟ ایک ناپسندیدہ چیز کو خدا کی طرف کس لیے منسوب کیا جاتا ہے؟

---

[۱] مفسر طبری اپنی تفسیر کی ج ۲۳ ص ۳۲ پر لکھتے ہیں وَرَبُّ الْمَشَارِقِ یعنی موسم گرما و سرما میں سورج کے مشرق و مغرب کا انتظام کنندہ اور اس کا نگران اور مصلح۔ المشارق کا ذکر کر کے المغارب کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ خدا کی وحدانیت کا اثبات اس احمقانہ افسانہ کی شدید تردید پر مشتمل ہے۔ جو عربوں نے ملائکہ و شیاطین کے بارے میں اختراع کر رکھا تھا۔

اس سورت میں پہلے یہ بتایا کہ آسمان کو ستاروں سے آراستہ پیراستہ کیا گیا ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ شیاطین پر شہاب ثاقب پھینکے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خداوند تعالیٰ نے ستاروں میں دو خاصیتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ ان میں سے ہر خاصیت کی تکمیل دوسری خاصیت سے ہوتی ہے۔

۱۔ پہلی خاصیت یہ ہے کہ ستارے آسمان کو زینت بخشتے ہیں تاکہ جب بھی انسانی نگاہ آسمان کی جانب اٹھے تو وہ اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو۔

۲۔ دوسری خاصیت یہ ہے کہ ستارے آسمان کی حفاظت کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ تاکہ شیاطین ملأ اعلیٰ کی گفتگو نہ سن سکیں گویا ستارے آسمان کے پہرہ دار اور محافظ ہیں جو سرکشوں اور باغیوں پر آگ کے انگارے پھینک کر ان کو بھگا دیتے اور اس طرح آسمان کی حفاظت و نگہداشت کرتے ہیں۔

ستاروں کا بطریق اتم و اکمل اپنے دونوں فرائض کو انجام دینا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ یہ کائنات بڑے منظم طریقہ سے چل رہی ہے۔ اس کی ہر چیز ایک خاص اندازے کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اور خالق کائنات کی قدرت سے محو حرکت ہے۔

مشرکین مکہ بجائے اس کے کہ خالق کائنات کی صنعت گری پر غور و فکر کرتے بغاوت و سرکشی پر مصر تھے۔ گویا وہ اس زعمِ باطل کا شکار تھے کہ وہ ان فرشتوں سے زیادہ طاقتور ہیں جو بارگاہ ربانی میں قطار اندر قطار کھڑے ہوتے ہیں۔ یا سرکش شیاطین کی نسبت زیادہ قوت و شوکت رکھتے ہیں[1]۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل

[1] مفسر ابن کثیر آیت قرآنی "فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں "ان منکرین سے دریافت کیجئے کہ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ہو جانے کے بعد ایک انسان بار دیگر کیسے زندہ ہو سکتا ہے؟ شکوک و شبہات کی بنا پر قرآن کو جادوگری سے تعبیر کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کو یہ بات یاد دلانے کا حکم دیا کہ تمہیں نرم اور چکنی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ روز قیامت جب صور پھونکا جائے گا تم تمہارے اہل خانہ اور تمہارے معبود سب ارض محشر میں جمع ہو جاؤ گے۔ پھر تم کو بصد ذلت و خواری جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ دوزخی لوگ ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور عذاب الیم کے مستحق ہونے کا اعتراف کریں گے۔

صلحاء و اشقیاء کے انجام کے بارے میں قرآن کی سنت غیر متبدل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کے لیے جو انعامات تیار کر رکھے ہیں اس سورت میں ان کی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ عذاب الٰہی سے محفوظ و مصئون رہیں گے۔ جنت میں جو چاہیں گے کھائیں پئیں گے۔ پلنگ پر تکیہ لگائے راحت و سکون کی زندگی بسر کریں گے۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے اور ان کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہوں گی۔ وہ ان سے جی بھر کر پھل کھائیں گے۔ پھر جنتی شراب سے ان کی تواضع کی جائے گی۔ جس سے نہ سر درد ہوگی اور نہ اس کی لذت کبھی ختم ہوگی[1] ان نعمتوں

(حاشیہ صفحہ سابقہ) زیادہ طاقتور کون ہے۔؟ آسمان و زمین اور ان کے درمیان جو ملائکہ شیاطین اور عجیب قسم کی مخلوقات بستی ہیں۔ آیا وہ زیادہ طاقتور ہیں یا مشرکین و منکرین۔؟ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲)

[1] مفسر طبری آیت "لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں اس شراب میں "غول" نہیں۔ غول اس چیز کو کہتے ہیں جس سے عقل بحال نہ رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت کی شراب سے عقل بحال رہے گی۔ ایسا نہیں ہوگا۔ کہ جیسے دنیوی شراب پینے سے عقل زائل ہو جاتی ہے جنتیوں کی عقل بھی جاتی رہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔ ؎

وَمَا زَالَتِ الْكَأْسُ تَغْتَالُنَا - وَتَذْهَبُ بِالْأَوَّلِ الْأَوَّلِ

عرب بولتے ہیں لَيْسَ فِيهَا غِيلَةٌ وَغَائِلَةٌ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ (طبری جلد ۲۳ ص ۳۵) پھر طبری لکھتے ہیں يُنْزَفُونَ بکسر الزاء و فتح الزاء دونوں صحیح اور معروف ہیں۔ ان کے معنی میں بھی کوئی فرق نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جنتی شراب اہل جنت کو مخمور اور بدمست نہیں کرے گی

کے علاوہ ان کو شرمیلی پردہ دار اور حسین و جمیل بیویوں کی خوش آیند اور پرکیف و سرور صحبت و رفاقت بھی میسر آئے گی۔

وہ ان پرکیف مناظر سے لذت اندوز ہوں گے کہ ان کو اپنا ایک قدیم دوست یاد آئے گا جو دنیا میں بعث و نشر کو جھٹلایا کرتا تھا۔ وہ نیک نصیب جنتی اس دوست کا انجام دیکھنے کے لیے اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ وہ ان کو وسط جہنم میں ملے گا۔ وہ اس بدبخت کو زجر و توبیخ کریں گے اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کریں گے کہ ان کو اور ان کے رفقاء کو اہل جنت میں سے بنایا۔

اس مقام پر پہنچ کر قرآن اشقیاء اور صلحاء کے انجام کے درمیان ایک بھرپور موازنہ کرتا ہے۔ ایک جانب خدا کی اطاعت کرنے والے سعادت مند لوگ انواع و اقسام کی نعمتوں کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ دوسری طرف بدنصیب جہنمی "شجرۃ الزقوم" (تھوہر کا درخت) کھانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ یہ جہنم کا ایک درخت ہے جو انتہائی طور پر قبیح المنظر اور نگاہ تصور کے سامنے آنے والے شیاطین کے سروں کی طرح ہوگا[1] جب ان کے حلق پیاس اور سوزش کی شدت سے جل جائیں گے۔ تو ان کو حد درجہ گرم پانی پینے کے لیے دیا جائے گا جو شراب کی تلچھٹ کی طرح بدرنگ اور بدبودار ہوگا۔ وہ ان کی انتڑیوں کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ جب وہ اس شدید عذاب سے کوئی پناہ گاہ طلب کریں گے تو ان کو واپس جہنم کی گہرائی میں لے جایا جائے گا جو بدترین ٹھکانا ہے۔

قرآن نے مشرکین عرب کو ان کی ضلالت کے اسباب یاد دلائے۔ اور ان پر یہ حقیقت واضح کی کہ وہ مقلد ہیں اور اندھا دھند اپنے آباؤ اجداد کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہ عقل و دانش سے اس حد تک بیگانہ ہیں کہ اپنے تاریک انجام اور اہل ایمان کے تاباں و درخشاں

[1] مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں "شیطانوں کے سر کے ساتھ تشبیہ اگرچہ عربوں کے یہاں معروف نہیں تاہم شیطان کی قباحت ان کے نزدیک مسلم تھی"۔ ابن کثیر جلد ۴ ص ۱۰

مستقبل میں فرق نہیں کر سکتے۔ ازمنہ سابقہ میں پیہم انبیاء و رسل مبعوث کیے جاتے رہے اس کے باوجود ان کے اسلاف قعرِ ضلالت میں پڑے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے فوری عذاب سے صرف وہی خوش نصیب بچ سکے جو چیدہ و برگزیدہ تھے۔

اسی تذکیر کے دوران جس کا طرز و انداز بڑا دل نشین اور موثر ہے۔ اور جو دلوں کو خوب جھنجوڑتا ہے۔ قرآن نے مختصر الفاظ میں حضرت نوحؑ کے واقعہ پر روشنی ڈالی۔ خداوند کریم نے حضرت نوح کی دعا قبول فرمائی۔ اور ان کو ان کے اہل سمیت عظیم مصیبت سے نجات بخشی جن لوگوں نے آپ کی تکذیب کی تھی ان کو طوفان کی نذر کر دیا۔

پھر حضرت ابراہیم کا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے اپنی قوم کے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے آپ کو قتل کرنے اور پھر جلانے کی سازش کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ان کی تدبیروں سے نجات دلائی اور آگ کو ان کی امن و سلامتی کا سبب بنا دیا۔ پھر حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کا قصہ بیان کیا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے لیے چنا اور تورات عنائت کی جس میں ہدایت اور نور تھا۔ ان کو فرعون اور اس کے شر پسند رفقاء پر فتح و نصرت عطا فرمائی۔ اس سورت میں حضرت الیاسؑ کا واقعہ بھی بیان کیا۔ حضرت الیاس نے اپنی قوم کو سمجھایا تھا۔ کہ تم بعل نامی بت کی پوجا کرتے اور احسن الخالقین کی جانب توجہ نہیں دیتے۔

حضرت لوطؑ کے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان کو اور ان کے اہل خانہ کو عذاب الٰہی سے بچا لیا تھا۔ مگر ان کی بیوی ہلاکت و بربادی سے محفوظ نہ رہ سکی۔ قوم لوط پر آسمان سے پتھر برسائے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب ہلاک ہو گئے۔ حضرت یونسؑ کو جب ان کی قوم نے جھٹلایا تو وہ ناراض ہو کر چل دیے۔ ایک کشتی میں سوار ہوئے جو لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ جب کشتی طوفانِ باد و باراں میں گھر کر ہچکولے کھانے لگی۔ تو لوگوں نے کشتی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے یہ تجویز کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے اور جس کے نام کا قرعہ نکلے اس کو دریا کی لہروں کی نذر کر دیا جائے چنانچہ قرعہ حضرت یونس کے نام نکلا۔

آپ کو دریا میں ڈال دیا گیا۔ ایک مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ رحمت الٰہی سے مایوس ہونے اور اظہارِ غیظ و غضب کرنے کی بناء پر آپ معتوب ہوئے۔ آپ نے مچھلی کے بطن میں خدا کو یاد کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ اور ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بیماری کی حالت میں ساحل دریا پہ ڈال دیا۔

جب صحت یاب ہوئے تو اپنی قوم کو عبادتِ خداوندی کی دعوت دی۔ نتیجہ کے طور پر پوری قوم ایمان لائی۔ ان کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی[۱]

سورہ "الصافات" میں یہ واقعات بڑے مختصر انداز میں بیان کیے گئے۔ ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ مکذبین کا کیا انجام ہوا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کی دعا قبول فرمائی۔ ان کے ذریعہ مشرکین کو برے انجام سے ڈرایا گیا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر جمیل کی دعوت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو مقابلتہً زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آپ کے لختِ جگر حضرت اسماعیل کی قربانی کے واقعہ کو بڑے دل نشین اور اثر انگیز اسلوب و انداز میں ذکر کیا۔ یہ واقعہ بت شکنی کے واقعہ کے بعد پیش آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خداوند کریم کے کس قدر اطاعت شعار تھے۔ اور ان میں کس حد تک اطمینان اور خدا کی ذات پر اعتماد پایا جاتا تھا ہر داعی کے لیے دعوت اسلام کی راہ میں اسی قسم کے صبر جمیل سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے۔ دراصل دعوت اسلامی کی راہ میں یہی زادِ حقیقی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ خدا کی راہ پر چل دیئے اور دنیا کی ہر چیز سے منہ موڑ لیا۔ بارگاہ ایزدی میں ایک نیک نہاد فرزند کے لیے دست بدعا ہوئے۔ خدا نے ایک بُردبار اور متحمل مزاج فرزند کی بشارت[۲] دی۔ یہ بچہ بمشکل اپنے والد کے ساتھ شاہراہ حیات پر گامزن

---

[۱] تفسیر طبری ج ۲۳ ص ۶۳

[۲] عوام الناس اور اکثر مفسرین کے نزدیک یہ فرزند حضرت اسماعیل تھے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہوا ہی تھا کہ شدید ترین آزمائش سے دوچار ہوا۔ مگر اس نے انتہائی صبر و سکون سے کام لیا۔ اور اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے تابع کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ اپنے لختِ جگر کو ذبح کر رہے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ اشارہ ربانی ہے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد کے لیے خوشی خوشی آمادہ ہو گئے بیٹے کو خواب کے مضمون سے آگاہ کیا۔ وہ پیکر تسلیم و رضا نظر آیا۔ جب بیٹے کو تعمیل حکم کے لیے پیشانی کے بل لٹایا۔ تو بارگاہ ربانی سے ایک مینڈھا قربانی کے لیے عطا ہوا۔ جناب ابراہیمؑ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ دربار خداوندی سے ندا آئی۔

"ابراہیمؑ! تو نے خواب کی تکمیل کر دی۔ ہم نیک نہاد لوگوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔"

سورہ زیر نظر میں جہاں حضرات انبیاء کے واقعات ——— خواہ مختصر ہوں یا مفصل ——— ختم ہوتے ہیں۔ وہاں سے ملائکہ و شیاطین کے بارے میں عربوں کے افسانوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے وحدانیت کی تاکید مزید اور باری تعالیٰ کی طرف منسوب کردہ جہلاء کی صفات کی تقدیس و تنزیہہ مقصود ہے[1] سورت کا اختتام تحمید و تسبیح پر ہوتا ہے۔ اس طرح سورت کے آغاز و انجام میں پورا پورا ربط و تعلق پیدا ہو گیا ہے۔

آغاز سورت میں قسم کھا کر فرمایا کہ وہ ایک ہے۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی اس کا سہیم و شریک نہیں ہے۔ سورت کا خاتمہ تسبیح اور شریک سے پاک ہوتے (تنزیہہ) پر کیا گیا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سورۃ الصافات کا موضوع ——— طوالت آیات اور کثرت جزئیات کے باوجود ——— متحد ہے۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ) امام المفسرین طبری نے ان لوگوں کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں جو اس سے حضرت اسماعیل مراد لیتے ہیں۔ اور ان کے بھی جن کی رائے میں اس سے حضرت اسحاق مقصود ہیں۔ پھر اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے حضرت اسحاق مراد ہیں۔ طبری کے نزدیک ذبیح اسحاقؑ ہی تھے۔ (طبری ج ۲۳ ص ۵۱-۵۵)

[1] آیت کریمہ فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ کی طرف اشارہ ہے۔

ملائکہ اور شیاطین کے بارے میں عربوں کے یہاں جو بے سروپا توہمات پائے جاتے تھے ان پر قرآن کریم نے یوں کاری ضرب لگائی کہ عربوں کو مخاطب کرکے اس ضمن میں ان کی اپنی رائے لی گئی۔ عربوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے گریباں میں منہ ڈال کر سوچیں۔ اس سے خود ہی انہیں اپنے تخیلات اور مزعوماتِ باطلہ کی رکاکت و سخافت کا اندازہ ہو جائے گا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور فرمایا گیا کہ آپ ان امی عربوں سے دریافت کریں کہ جب اپنے لیے بیٹوں کو پسند کرتے ہیں۔ تو خدا کی طرف بیٹیوں کو منسوب کرنے کی کیا وجہ ہے۔؟ یہ بات انہیں کیوں کر معلوم ہوئی کہ خداوند تعالیٰ بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو ترجیح دیتا ہے۔ یا عربوں کو فرشتوں کی ولادت کا حال معلوم ہے۔ اس لیے وہ ان کی جنس سے آگاہ ہیں۔؟ یا عربوں نے دانستہ خداوند تعالیٰ پر افترا پردازی سے کام لیا ہے۔؟

آخر عربوں کو یہ بات کیسے پسند آئی کہ اللہ تعالیٰ اور جنوں میں قرابت داری کے تعلقات پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ جن اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ روزِ قیامت ان کو باقی مخلوقات کی طرح خدا کے حضور محاسبہ کے لیے پیش کیا جائے گا۔ ان اباطیل کے دھوکے میں وہی شخص آسکتا ہے جس کے دل میں بیماری ہو۔ اور جس کی طبیعت فاسدہ نے اس کو جہنم کا اہل بنا دیا ہو۔

اے کاش! کہ عرب کے یہ باطل پرست اس حقیقت پر غور کرتے کہ فرشتے بذاتِ خود ان کی اس احمقانہ حرکت کی تردید کرتے ہیں۔ فرشتے عالمِ بالا میں بزبانِ حال یا بہ الفاظ میں خدا کو پکارتے رہتے ہیں۔ کہ باری تعالیٰ! ہم تیرے دربار میں صف[ل] باندھے کھڑے

ل[۵] یہ عجیب بات ہے کہ قرآن نے متعدد مقامات پر فرشتوں کا ذکر بصیغہ جمع مؤنث سالم کیا ہے۔ جیسے سورہ الصافات کے شروع میں "وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا" اور سورہ المرسلات کے آغاز میں "وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا" مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ بتاویل جماعت فرشتوں کو مؤنث قرار دے کر ان (باقی بر صفحہ آئندہ)

تیری ہی تسبیح و تقدیس کے گن گا رہے ہیں۔ اور تجھے کسی رفیق و شریک اور اولاد سے پاک سمجھتے ہیں

کفار کے احمقانہ و جاہلانہ تو ہمات پر کاری ضرب لگانے کے بعد یہ سورت ان کو ان کے انجام بد سے ڈراتی اور خدا کی اس سنت سے آگاہ کرتی ہے کہ وہ با اخلاص شکر وں کو فتح و نصرت عطا کرتا ہے۔ پس سب عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس کے رسولوں پر درود و سلام۔ وَلَهُ الْحَمْدُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ [1]

سورۃ الکھف :

سورت الکھف کی طرف منتقل ہونے ہوئے ہمیں شدید اختصار سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اکثر جگہ ہم وضاحت و صراحت کے بجائے صرف اشارہ سے کام کریں گے کیونکہ ہمیں ایک ایسی سورت سے سابقہ پڑ رہا ہے جو بڑی طویل ہے۔ اور ایک سو دس [110]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کے اوصاف بیان کیے۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہو سکتی ہے۔ مگر ہمارا خیال ہے۔ — واللہ اعلم — کہ قرآن نے یہاں ایک اور باریک نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ قرآن نے عربوں کی غلط فہمی کو بخوبی دور کر دیا تھا۔ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اس کے بعد اس بات میں مطلقاً کوئی مضائقہ نہ تھا کہ لفظی اعتبار سے ان کو مذکر ظاہر کیا جاتا یا مؤنث۔ ہم وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ قرآن نے فرشتوں کی تانیث کی تردید کر کے ان کو مذکر ثابت کرنا چاہا۔ اس لیے کہ فرشتوں کا تعلق عالم الغیب کے ساتھ ہے۔ ہم عالم الغیب کی اسی بات کو یقینی طور پر جانتے ہیں جو صراحتہً کتاب و سنت میں وارد ہوئی ہے ظاہر ہے کہ اللہ اور رسولؐ نے ہمیں یہ بات معلوم کرنے کے لیے مکلف و مامور نہیں کیا کہ فرشتے مذکر ہیں یا مؤنث۔ بخلاف ازیں قرآن میں ان کا ذکر کہیں بصیغہ مؤنث کیا گیا۔ اور کہیں بلفظ مذکر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے صف باندھ کر کھڑے ہونے کا ذکر اس سورت کے آغاز میں بصیغہ مؤنث کیا گیا۔ جب کہ اس سورت کے آخر میں فرشتوں کا قول بصیغہ جمع مذکر سالم ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ قرآن میں فرشتوں کا ذکر زیادہ تر مذکر کے صیغہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں فرمایا۔ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ۔ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ۔

[1] تفسیر طبری اور ابن کثیر کے حوالہ سے اس سورت کی تفسیر میں ہم جو تاویلات ذکر کر چکے۔ اس کے علاوہ اس سورت کی تفسیر کے لیے دیکھیے تفسیر کبیر للرازی ج ۷ ص ۱۰۱ نیز بیضاوی ج ۲ ص ۲۷۱ و نیز تفسیر نسفی ج ۴ ص ۳!

آیات پر مشتمل ہے۔ معدودے چند کے سوا اکثر آیتیں لمبی ہیں۔ اس کے آغاز وسط اور آخر میں چند دینی واقعات بیان کیے گئے ہیں جو سورت کے دو تہائی حصہ پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں واقعات کے وسط یا ان کے آخر میں ان پر نقد و تبصرہ اور خیال آرائی بھی کی گئی ہے۔

بسا اوقات ہمیں یوں نظر آتا ہے کہ سورۃ الکہف ان سورتوں میں سے ایک ہے جن میں اس بحث کی گنجائش موجود ہے کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات دینی اغراض کے تابع ہیں۔ مگر اس بحث کی تفصیلات پیش کرنے سے ہمیں یہ خطرہ مانع ہے کہ مبادا ہم اپنے اصل مقصد سے دور چلے جائیں۔ ہمارا مقصد یہاں یہ بیان کرنا ہے کہ مکہ اور مدینہ میں اسلامی دعوت کو کن مراحل و ادوار سے گزرنا پڑا۔ اسی مقصد کے پیش نظر ہم ان سورتوں پر تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے جن کو تحلیل و تجربہ کے لیے ہم نے منتخب کیا ہے۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح سورۃ الکہف کا مرکزی موضوع تصحیح عقائد ہے۔ اس سورت میں اثباتِ وحدانیت خالق و مخلوق کے فرق و امتیاز اور وحی کے اسرار پر بحث کی گئی ہے ہمیں اس ضمن میں آیات سے استشہاد و استدلال پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر قاری اس سورت کے مندرجات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

آغاز سورت میں فرمایا کہ یہ قرآن اہل توحید و ایمان کو بشارت دینے اور ان لوگوں کو ڈرانے کے لیے نازل کیا گیا ہے جو کہتے ہیں کہ خدا کی اولاد بھی ہے[1] سورت کے آخر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ اپنی بشری حالت اور آپ کی رسالت و نبوت کے مابین جو عظیم فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ وہ لوگوں پر واضح کر دیں۔ بشر ہونے کے اعتبار سے آپ باقی انسانوں کی طرح ہیں۔ جو چیز آپ کو دیگر انسانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ خداوندی احکام ہیں جو آپ کے دل پر القاء کیے جاتے ہیں[2]

---

[1] ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مشرکین عرب خدا کے لیے اولاد کا اثبات کرتے اور کہتے تھے کہ ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ (حاشیہ ۲ برصفحہ آئندہ)

اسی ضمن میں اصحاب کہف کا یہ قول ذکر کیا گیا ہے کہ۔

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا ۔
ہمارا پروردگار وہ ہے جو سب آسمانوں اور زمینوں کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے سوا کسی معبود کو نہیں پکاریں گے۔

اسی طرح اس سورت میں اس مومن کا بھی قول مذکور ہے جس نے دو باغوں والے مغرور آدمی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ،،
ہمارا پروردگار تو اللہ تعالیٰ ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

عبد صالح (حضرت خضر) نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ،،
یہ تیرے رب کا احسان ہے۔ میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا۔

ان آیات میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو حاوی ہے اور آسمان و زمین کا کوئی ذرہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

ان اولین حقائق کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ سورت کا ان مضامین کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ حقائق نہایت اچھوتے اور دل نشین انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی بناء پر یہ سورت ایک یگانہ اور منفرد اسلوب کی حامل نظر آتی ہے۔ یہ حقائق علمی امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان میں ایمان کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس آیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (تفسیر ابن کثیر۔ ج ۳ ص ۱۰۷) مفسر طبری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"اے محمدؐ! آپ ان مشرکوں سے کہہ دیں کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں اور بنی آدم میں سے ہوں۔ میں وہی بات جانتا ہوں جو اللہ تعالیٰ مجھے سکھا دے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ مجھے بتایا! کہ جس معبود کی عبادت ضروری ہے۔ وہ ایک ہی ہے جس کا کوئی نظیر و شریک نہیں۔"
(طبری ج ۱۶ ص ۳۱)

اس سورت میں تین واقعات بیان کیے گئے ہیں جو غیبی امور کے بارے میں مومنین کے عقائد کی اصلاح کرتے ہیں۔ یہ واقعات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ انسان براہ راست کن حقائق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور کون سے معلومات ایسے ہیں جن کے حصول کے لیے انسان اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ وہ جب تک ان غیبی امور کا پردہ نہ اٹھائے انسان ان کو جان اور پہچان نہیں سکتا۔ وہ تین واقعات یہ ہیں۔

(۱) اصحاب الکہف کا واقعہ (۲) حضرت موسیٰ اور عبد صالح کا قصہ (۳) ذوالقرنین اور اس کے اسفار سرگانہ خصوصاً یاجوج ماجوج کا واقعہ۔

اصحاب الکہف کے واقعہ کو قرآن نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ تینوں حصے حرکت اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ یہاں تک کہ اصحاب کہف کی طویل نیند کا واقعہ بھی اپنے اندر حرکت اور زندگی کے آثار رکھتا ہے۔ حیرت ہے کہ قرآن نے اپنے تخلیقی انداز بیان میں ان نوجوانوں کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس میں وہ محوِ خواب ہونے کے باوجود جاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نیند تین صدیوں تک ان پر طاری رہی۔ مگر وہ اس طرح کروٹیں بدلتے رہے جیسے وہ شخص جو جاگ رہا ہو۔ نہ وہ بیٹھتے۔ نہ آنکھیں کھولتے۔ نہ اپنی جگہ تبدیل کرتے۔ اس لیے جو لوگ ان کو دیکھتے یا ان کے پاس سے گزرتے ان پر دہشت طاری ہو جاتی۔ اصحاب کہف کی اس تصویر میں حرکت اور زندگی کے آثار اور بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ جب ہم ان کے کتے کے بارے میں یہ پڑھتے ہیں کہ وہ ٹانگیں پھیلائے صحن میں یوں بیٹھا تھا۔ جیسے ان کی حفاظت کر رہا ہو۔

لہ اصحاب کہف کا قصہ ایک بین الاقوامی واقعہ ہے۔ در مسیحیت کے لٹریچر میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ یہ واقعہ اس قدر شہرت کا حامل ہے کہ ترکستان کے لوگ اس سے واقف تھے۔ پانچویں صدی عیسوی کے مسیحی لٹریچر میں بزبان سریانی اس واقعہ کا جو تذکرہ ملتا ہے اس کے مطابق اصحاب کہف کی تعداد سات تھی۔ ان کی نیند کا زمانہ دو سو سال بتایا گیا ہے۔ ان کی نیند کا آغاز شہنشاہ دقیانوس (۲۴۹ء تا ۲۵۱ء) کے عہد حکومت میں ہوا۔ اصحاب کہف تھیوڈوسیس کے زمانہ میں ۱۹۶ سال کی طویل نیند کے بعد بیدار ہوئے

اس پر مزید یہ کہ آفتاب عالم تاب کی کرنیں بھی اپنا سایہ وہاں نہیں ڈالتیں۔ جب سورج طلوع ہوتا تو ان کی دائیں جانب مڑ جاتا اور جب غروب ہوتا تو بائیں جانب جھک جاتا۔ طلوع و غروب کے وقت اصحاب کہف سورج کی حرارت و تمازت سے محفوظ رہتے۔ یہ معجزہ کس قدر حیرت خیز ہے[۵۱]

واقعہ کا دوسرا پارٹ بھی حرکت و حیات سے بھرپور معمور ہے۔ اب اصحاب کہف جاگتے ہیں۔ اور ان میں حس و حرکت کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہیں اس قدر معلوم ہے کہ وہ طویل نیند کے بعد بیدار ہوئے ہیں۔ مگر ٹھیک طور سے یہ معلوم نہیں کہ وہ غار میں کتنا عرصہ محوِ خواب رہتے۔

چنانچہ وہ ایک دوسرے سے مدتِ خواب کے بارے میں پوچھتے اور آخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ ان کی نیند کتنی بھی طویل ہو۔ وہ ایک دن یا دن کے ایک طویل حصہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ پھر اس معاملہ کو خدا کی ذات پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اب یہاں سے کہانی کا تیسرا اور مختصر پارٹ شروع ہوتا ہے۔ اصحاب کہف میں سے ایک ساتھی بچی کھچی چاندی کی نقدی لے کر پاکیزہ کھانا لانے کے لیے بازار جاتا ہے۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد شدید بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ باقی ساتھی رخصت ہونے سے قبل اس کو مشرکوں سے محتاط رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر شقامی مشرکین کو پتہ چل گیا تو وہ ہمیں قتل کر دیں گے۔ یا خدائے واحد و قہار کی عبادت سے روک دیں گے[۵۲]

اصحابِ کہف کے واقعہ سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس بستی کے رہنے والے ایمان لا چکے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد مشرک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بستی والوں کو اس حقیقت

---

۵۱ تفسیر طبری ج ۱۵ ص ۱۳۵

۵۲ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۷۶ – ۷۷

سے آگاہ کر دیا کہ چند نوجوان اپنے دین کو بچانے کے لیے تین صدیوں سے یہاں بھاگ آئے تھے۔ اور وہ ابھی تک ایک غار میں مقیم ہیں۔ جب اصحاب کہف کا ایک ساتھی کھانا لینے کے لیے بازار آیا تو شہر والوں نے اسے پہچان لیا۔ وہ اصحاب کہف سے ملے اور ان کی بے حد تعظیم کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو ان کی طبعی موت سے ہمکنار کر دیا تو شہر والے ان کی تکریم میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ آخر طویل جدل ونزاع کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی قبروں پر ایک عبادت خانہ تعمیر کیا جائے تاکہ ان کی یاد اور ان کی عجیب وغریب نیند کا واقعہ تازہ رہے۔[1]

اصحاب کہف کا یہ واقعہ بلاشبہ اچھوتا اور نادر قسم کا ضرور ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کائنات ارضی پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں سب سے زیادہ انوکھا اور نادر ترین واقعہ ہے۔ قرآن نے اس واقعہ کے تینوں پارٹ عجائب وغرائب سمیت بیان کر دیے ہیں۔ مگر جب واقعہ کے اس پہلو پر غور کیا جائے کہ اس میں قدرت خداوندی کا ہاتھ ہر موقع پر کار فرما ہا تو اس میں حیرت واستعجاب کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اسی نقطۂ نگاہ کو ذہن نشین کرنے کے لیے قرآن نے اس کی تمہید میں فرمایا ہے۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ	کیا آپ کا خیال ہے کہ غار اور رقیم والے
وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۔	ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے۔

قرآن میں اس سوال کا جو جواب دیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اصحاب کہف

---

[1] الکشاف ج ۲ ص ۳۸۴

[2] مفسرین کے یہاں اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ "رقیم" سے کیا مراد ہے۔ بعض کے نزدیک ایک گاؤں یا وادی کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کے پہاڑ کا نام ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ رقیم پتھر کی ایک تختی تھی جس پر اصحاب کہف کا واقعہ لکھ کر اس کو غار کے دروازہ پر آویزاں کر دیا گیا تھا۔ امام المفسرین طبری کے نزدیک آخری قول ارجح ہے۔

(طبری ج ۱۵ ص ۱۳۲)

خدا کی عجیب ترین نشانی نہ تھے[1] بلکہ وہ چند نوجوان تھے جو خدا پر ایمان لائے۔ ایمان کی بنا پر وہ عزت و قوت سے بہرہ ور ہوئے۔ انہوں نے بڑے زور سے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور دیگر معبودوں کی عبادت سے روکا۔ جب کفار نے ان کا قافیہ تنگ کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنی آغوشِ رحمت وا کر دی۔ ان کو غار میں جگہ دی اور ان کی عمر دراز کر دی۔ ان کی طویل نیند —— جس کے عام لوگ خوگر نہیں ہیں —— کو خدا کی آیات میں سے ایک آیت ٹھہرایا۔ اگرچہ یہ نشانی سب نشانیوں سے بڑی نہیں ہے۔

قرآن کا مقصد اس واقعہ سے یہ ہے کہ غیبی امور کے بارے میں لوگوں کے عقائد کو درست کیا جائے۔ قرآن اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ لوگ نادیدہ امور میں دلچسپی لینے اور ان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے خوگر ہیں چنانچہ وہ اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں قیاس آرائی سے کام لیتے ہیں۔ قرآن بتاکید لوگوں سے کہتا ہے کہ غیر ضروری امور میں جدل و نزاع کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ لوگوں کو اس ضمن میں اہل کتاب سے سوال کرنے سے بھی روکتا ہے[2]

اس بات کا کوئی فائدہ نہیں کہ یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ اصحاب کہف کتنے تھے؟ ان کے نام کیا تھے؟ ان کی شکل و صورت کیا تھی۔؟ وہ وقت معین تک غار میں کیسے محفوظ رہے۔؟

قرآن ان غیر ضروری سوالات کا جواب دینے کے بجائے اس بات پر روشنی ڈالتا ہے

---

[1] طبری جلد ۱۵ ص ۱۳۰

[2] مفسر طبری آیت کریمہ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں آپ اہل کتاب سے جھگڑا نہ کریں۔ یہاں گنتی کا لفظ مذکور نہیں ہے۔ کیونکہ سامعین اس سے آگاہ تھے۔ (طبری ج ۱۵ ص ۱۰۱)

کہ اس واقعہ میں عبرت پذیری کا کیا سامان مضمر ہے ؛ اور اہل ایمان اس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟ قرآن اہل ایمان کو اس بات کی تعلیم دینا چاہتا ہے کہ انہوں نے قبل ازیں جو کچھ سیکھا ہے اس پر بھروسہ کریں۔ انہیں قیامت کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ مستقبل مستور و محجوب ہے۔ لہذا مستقبل کے بارے میں قطعی و حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس کے بارے میں غور و فکر کرتے رہنا چاہیئے۔

سورۃ الکہف میں فرمایا:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ	کسی بات کے بارے میں یوں نہ کہیں کہ میں
ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ	کل یہ کام کروں گا مگر یہ کہ خدا چاہے اور
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ [1]	جب بھول جائے تو اپنے خدا کو یاد کر۔

اس سورت میں حضرت موسیٰ اور عبد صالح کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اصحاب کہف کے واقعہ کی نسبت اس کا امور غیبیہ سے زیادہ تعلق ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس سورت میں ذکر کردہ جو چار مناظر مشاہدہ کیے تھے بظاہر وہ لوگوں کی معروف عقل و منطق سے ٹکراتے ہیں اس لیے ان کے مطالعہ سے حیرت و استعجاب کا احساس ابھرتا ہے۔ مگر جب ان واقعات کو غیبی سطح پر رکھ کر جانچا پرکھا جائے۔ تو یہ خود بخود حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چاروں واقعات میں سے اولین واقعہ کے ہیرو حضرت موسیٰ کلیم اللہ ہیں۔ اس واقعہ میں اگرچہ حیرت کا سامان پایا جاتا ہے مگر ان تین واقعات کے مقابلہ میں چنداں اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ جن کا ہیرو خدا کا ایک نیک بندہ (جن کا نام حدیث نبوی میں خضر بتایا گیا ہے۔) ہے جس کو خداوند کریم نے اپنی رحمت سے نوازا اور خصوصی علم عطا کیا تھا۔

پہلے واقعہ میں حضرت موسیٰ اپنے پختہ عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ عرصہ دراز تک

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۹

چلتے رہیں۔ تب بھی وہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر پہنچ کر رہیں گے۔ منشائے ایزدی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ عبد صالح سے ملاقات کریں۔ اس لیے حضرت موسیٰ کو یہ بات فراموش کرا دی جاتی ہے کہ ان کے رفیق سفر نے ایک بھنی ہوئی مچھلی زاد راہ کے طور پر ساتھ لے لی تھی۔ مگر یہ بھنی ہوئی مچھلی قدرتِ خداوندی سے جی اٹھتی اور چپکے سے دریا میں داخل ہو جاتی ہے حضرت موسیٰ کا نوجوان ساتھی یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ مگر موسیٰ کو اس پر کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ جہاں وہ مچھلی بھول آئے ہیں عبد صالح کی جائے ملاقات وہی ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ اور ان کا رفیق سفر دونوں واپس لوٹتے ہیں اور اس طرح ان کی ملاقات اس شخص سے ہو جاتی ہے جس کو وہ تلاش کر رہے تھے[۲]

اب یہاں سے دوسرا سین شروع ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کا نوجوان رفیق غائب ہو جاتا ہے۔ تنہا موسیٰ علم لدنی کے حامل عبد صالح سے بات چیت کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ عبد صالح سے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے رفیقِ سفر رہ کر استفادہ کریں گے۔ حضرت موسیٰ کو مشروط اجازت ملتی ہے۔ کہ صبر و اطاعت سے کام لینا ہوگا۔ اور سوال و اعتراض کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔ جب کشتی وسط دریا میں پہنچتی ہے۔ تو عبد صالح اس کی ایک تختی توڑ دیتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ ضبط نہ کر سکے

---

[۱] قرآن اس ضمن میں خاموش ہے کہ مجمع البحرین میں وہ کونسی جگہ تھی جہاں حضرت موسیٰ پہنچنا چاہتے تھے۔ ہمیں اس سلسلہ میں غور و فکر کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ مگر تاریخی معلومات کی روشنی میں ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ مجمع البحرین سے وہ جگہ مراد ہے جہاں بحر احمر میں خلیج عقبہ اور نہر سویز باہم ملتے ہیں ایسے معاملات میں تفاسیر کی طرف رجوع کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ تفسیر کے اکثر مندرجات صرف قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ یہاں تک کہ تفسیر طبری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔

(طبری ج ۱۵ ص ۱۷۶)

[۲] تفسیر کشاف ج ۲ ص ۵۰۰

اور اس پر معترض ہوتے۔ کہ اس طرح تو کشتی کے ڈوب جانے اور سواروں کے غرق دریا ہونے کا خطرہ ہے۔ فریقین میں تکرار کی نوبت آتی ہے۔ حضرت موسیٰ عہد کرتے ہیں کہ آئندہ کج بحثی اور سوال و اعتراض سے احتراز کریں گے۔

تیسرے سین میں دونوں (حضرت موسیٰ اور عبد صالح) کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوتی ہے۔ عبد صالح اس کو قتل کر دیتا ہے حضرت موسیٰ غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ کہ آپ نے بلا وجہ ایک پاکیزہ جان کو موت کی بھینٹ چڑھا دیا۔ عبد صالح حضرت موسیٰ کو ان کا عہد یاد دلاتے ہیں۔ موسیٰ پھر معذرت خواہ ہوتے ہیں۔ اور عہد کرتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔

چوتھے سین میں دونوں کا گزر ایک ایسے شہر میں ہوتا ہے جہاں کے رہنے والے انتہائی ممسک ہیں۔ نہ کسی کو مہمان ٹھہراتے ہیں۔ نہ کھانا کھلاتے ہیں۔ اچانک ایک شکستہ دیوار نظر پڑتی ہے۔ عبد صالح بلا معاوضہ اس کی مرمت کر دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ ضبط نہیں کر سکتے اور پوچھ بیٹھتے ہیں کہ ایسے بخیل لوگوں کی دیوار کو بلا معاوضہ تعمیر کرتے میں کیا مصلحت پنہاں تھی؟[۱]

عبد صالح کے معاملات میں تیسری دفعہ دخل اندازی کر کے حضرت موسیٰ نے استفادہ کا آخری موقع بھی کھو دیا اب عبد صالح ان امور غامضہ کی علت و مصلحت پہ باری باری روشنی ڈالتے ہیں اور حضرت موسیٰ بے تابانہ بغور ان کے ارشادات کو سنتے ہیں۔

فرماتے ہیں:

۱۔ میں نے کشتی کو اس لیے توڑا تھا تاکہ وہ بدستور اپنے مالکوں کے قبضہ میں رہے کشتی کے مالک چند مساکین تھے جو دریا میں کام کرتے تھے۔ سلطانِ وقت نہایت ظالم

---

[۱] ابن کثیر اپنی تفسیر کی ج ۳ ص ۹۸ پر لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے فرمایا: جب ان لوگوں نے ہماری مہمانی کا حق ادا نہیں کیا تو ان کی دیوار کو بلا معاوضہ تعمیر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

تھا۔ جو کشتی صحیح حالت میں ہوتی اس پر قبضہ جما لیتا۔ چنانچہ عیب دار ہونے کی وجہ سے وہ کشتی غاصبانہ قبضہ سے محفوظ رہی۔

۲۔ بے گناہ بچے کو اس کے والدین کے مفاد کی خاطر تہ تیغ کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مطلع کر دیا تھا۔ کہ یہ بچہ کافر پیدا ہوا ہے[1]۔ بڑا ہو کر یہ اپنے والدین کو کفر و طغیان میں مبتلا کر دے گا۔ اگر مجھے اس حقیقت سے آگاہ نہ کیا گیا ہوتا تو میں یا کوئی اور شخص اس جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

۳۔ دیوار کی بلامعاوضہ تعمیر اس شہر کے کنجوس لوگوں کے لیے عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔ دراصل اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے نیچے دو یتیموں کا خزانہ محفوظ تھا۔ ان کے والد نے زیر دیوار وہ خزانہ چھپا دیا تھا۔ کہ اس کے بیٹے بڑے ہو کر اپنے مصرف میں لے آئیں گے۔ میں نے دیکھا کہ شکستہ دیوار اگر گر گئی تو اہل شہر یہ خزانہ نکال لیں گے۔ اس لیے میں نے خدا کے حکم سے بلامعاوضہ یہ دیوار مرمت کر دی۔

ان واقعات کی تاویلات پیش کرنے سے عبد صالح کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ غیب دان ہیں۔ بخلاف ازیں وہ ان کی حکمت و مصلحت کو خدا کے سپرد کرنے اور اپنے عجز و تقصیر کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ واقعات دراصل اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ غیبی و لدنی علم بحکم خداوندی ایک ایسے شخص میں جلوہ گر ہوتا ہے جو نہ تو معروف نبی ہے اور نہ مشہور رسول۔ بلکہ قرآن اس کے نام تک سے خاموش ہے[2]۔

ذوالقرنین :

تیسرا واقعہ جو ذوالقرنین سے وابستہ ہے بظاہر اصحاب کہف اور عبد صالح کے واقعہ

---

[1] احکام اہل الذمہ لابن القیم ص ۵۳۱ نیز شفاء العلیل ص ۲۸۴۔

[2] مفسرین نے ان کا نام "الخضر" بتایا ہے۔ یہ نام ان مشہور روایات پر مبنی ہے جن کو لوگ ہر زمانہ میں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ لوگ ہر زمانہ میں ان کے واقعات کو آب و رنگ دے کر اور بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہے ہیں۔

کی نسبت امورِ غیبی سے لاتعلق یا قلیل الربط نظر آتا ہے۔ اس واقعہ میں صرف یہ بتایا گیا ہے۔ کہ ذوالقرنین نامی شخص نے تین سفر انجام دیے۔ ایک جانب مشرق دوسرا جہت مغرب اور تیسرا ان دونوں کے وسط میں۔ مگر جس غیر معروف فضا میں سفر و سیاحت کے یہ واقعات پیش آئے ——— اور شاید قرآن کا مقصود بھی یہی غموض و خفاء ہے ——— وہ پس پردہ امور غیبیہ کی جانب مشیر ہے۔ ذوالقرنین اپنے پہلے سفر میں وہاں پہنچا جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ دوسرے سفر میں طلوع آفتاب کی جگہ پہنچا۔ تیسرے سفر کے دوران دو دیواروں کے درمیان منطقہ متوسط میں پہنچا۔

جانبِ مغرب سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ آفتاب چکنی مٹی والے ایک چشمہ میں غروب[1] ہو رہا ہے۔ وہاں پانی اور گھاس کی افراط تھی۔ قرآن نے اس چشمے کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ قرآن کریم نے اس ضمن میں جس پردہ پوشی سے کام لیا ہے اس نے ہمیں شدید تاریکی اور لاعلمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس میں غیبی امور سے بھی زیادہ رازداری پائی جاتی ہے۔

جانبِ مشرق سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے۔ جن کو سورج سے بچانے کے لیے کوئی چیز درمیان میں حائل نہیں۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگ برہنہ تھے۔ اور سورج سے محفوظ رہنے کے لیے ان کے تن پر کپڑا نہ تھا۔ یہ مفہوم بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بے برگ و شجر صحرا تھا جس میں سورج سے محفوظ رہنے

---

[1] یہ تفسیر اس صورت میں درست ہو سکتی ہے جب "حمئۃ" ہمزہ کے ساتھ پڑھا جائے بعض قراء اس کو "حامیۃ" بھی پڑھتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "گرم"۔ امام المفسرین طبری کے نزدیک دونوں قرائتیں درست ہیں۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ممکن ہے کہ جس چشمہ میں آفتاب غروب ہو رہا ہو۔ اس کا پانی گرم اور وہاں کی مٹی بھی چکنی ہو۔ اس طرح دونوں قراءتیں درست ٹھہریں گی۔ اور وہ چشمہ دونوں صفات کا حامل ہوگا۔ پھر طبری قراءت کے بارے میں وارد شدہ روایات پیش کرتے ہیں" (طبری ج ۱۶ ص ۱۰)

کے لیے درخت نہ تھے۔ قرآن اس ضمن میں خاموش ہے کہ اس قوم کا نام کیا تھا۔ یا وہ کون سا علاقہ تھا۔

ذوالقرنین نے دو دیواروں "بَیْنَ السَّدَّیْنِ" کے درمیان جو سفر انجام دیا ہے اس کے تصور سے اس قدر خوف طاری ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس قدر دہشت غیبی امور کو دیکھنے سے بھی طاری نہیں ہوتی۔ قرآن نے اس ضمن میں ایک خاص جگہ کا نام "بَیْنَ السَّدَّیْنِ" اور ایک خاص کا نام "یاجوج ماجوج" ذکر کیا ہے۔ اس قوم کی خصوصیت یہ بتائی کہ وہ زمین میں فساد بپا کرتی تھی۔[1]

کچھ یوں معلوم دیتا ہے کہ پردہ داری اور غموض کے یہ رنگ ڈھنگ اس خاص موقع پر مطلوب و مقصود ہیں۔ قرآن نے ذوالقرنین کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ ان واقعات کی طرح ہرگز نہیں جو کسی تاریخ کی کتاب میں کسی عظیم فاتح کے بارے میں مرقوم ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔ دراصل قرآن نے ذوالقرنین کی سیاحت کے تین واقعات ذکر کر کے اس کی تہ میں ایک ایسے انسان کی خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جو تعلق باللہ میں معروف تھا۔ اور جو اس بات کا شدید احساس رکھتا تھا کہ اس کی قوت و شوکت ذاتی اہلیت و صلاحیت پر مبنی نہیں بلکہ خداوند قدیر کی عطا کردہ ہے۔ خدا نے ہر چیز اس کے لیے مہیا کی۔ زندگی کے حوادث و آلام میں اس کو پکار کر یا الہام کر کے یا وحی کے ذریعے اس کی بروقت رہنمائی فرمائی۔ جب ذوالقرنین نے سورج کو چکنی مٹی کے چشمہ میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تو یہ ندا آئی

یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ	اے ذوالقرنین! یا تو ان کو سزا دیجیے یا ان
وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ؕ	سے حسن سلوک روا رکھیے۔

ذوالقرنین کے تعلق باللہ کا اظہار اس کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اس نے فصیل

---

[1] یہی وجہ ہے کہ ان الفاظ کی اصلی مراد معلوم کرنے کے لیے ہم کتب تفسیر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

بتاتے ہوئے کہے۔

مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي " — میرے رب نے مجھے جو قوت بخشی ہے وہ بہتر ہے میری مدد کیجئے۔

تعمیر سے فارغ ہونے پر یہ الفاظ کہے۔

هَذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ،، — یہ میرے رب کی عنایت ہے۔ جب میرے رب کا وعدہ پورا ہوگا تو اس کو پارہ پارہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ غیبی امور کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے سورہ کہف میں یہ تین واقعات بیان کیے گئے۔ واقعات کا حاصل یہ ہے کہ غیبی امور کو علام الغیوب کے سپرد کرنا چاہیے۔ وہ غیبی امور کی نقاب کشائی ایک خاص حد تک ہی کرتا ہے۔ اور اگر کسی کو دکھاتا بھی ہے۔ تو پس پردہ دکھاتا ہے۔

اگر اس روایت کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے کہ اہل مکہ نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ کے علمائے یہود کے پاس بھیجا تھا کہ ان سے ایسے سوالات پوچھ کر آئیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھے جائیں اور اس طرح ان کو تنگ کیا جائے۔ یہود نے دونوں کو آنحضورؐ سے یہ سوال دریافت کرنے پر آمادہ کیا کہ گذشتہ زمانہ میں وہ چند نوجوان کون تھے۔ جو عجیب واقعہ سے دوچار ہوئے؟ دوسرے یہ کہ وہ سیاح کون تھا جس نے مشرق و مغرب کو چھان مارا۔؟[۲]

اس سورت کے مطالعہ سے قرآنی تعلیمات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس

---

[۱] اس کے باوجود بعض جاہل مفسرین نے ذوالقرنین جیسے متقی اور دین دار شخص کو بت پرست اسکندر رومی سمجھا ہے اور دونوں کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ یہ بعض مستشرقین کی تقلید جامد کا نتیجہ ہے۔

[۲] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۱

بلیں اہل ایمان کو مخاطب کر کے بلا تحقیق رجماً بالغیب کوئی بات کہنے عبث قسم کے جدل و نزاع سے احتراز و اجتناب اور تعلق باللہ استوار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ سورت کا اولین اور مرکزی مضمون ذات باری کے بارے میں عقیدہ کی تصحیح اور غیبی امور کو علام الغیوب کے سپرد کرنا ہے۔

اس کے بعد مختصراً سورۂ کہف میں ان مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ دنیوی ساز و برگ کی ناقدری ہے[1]

۲۔ دنیا فانی اور جلد زوال پذیر ہے[2]

۳۔ صبح و شام خدا کو پکارنے والوں کی معیت و رفاقت کے فوائد۔

۴۔ حقیقی عزت ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے[3]

---

[1] مادی اشیاء کی حقارت کی تصویر تنگدست مومن اور دو باغوں کے مالک مغرور شخص کے واقعہ میں کھینچی گئی ہے۔ مومن نے دوسرے شخص کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

إِن تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنكَ مَالًا وَوَلَدًا ۔ فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّن جَنَّتِكَ

اگر تو مال و اولاد میں مجھے اپنے سے کم سمجھتا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا کردے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھلوں سے لدا ہوا اور کھجور کے درختوں سے گھرا ہوا باغ آن کی آن میں کانٹے کی طرح سوکھ کر گر پڑا (کشاف ج ۲ ص ۳۸۹)

[2] مثلاً سورۃ الکھف ہی میں فرمایا:

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ

(کشاف ج ۲ ص ۳۹۲)

[3] سورۃ الکھف میں اس کی واضح ترین مثال یہ آیت ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ

اس آیت میں اہل ذکر اور صلحاء کی ہم نشینی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ دعوت حق کا انحصار و مدار اسی قسم کے لوگوں پر ہے۔ خواہ وہ تنگدست ہوں یا امیر۔ طاقتور ہوں یا کمزور۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۸۰)

۵۔ منکرین قیامت کی ناکامی[1]

بلاشبہ سورت میں ذکر کردہ یہ افکار و نظریات اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ پوری مطابقت و یگانگت رکھتے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ سورت کا مرکزی نقطہ عقائد کی تصحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ عقائد کی درستی کے لیے چیزوں کی اصلی قدر و قیمت اور زندگی کے سانچوں اور پیمانوں سے آگاہی ضروری ہے۔

سورۂ ابراہیم :

اس سورت پر پہنچ کر تیسرے اور آخری مرحلہ پر نازل شدہ مکی سورتیں ختم ہو جاتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ قبل ازیں ہم جن مکی سورتوں کا مطالعہ کر چکے ہیں اس سورت میں بیان کردہ حقائق بڑی حد تک ان کے ساتھ ہم رنگ و ہم آہنگ ہیں۔ خصوصاً دوسرے مرحلہ پر مکہ مکرمہ میں جو سورتیں اتریں ان میں سے آخری سورتیں اس کے ساتھ کامل یگانگت و مماثلت رکھتی ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں ذکر کردہ حقائق پر جب ہماری نگاہ پڑتی ہے تو ہم یوں محسوس کرتے ہیں کہ یہ سابقاً بیان کردہ احکام و مسائل کا مثنیٰ اور ظل ہیں۔

اس سورت میں جن نمایاں حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وحدت ادیان۔

۲۔ خدا کی وحدانیت کا اثبات۔

۳۔ منکرین کو بعث و حساب کی تلقین۔

---

[1] آیت کریمہ: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ کی تفسیر میں مفسر طبری فرماتے ہیں

اس سے مراد یہ ہے کہ بعض عامل اس زعم فاسد میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ اور ان کے اعمال سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔ مگر درحقیقت وہ کام خدا کی ناراضگی کے موجب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اہل ایمان کی راہ سے برگشتہ اور منحرف ہوتے ہیں۔"

(ابن جریر طبری ج ۶ ص ۲۹)

۴۔ نعمت ہائے خداوندی انسان جن کی ناشکری کرتا ہے۔

۵۔ منکرین و معاندین کا خدا کی بارگاہ میں محاسبہ۔

۶۔ اہل جنت و جہنم کے مناظر کی تصویر کشی۔

۷۔ ظالم اور ناشکرے انسانوں کو زجرو عتاب جو حسین و جمیل کائنات سے آنکھیں بند رکھتے ہیں[1]

یہ سورت زیر تبصرہ کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ اور وہی شخص اس پر اکتفاء کر سکتا ہے۔ جو اس روشنی سے غافل رہ کر قرآن کا مطالعہ کرنے کا عادی ہو جس کی جھلک ہر سورت میں نمایاں ہے۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو قرآن کے اس خاص پیغام سے بے بہرہ ہو جو قرآن کی ہر آیت انسانی قلب و ذہن تک پہنچاتی ہے۔

غالباً اس سورت کا امتیازی و خصوصی پہلو یہ ہے کہ اس کی اکثر آیات میں شیخ الانبیاء حضرت ابراہیم جیسی چیدہ و برگزیدہ شخصیت کی جھلک نمایاں ہے۔ اور انہیں کے نام پر اس سورت کا نام یہ تجویز کیا گیا ہے۔ انہی کی مبارک دعوت سے جمیع اقوام وازمنہ میں وحدت رسالت کا اظہار ہوا۔ اور انہی کے ایمان راسخ کے زیر اثر توحید کا پودا بڑھا اور پروان چڑھا آپ کے عجز و نیاز سے بھرپور و معمور دل پر حسین کائنات کے نقش و نگار مرتسم ہوئے اور پھر کفر و شک کے مواقف کی جلوہ گری ہوئی۔

یہ بات نگاہ سے اوجھل نہ رہے کہ اس سورت کے وسط میں حضرت ابراہیم کا ذکر نعمت ہائے خداوندی کے ذکرو بیان کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ وہاں حضرت ابراہیم کو پیکر صبر و رضا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ بارگاہ باری میں عجز و نیاز کی مجسم تصویر بنے رہتے۔ اور صبح و شام ذکر خداوندی میں محو و منہمک رہا کرتے تھے۔ اس تصویر نے گردوپیش کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس لیے ہر آیت پر ابراہیمی صفات کی چھاپ نمایاں ہے۔

[1] تفسیر کبیر للرازی ج ۵ ص ۲۰۳

آغاز سورت میں حضرت موسیٰ اور پھر قوم نوح اور عاد و ثمود کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر یہ بڑے بڑے نام واقعاتِ متعلقہ کے ذکر و بیان کے باوصف سورت کے مرکزی موضوع کو تبدیل نہیں کر سکے چنانچہ اس سورت میں بیان کردہ واقعات مثلاً حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی جانب لانے اور فرعون[۱] کی گرفت سے نجات دلانے کا مقصدِ وحید وحدت رسالت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر ادھر سے گھوم پھر کر سیاقِ عبارت جلد ہی حقیقت رسالت اور وحدانیت کی اس دعوت کی جانب مڑ گیا ہے۔ جو قوم نوح اور عاد و ثمود کو دی گئی تھی۔

حضرات رُسل و انبیاء مختلف ازمنہ و امکنہ میں ایسے ملتے جلتے اصول و ضوابط کو لے کر تشریف فرما ہوئے جو اصحاب عقل و خرد پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ جب لوگ کائنات میں موجود خدا کے نشانات سے دانستہ اندھے ہو جاتے تو خدا کے برگزیدہ رسول ان کو شکوک و شبہات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہر رسول اپنی قوم کے سامنے اپنی بشریت کا اقرار کرتا اور اس سے منکر نہیں ہوتا۔ انبیاء برملا فرمایا کرتے تھے۔

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ	ہم تو صرف تمہاری طرح کے انسان ہیں البتہ
اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ	اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا
عِبَادِهٖ[۲]	ہے احسان کرتا ہے۔

---

[۱] ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ..

اور ہم نے اپنے نشانات دے کر موسیٰ کو بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیے اور ان کو تاریخی واقعات سے نصیحت کیجئے (تاریخ طبری ج ۱۳ ص ۱۲۲)

[۲] زمخشری آیت اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

انبیاء کا مقصد یہ ہے کہ وہ صرف بشر اور انسان ہونے میں ان کی مانند ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر امور میں وہ ان کی مثل نہیں۔ انبیاء نے انکسار کے طور پر اپنی عظمت و فضیلت (باقی برصفحہ آئندہ)

جملہ انبیاء صابر و شاکر جور و ستم کو برداشت کرنے والے اور متوکل علی اللہ تھے۔ وہ ابراہیمی صفات کے حامل اور ان کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس طرح ابراہیمی ایمان و ایقان کے زیر سایہ وحدتِ رسالت اور خدا کی وحدانیت کا پودا پلا بڑھا اور جوان ہوا۔

پھر سورۂ ابراہیم کے صفحات پر اس طویل و عریض کائنات کی تصویر نمودار ہوتی ہے۔ بادلوں سے مینہ برس رہا ہے۔ زمین سے پھل اگتے ہیں۔ کشتیاں دریاؤں میں تیر رہی ہیں۔ پانی کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ آفتاب عالمتاب اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے۔ چاند اپنی ضیا پاشی سے عالم افق کو بقعہ نور بنا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم حضرت ابراہیم کو آیات الٰہی میں غور و فکر کرتے اور اظہار عجز و نیاز کرتے دیکھتے ہیں۔ گویا جب کوئی انسان خدا کی حمد کا ترانہ گاتا ہے تو وہ جناب ابراہیم کی حمد و ثناہی کی صدائے بازگشت ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس حسین و جمیل کائنات کے مشاہد و مناظر قلب ابراہیم پر ثبت ہو گئے تھے۔

خلاصۂ کلام! اللہ تعالیٰ اس سورت میں جناب خلیل پر اپنی رحمت کے سایہ کو دراز کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تصویر اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ آپ عاجزانہ بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہیں۔ آپ کی دعا آسمان کے پردوں کو چیر کر بارگاہ اقدس میں پہنچ رہی ہے۔ آپ حرم مکہ کے لیے امن و سلامتی کی دعا کرتے اور اس کی رحمت سے اس بات کے امیدوار ہیں کہ ان کو اور ان کی اولاد کو بت پرستی سے محفوظ رکھا جائے گا۔ جو ان کی پیروی کرے گا خدا کی خوشنودی حاصل کرے گا۔ دین سے برگشتہ ہونے والوں کے لیے بھی ذلت و رسوائی کی دعا نہیں کرتے حضرت ابراہیم اس امر پر حمد و ثنا کے ترانے گاتے ہیں کہ انہیں پیرانہ سالی کے عالم میں اسماعیلؑ و اسحاقؑ عطا ہوئے۔ آخر کار بڑی عاجزی سے دعا مانگتے ہیں کہ اللہ روز قیامت ان

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا اظہار نہیں کیا صرف یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے یہ احسان کرتا ہے یہ بات معلوم ہے کہ یہ منصب اسی کو سونپا جاتا ہے جو اس کا اہل ہو چنانچہ ان کو بھی یہ مرتبہ ان کی خصوصیت کی بنا پر دیا گیا ہے یہ اوصاف ان کے ابنائے جنس میں نہیں پائے جاتے" کشاف ج ۲ ص ۲۹۷)

کہ ان کے والدین کی اور سب مومنوں کی مغفرت فرمائے لہ

سورۂ ابراہیم میں مذکورہ صدر تصویر کے علاوہ ایک اور تصویر بھی ملتی ہے جو پہلی تصویر کی بالکل ضد ہے۔ وہ ایک منکر اور کافر کی تصویر ہے جو کتاب کائنات کا مطالعہ تو کرتا ہے مگر اسے تسلیم نہیں کرتا۔ کائنات کے آفاق جمیلہ کو تھکی ماندی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ آسمان و زمین خشکی وتری آفتاب و ماہتاب حجر و شجر اور لیل و نہار میں سے کوئی چیز اس کے لیے جاذب توجہ ثابت نہیں ہوتی۔ قرآن ایسے شخص پر بڑا شدید عتاب نازل کرتا ہے جو قلب و وجدان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ قرآن اس کو اس طرح مخاطب کرتا ہے۔

"جو کچھ تم نے مانگا وہ اس نے عطا کیا اور اگر تم خدا کے احسانات کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے۔ بے شک انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے" ؎

حضرت ابراہیم جن کی تعریف و توصیف میں یہ سب کچھ کہا گیا تھا۔ مکہ میں غیر معروف نہ تھے۔ سب اہل مکہ آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ اسی طرح مدینہ کے یہودی آپ کو جانتے پہچانتے اور تقدس کا درجہ دیتے تھے نصاریٰ سے آپ کے واقعات پوشیدہ نہ تھے۔ ان کے دل میں حضرت ابراہیم کا جو احترام تھا وہ باقی انبیاء کے لیے قابل رشک تھا۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ابراہیم کی شخصیت کے پردہ میں اس سورت میں عقیدۂ توحید اور رسولوں کی دعوت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس نے اس سورت کو ایسا طرز و انداز بخشا تھا جس کو مکہ کے اہل توحید بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ گویا موحد اول حضرت ابراہیم نے دینِ حنیفیت میں داخل ہونے کے راستہ کو چوپٹ کھول دیا تھا۔

اس طرح مکی دور کی یہ آخری سورت اولین مدنی سورتوں کے لیے پیش خیمہ اور تمہید کا حکم رکھتی ہے۔ ابتدائی مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم کی تعظیم اور یہودیوں کی تالیف قلب کی

لہ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۴۰

؎ کشاف ج ۲ ص ۳۰۳

گئی ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سورت نے نظریہ توحید پر ایک انوکھے اور منفرد انداز میں روشنی ڈالی[1] اور اشاعت توحید کا ایک نیا باب وا کیا ہے۔

سورہ الصافات الکہف اور ابراہیم کے تحلیل و تجزیہ سے فارغ ہو کر ہم مکی وحی کے آخری نقطہ پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ مکی سورتوں کا تیسرا اور آخری مرحلہ اپنی طویل سورتوں سمیت ختم ہوتے والی مکی وحی اور ہجرت کے بعد شروع ہونے والی مدنی وحی کے درمیان نقطہ اتصال یا مرحلہ انتقال کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنابریں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسی نقطہ اتصال سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے مفسرین بعض آیات کے بارے میں غلطی کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے بعض آیات کو مدنی تصور کیا اور ان کے بارے میں یہ کہا کہ اگرچہ یہ آیات مکی سورتوں میں شامل ہیں مگر یہ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ دراصل یہ ان کی غفلت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت وہ سب سورتیں مکی تھیں اور ان میں کی کوئی آیت مدنی نہ تھی۔ مگر مفسرین اس کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

مکی زندگی کے تیسرے مرحلہ میں اترنے والی سورتوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ لمبی ہیں۔ ان کی آیات بھی طویل ہیں۔ ان میں سے بعض سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ ان میں اہل مکہ کے بجائے لوگوں کو علی العموم مخاطب کیا گیا ہے۔ چونکہ مدنی زندگی میں مسلمانوں کو فرائض و واجبات کا مکلف و مامور بنانا مقصود تھا۔ اس لیے مکی سورتوں کے آخری دور میں اللہ و رسول کی طاعت پر زور دیا گیا ہے۔ ان سورتوں میں احسان اور عمل صالح کی تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ مسلمان جنت سے بہرہ ور ہوں اور دوزخ سے بچ سکیں۔ ذات الٰہی اور اس کی صفات نیز ملائکہ جن انبیاء و اولیاء اور معجزات و کرامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بلا شبہ ہدایت و ضلالت خدا کے اختیار میں ہے۔ تاہم انسان اختیار و آزادی سے بھی بہرہ ور ہے۔ ان سورتوں میں انبیاء کے واقعات علی العموم

---

[1] تفسیر بیضاوی ص ۵۸۸ نیز تفسیر آلوسی ج ۳ ص ۱۹۵

اور اولوالعزم انبیاء کے حالات بالخصوص بیان کیے گئے ہیں۔ عقیدۂ توحید کو ایک منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں طوالت کے اسباب :

یہ درست ہے کہ ہم نے مکی سورتوں کے مراحل سہ گانہ کے بیان میں خاصی طوالت سے کام لیا ہے۔ اس طوالت سے ہمارا مقصود واضح ہے۔ دراصل ہم نزولِ قرآن کے ادوار و مراحل کی چھان بین کے درپے ہیں تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ پہلے کون سی سورتیں اتریں اور بعد میں کون سی نیز ایسے واضح خصائص کی نشان دہی مقصود تھی جن کی بنا پر سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں سہولت رہے۔ ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ مکی سورتوں کے مراحل و ادوار معلوم کرنے میں خاصی دِقّت کا سامنا ہوتا ہے خصوصاً آغاز وحی کے زمانہ میں۔ البتہ مدنی دور کی سورتوں میں یہ مشکل پیش نہیں آتی۔ ہم نے اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ مدنی دور میں اسلام پھیل گیا تھا۔ تحریر و کتابت کے وسائل و ذرائع عام ہو گئے تھے۔ اس لیے مدنی سورتوں کا زمانہ نزول معلوم کرنا چنداں دشوار نہیں ہے۔

مدنی سورتیں :

اگر ہم ان معدودے چند سورتوں کو نظر انداز کر دیں جن کے مدنی ہونے میں اختلاف رونما ہوا ہے۔ یا ان کے متقدم اور متأخر ہونے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔ تو ہم باتحقیق مفسرین کے ساتھ مندرجہ ذیل امور میں متفق ہیں۔

۱۔ مدنی سورتوں کے پہلے مرحلہ کا آغاز سورہ بقرہ کے ساتھ ہوا۔ پھر الانفال پھر آل عمران پھر الاحزاب پھر الممتحنہ پھر النساء اور پھر الحدید نازل ہوئیں۔

۲۔ دوسرا اور درمیانی مرحلہ سورۂ محمد کے ساتھ شروع ہوا۔ پھر الطلاق پھر الحشر پھر النور پھر المنافقون پھر المجادلہ اور پھر الحجرات نازل ہوئیں۔

۳۔ تیسرا اور آخری مرحلہ سورہ التحریم سے شروع ہوا۔ پھر الجمعہ پھر المائدہ پھر التوبہ

اور پھر النصر نازل ہوئیں۔

غالباً قاری یہ سمجھتا ہوگا کہ جس طرح ہم نے مکی سورتوں کے مراحلِ ثلاثہ میں سے چند سورتیں چن کر ان پر تبصرہ کیا تھا۔ اسی طرح ہم مدنی سورتوں کے پہلے مرحلہ میں سے سورۂ بقرہ دوسرے میں سے سورہ النور اور تیسرے میں سے سورہ المائدہ چن کر ان پر تبصرہ کریں گے۔ مگر جس شخص نے بھی ہماری سابقہ طویل فصل کا مطالعہ کیا ہے ہم اس سے عرض گزار ہیں۔ کہ اگر ہم نمونہ کی ان تین سورتوں کے نمایاں خدوخال کے پیش کرنے پہ بھی اکتفاء کریں تو ہمیں کافی طوالت سے کام لینا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں علمائے اصول اور فقہاء کے خیالات بھی جا بجا پیش کرنے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں قرآن کے ادبی پہلو کو ——— جو ہمارا مقصد تالیف ہے ——— نظرانداز کرنا پڑے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مدنی سورتوں میں عبادات و معاملات سے متعلق شرعی احکام نیز حلال و حرام احوال شخصی بین الاقوامی قوانین سیاسی و معاشی مسائل احوال صلح و جنگ اور لڑائیوں کے واقعات جگہ جگہ کثرت سے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ احکام و مسائل مدنی سورتوں میں کئی طرح سے وارد ہوئے ہیں۔ کبھی پہلے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے۔ اور کبھی مجمل حکم کی تفصیل اور مطلق کی تقیید کے لیے۔ اور بعض اوقات عام کی تخصیص کے سلسلہ میں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ ان احکام و مسائل کی جزئیات بیان کرنے کے بجائے ہم اس ضمن میں صرف اشارہ سے کام لیں گے۔

اگرچہ ہم نے مدنی سورتوں کے مراحل سہ گانہ کی ترتیب سے چشم پوشی اختیار کی ہے البتہ ہم ان چند امہات المسائل کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو پہلے مرحلہ کی مدنی سورتوں میں سے ایک ——— سورۂ الانفال بالقول[1] ابن عباسؓ سورۃ بدر الکبریٰ ———

[1] تفسیر کبیر رازی ج ۴ ص ۲۰۳

میں وارد ہوئے ہیں۔

ان مسائل کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ سورت کا آغاز مال غنیمت کے ذکر و بیان سے ہوا ہے حرب و پیکار کا معرکہ ختم ہوتا ہے۔ خدا کی نصرت مسلمانوں کے شامل حال ہوتی ہے۔ مسلمان مال غنیمت کی تقسیم میں جھگڑنے لگتے ہیں۔

۲۔ اس کے بعد ان اہل ایمان کی منظر کشی کی ہے جو با دل نخواستہ شریک جہاد ہوئے ہیں۔ گویا ان کو موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

۳۔ مومن اپنے رب کے حضور میں امداد کی درخواست کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں سے ان کی امداد کرتے ہیں۔ پھر ان پر نیند طاری کی جاتی ہے اس سے بھی ان کو فائدہ پہنچتا ہے۔

۴۔ مومن پانی سے ازالہ نجاست کرنے اور پاکیزگی حاصل کرتے ہیں۔

۵۔ پھر میدان جنگ سے بھاگنے والوں کے بارے میں فوجی احکام بیان کیے جاتے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر اپنے احسان کا اظہار کرتے اور فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس لیے کہ تائید و نصرت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔

۷۔ حرب و قتال کے بعد مسلمانوں کو دینی اور اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے۔

۸۔ نظر بریں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ خدا اور رسول کی اطاعت کریں اور ان عام فتنوں سے بچیں۔ جن میں نیک و بد سب مخلوط ہو جاتے ہیں۔

۹۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اللہ اور رسول کی خیانت نیز باہم بد عہدی اور خیانت کاری سے احتراز کریں۔

۱۰۔ ان تعلیمات کے ضمن میں کفار کے کفر و عناد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۱۔ ایسے اصول بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق کفار کی قوت و شوکت کے اضمحلال اور ان کے مال کو ان کے لیے باعث حسرت بنانے کے ساتھ ہے۔

۱۲۔ کفار کو جہاد و ذلت کی دھمکی دی گئی ہے

۱۳۔ مال غنیمت کی تقسیم کے طریقے اور اس کے مصارف بیان کیے۔

۱۴۔ جنگ بدر کی تفصیل بیان کی جب اہل ایمان ایک کنارہ پر تھے اور کفار دوسرے کنارے پر۔ اور تجارتی قافلہ ان کے جانب زیریں تھا۔

۱۵۔ پھر اہل ایمان کو اظہار فخر اور نمائش سے روکا اور کفار کی طبعی موت کا ذکر کیا۔

۱۶۔ قیام امن کے لیے اسلحہ فراہم کرنے کی ہدایت کی۔

۱۷۔ جب دشمن مائل بصلح ہو تو صلح کو ترجیح دی جائے۔

۱۸۔ اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دلائی۔

۱۹۔ جب مسلمان کمزور ہو تو دو کافروں کا حریف ہے۔ اور جب طاقتور ہو تو دس کفار کا۔

۲۰۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو فدیہ لینے اور مادی سامان کو ترجیح دینے کی بنا پر معتوب کیا گیا۔

۲۱۔ آخر میں ولایت کی چار قسمیں بیان کیں اور جو حقوق و واجبات ان پر مترتب ہوتے ہیں ان کا ذکر کیا[1]

۲۲۔ مندرجہ صدر احکام قانونی احکام کی طرح خشک زبان میں بیان نہیں کیے گئے بلکہ ادیبانہ انداز میں ان کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

---

[1] تفسیر طبری جلد ۹ ص ۴۰ نیز تفسیر النسفی ج ۲ ص ۱۷ و تفسیر بیضاوی ص ۲۵۷

خلاصہ یہ کہ مضامین ومطالب کی بوقلمونی وگوناگونی کے باعث قرآنی اسلوب واندازِ بھی تغیر پذیر رہا۔ اس لیے قرآنی اندازِ بیان کو دو ایسے اسلوب قرار نہیں دیا جاسکتا جو باہم متعارض ہوں اور جن کے درمیان ربط وتعلق کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ بخلاف ازیں تعبیر وبیان کا ایک ہی طریقہ ہے۔ جو کبھی شدت اختیار کرتا اور کبھی نرم ہو جاتا ہے۔ گاہے مفصل ہوتا ہے اور گاہے مجمل۔ یہ تبدیلی مخاطبین کے حسب حال ہوتی ہے۔ اعجاز قرآن کے اسرار میں سے یہ ایک عظیم سِرّ ہے۔ جو قرآن کریم کا خصوصی امتیاز ہے۔

فصل چہارم

سورتوں کے آغاز کا سرسری جائزہ

کئی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ بعض سورتوں کا آغاز حروف تہجی سے کیا گیا ہے۔ سورتوں کے نقطۂ آغاز (فواتح السور) کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے ان کی حکمت و مصلحت ذکر کرنے کے لیے ایک مستقل فصل باندھی ہے۔

سورتوں کے یہ فواتح کئی قسموں میں منقسم ہیں۔

بسیط:

ان کی ایک قسم بسیط کہلاتی ہے جو صرف ایک حرف پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایسے حروف تین سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔

(۱) سورۂ ص نمبر ۳۸۔ یہ حرف ص کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

(۲) سورۂ ق نمبر ۵۰۔ اس کے شروع میں "ق" ہے۔

(۳) سورۂ القلم نمبر ۶۸۔ یہ "ن" کے حرف سے شروع ہوتی ہے۔

مرکب از دو حرف:

دس[۱۰] سورتیں ایسی ہیں جن کے شروع میں دو حرف آئے ہیں۔

۱۔۷ = سات سورتوں کے شروع میں "حٰمٓ" کے الفاظ ہیں۔ یہ سورتیں سورت نمبر چالیس[۴۰] سے تا چھیالیس[۴۶] ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

غافر[۴۰] فصلت[۴۱]۔ الشوریٰ[۴۲]۔ الزخرف[۴۳]۔ الدخان[۴۵]۔ الجاثیہ[۴۵]۔ الاحقاف[۴۶]۔

ان میں سے سورت نمبر بیالیس[۴۲] جس کے شروع میں "عسق" ہے وہ بھی ان سات

سورتوں کے ساتھ متعلق ہے۔ (اگرچہ اس میں تین حروف ہیں)۔

۸۔ سورۂ طٰہٰ نمبر ۲۰۔

۹۔ سورۂ طٰسٓ نمبر ۲۷۔

۱۰۔ سورۂ یٰسٓ نمبر ۳۸۔

مرکب از سہ حرف:

جو فواتح تین حروف سے مرکب ہیں وہ تیرہ[۱۳] سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) الٓمٓ = یہ چھ سورتوں کے پہلے آیا ہے:۔
البقرہ[۱]۔ آل عمران[۲]۔ العنکبوت[۳]۔ الروم[۴]۔ لقمان[۵]۔ السجدہ[۶]۔

(۲) الٓرٰ = یہ پانچ سورتوں کے شروع میں آیا ہے:۔
یونس[۱]۔ ہود[۲]۔ یوسف[۳]۔ ابراہیم[۴]۔ الحجر[۵]۔

(۳) طٰسٓمٓ = یہ دو سورتوں کے پہلے آیا ہے:۔
سورۂ الشعراء[۱] نمبر ۲۶۔ سورۂ القصص[۲] نمبر ۲۸۔

مرکب از چہار حرف:

قرآن کریم کی دو سورتیں چار حرفوں سے شروع ہوتی ہیں:۔

(۱) سورۃ الاعراف = اس کے شروع میں الٓمٓصٓ ہے۔

(۲) سورۃ الرعد = اس کے شروع میں الٓمٓرٰ ہے۔

مرکب از پنج حرف:

سورۂ مریم کا آغاز پانچ حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ وہ کٓھٰیٰعٓصٓ ہیں۔
اس مفصّل بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ جو حروف مقطعات قرآن کے شروع میں آئے ہیں وہ انتیس[۲۹] ہیں۔ ان کی تیرہ[۱۳] مختلف شکلیں ہیں۔

زیادہ تر سورتوں کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں۔ کثرتِ ورود کے اعتبار سے ان کی ترتیب حسبِ ذیل ہے۔

الالف[1] ۔ اللام[2] ۔ المیم[3] ۔ الحاء[4] ۔ الراء[5] ۔ السین[6] ۔ الطاء[7] ۔ الصاد[8] ۔ الھاء[9] ۔ الیاء[10] ۔ العین[11] ۔ القاف[12] ۔ الکاف[13] ۔ النون[14] ۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ جو حروف سورتوں کے شروع میں آئے ہیں تکرار کو حذف کر کے ان کی تعداد چودہ[14] ہے۔ گویا ان کی تعداد حروفِ تہجی سے نصف ہے۔ اس سے مفسرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ حروفِ مقطعات سورتوں کے شروع میں اس لیے لائے گئے ہیں تاکہ اس بات پر دلالت کریں کہ قرآن کریم انہی حروفِ تہجی سے مرکب ہے جو عام طور سے معروف ہیں۔ یہ حروفِ مقطعات سورتوں کے شروع میں الگ الگ بھی ہیں۔ اور مرکب صورت میں بھی لائے گئے ہیں۔ تاکہ عربوں کو معلوم ہو کہ قرآن ان ہی حروف میں نازل ہوا ہے۔ جن سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی نظیر لانے سے عاجز ہیں[1]۔

مفسرین میں سے زمخشری اور اس کی پیروی میں بیضاوی[2] نے تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔ شیخ الاسلام[3] ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ المزی[4] نے بھی اس کی تائید کی ہے اصحابِ رائے اس نظریہ کی پرزور تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو جو

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۱۔ ص ۱۶۔

[2] امام مفسر ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفیٰ ۶۸۵ھ ان کا ذکر تفسیر کی بحث میں آئے گا

[3] امام مجدد شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ الحرانی الدمشقی جو بڑے کثیر التصانیف تھے ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔ فرانسیسی مستشرق ہنری لاؤست نے امام ابن تیمیہ اور ان کے عقائد و افکار پر ایک مفید کتاب تحریر کی ہے جو ۱۹۳۹ء میں قاہرہ سے طبع ہوئی۔

[4] یوسف بن عبدالرحمٰن ابو الحجاج المشہور بالمزی (بکسر المیم وتشدید الزای المکسورۃ) المزی کی نسبت المزہ کی جانب ہے جو دمشق کے نواح میں ایک بستی کا نام ہے۔ ۷۴۲ھ میں دمشق کے دار الحدیث الاشرفیہ میں فوت ہوئے (الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۲۶) ابن تیمیہ اور المزی نے اس ضمن میں جس رائے کا اظہار کیا ہے اس کے لیے دیکھیے تفسیر ابن کثیر، ج ۱۔ ص ۳۸۔

قرآن کی نظیر لانے کے بارے میں جو چیلنج کیا تھا اس کی قوت دو بالا ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے صرف اس بات پر اکتفاء نہیں کیا کہ سورتوں کے شروع میں جو حروف لائے گئے ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد حروف تہجی کے برابر ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ سورتوں کے فواتح نصف حروف تہجی سے مرکب ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سورتوں کے فواتح حروف کی ہر جنس میں سے نصف حروف پر مشتمل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر جنس میں سے نصف حروف سورتوں کے فواتح میں لے لیے گئے ہیں تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حروفِ حلق[۱] میں سے۔ حاء۔ عین۔ اور ہاء۔

(۲) حروفِ مہموسہ[۲] میں سے سین۔ حاء۔ کاف۔ صاد۔ ہاء۔

(۳) حروفِ مجہورہ میں سے ہمزہ۔ میم۔ لام۔ عین۔ راء۔ طاء۔ قاف۔ یاء۔ نون۔

(۴) حروفِ شفویہ صرف دو ہیں۔ ان میں سے "میم" ان فواتح میں شامل ہے۔

(۵) حروفِ قلقلہ میں سے قاف اور طاء۔ .... آخر تک۔

(مصنفِ کتاب نے باقی تفصیلات حذف کر دی ہیں)

مذکورہ بالا حروف بعض جگہ مفرد بعض جگہ دو دو، بعض جگہ تین تین بعض جگہ چار اور بعض مقامات پر پانچ ذکر کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ عربی زبان انہی حروف سے ترکیب پاتی ہے اور پانچ سے زائد کوئی حرف نہیں ہوتا۔

ہم آج کل عقلیت پسند بیسویں صدی میں رہ رہے ہیں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ سورتوں کے فواتح میں ایسے حروف کا اجتماع صرفِ حسنِ اتفاق کی کرشمہ سازی ہے۔ آئمہ سلف کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ قرآن میں یہ ابتدائی حروف ازل سے اسی طرح مرتب و منظم ہیں تاکہ سورتوں کے

---

[۱] حروفِ حلق چھ ہیں یعنی ہمزہ۔ ہاء۔ عین۔ حاء۔ خاء۔ غین۔

[۲] حروفِ مہموسہ دس ہیں۔ ان کا مجموعہ "فحثہ شخص سکت" ہے۔ باقی مجہورہ ہیں۔

[۳] زمخشری نے اس کو تفصیلاً بیان کیا ہے، دیکھئے کشاف ج ۱ ص ، انیز البرھان، ج ۱ ص ۱۶۵

فواتح ان تمام حروف پر مشتمل ہوں جن کی نظیر لانے سے انسان ایک دوسرے کے تعاون کے باوجود بھی عاجز و قاصر ہے۔

حروفِ مقطعات کے ازلی ہونے کے عقیدہ نے ان کو تورّع و تقدس کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس لیے ان کی تفسیر و تاویل اور ان کے بارے میں صریح رائے کا اظہار خطرہ سے خالی نہیں۔ یہ ان متشابہات کے قبیل سے ہیں جن کی تاویل خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

امام شعبی فرماتے ہیں :-

"یہ قرآن کے اسرار ہیں"[1]

حضرت علی بن ابی طالب فرماتے ہیں :-

"ہر کتاب میں ایک بات منتخب ہوتی ہے اور قرآن کی چیدہ و برگزیدہ چیز حروف تہجی ہیں"

حضرت صدیق اکبرؓ کا قول ہے :-

"ہر کتاب میں ایک راز ہوتا ہے اور قرآن کا راز حروفِ مقطعات ہیں"

اہل اثر نے خلفائے راشدین اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"حروف مقطعات کا علم ایک پوشیدہ راز ہے جس کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا"[2]

جن علماء نے حروفِ مقطعات کا معنی و مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں کسی قطعی و حتمی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنے زاویۂ نظر کو بیان کر کے اس کی حقیقی تاویل کو خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ ازلی ہونے کی وجہ سے یہ حروف ہمیشہ ایک راز بنے رہے اور ان کی مختلف النوع باطنی تفسیریں کی جاتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر ہمیشہ غموض و خفاء کا پردہ پڑا رہا۔ جس کی نہ ضرورت تھی نہ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ ان حروف کی تفسیر و تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس میں سے سب سے زیادہ غموض ان لوگوں کے قول میں پایا جاتا ہے۔ جو

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۳۔

[2] تفسیر المنار، ج ۸۔ ص ۳۰۲

ان حروف کو "جُمّل" کے حساب سے شمار کرتے ہیں۔ وہ ان حروف کے اعداد نکال کر اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ امت اسلامیہ اتنا عرصہ زندہ رہے گی۔ یا یہ کہ فلاں شخص یا قوم کس حد تک عزو وقار کی حامل ہو گی۔

امام سُہیلی فرماتے ہیں:

"جو حروف سورتوں کے شروع میں آئے ہیں غالباً ان میں سے مکررات کو حذف کر کے امتِ اسلامیہ کی مدتِ بقاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے"

علامہ الخُوَیی[1] فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے آیت "الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ" سے استنباط کیا تھا کہ مسلمان ۵۸۳ھ میں بیت المقدس کو فتح کریں گے۔ ان کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی[2]

علامہ العزبن عبدالسلام نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کا واقعہ حٰمٓ عٓسٓقٓ سے نکالا تھا۔[3]

بعض شیعہ کا قول ہے کہ اگر سورتوں کے شروع میں وارد شدہ تمام حروف کو جمع کیا جائے اور مکررات کو حذف کر دیا جائے تو اس کے مجموعہ سے یہ عبارت بنتی ہے:

"صِرَاطُ عَلِیٍّ حَقٌّ نُمْسِكُهٗ" حضرت علی حق کی راہ پر ہیں اور ہم اسی راہ پر گامزن ہیں۔

شیعہ کے استدلال کا توڑ مہیا کرنے کے لیے بعض ظریف الطبع اہل سنت انہی حروف سے بحذف مکررات یہ عبارت بناتے ہیں:[4]

"صَحَّ طَرِيْقُكَ مَعَ السُّنَّةِ" سنت کی راہ پر چلیے۔

---

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۱۹۔ الخُوَیی بضم الخاء وفتح الواو وتشدید الیاء۔ یہ بڑے مشہور فقیہ اور مناظر تھے۔ ان کا نام احمد بن خلیل بن سعادہ ہے۔ یہ امام فخر الدین رازی کے شاگرد ہیں ۶۳۷ھ میں وفات پائی (شذرات الذہب، ج ۵، ص ۱۸۳)۔

[2] الاتقان، ج ۲، ص ۱۶۔ [3] الاتقان، ج ۲، ص ۱۶۔

[4] تفسیر روح المعانی، ج ۱، ص ۱۰۴۔

حساب ابجد کا بطلان:

اس حسابی طریقہ کو "طریق ابی جاد" (جس کو عام طور سے طریق ابجد) کہا جاتا ہے علماء نے بڑی سختی کے ساتھ اس سے رد کیا ہے۔ حافظ ابن حجر[1] عسقلانی نے اس کو باطل اور ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ابجد کے حساب پر اعتماد کرنے سے منع کرتے اور اس کو سحر قرار دیا کرتے تھے۔ یہ بات کچھ بعید بھی نہیں اس لیے کہ شریعت میں طریق ابجد کی کوئی اصل و اساس موجود نہیں ہے[2]

حروف مقطّعات کے بارے میں صوفیہ کے افکار و آراء:

صوفیہ نے حروف مقطعات کے بارے میں بڑے اچھوتے اور انوکھے افکار و آراء کا اظہار کیا ہے۔ اس ضمن میں شیخ محی الدین بن عربی نے الفتوحات المکیہ میں جو کچھ کہا ہے وہ باقی اقوال کی نسبت زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے۔ ابن عربی کے ارشادات کا خلاصہ حسب[3] ذیل ہے:

ابن عربی کا زاویۂ نگاہ:

ابن عربی فرماتے ہیں:-

"اس حقیقت کو جان لینا چاہیے کہ حروفِ مقطعات کی نسبت سے اصحاب عقل و خرد ہی بہرہ ور ہیں۔ جن سورتوں کے پہلے ایسے حروف وارد ہوئے ہیں ان کی تعداد

---

[1] حافظ احمد بن علی بن محمد بن علی شہاب الدین ابو الفضل ابن حجر عسقلانی کے نام سے مشہور تھے آپ عظیم حافظ حدیث اور امام تھے۔

[2] الاتقان، ج ۲-ص ۱۶-

[3] دیکھیے تفسیر روح المعانی، ج ۱-ص ۱۰۱- ابن عربی کا نام و نسب محمد بن علی بن محمد حاتمی طائی اندلسی ہے۔ ان کی کنیت ابو بکر اور لقب الشیخ الاکبر ہے۔ آپ چار صد کتب کے مصنف ہیں۔ آپ کی مشہور ترین تصنیف "الفتوحات المکیہ" ہے۔ ۶۳۸ھ میں وفات پائی (فوات الوفیات، ج ۲-ص ۲۴۱-)

انتیس[29] ہے۔ یہ کمالِ صورت ہے جس کی طرف

میں اشارہ کیا گیا ہے۔ انتیسواں وہ قطب ہے جس پر آسمان قائم ہے۔ اور وہ

اس کی علت وجود ہے۔ قرآن میں یہ قطب سورۂ آل عمران کی آیت الم اللہ ہے

اگر یہ قطب نہ ہوتا تو باقی اٹھائیس[28] سورتیں قائم نہ رہ سکتیں۔

حروفِ مقطعات مکررات سمیت اٹھتر[78] ہیں۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر فرمایا ہے کہ:

الایمان بضعٌ وسبعون ۔ ایمان کی ستر سے زائد شاخیں ہیں۔

اس میں بِضعٌ سے آٹھ ہی مراد ہیں۔

ایمان کی شاخوں کی طرح حروفِ مقطعات کی تعداد بھی اٹھتر[78] ہے۔ اس لیے جب تک کوئی

شخص حروفِ مقطعات کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو وہ اسرارِ ایمان کا ذوق آشنا نہیں ہو سکتا۔[1]

سورتوں کے فواتح اسماء اللہ ہیں:

صوفیہ کے یہ مزعومات ان کے آراء و افکار کے آئینہ دار ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے اپنے ذوق

و وجدان کے تابع ہیں۔ ان میں جو رازداری پائی جاتی ہے یہ ان کے اسرار و مصطلحات سے ماخوذ

ہے۔ اس لیے صوفیہ کے خیالات حروفِ مقطعات کے بارے میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی

نہیں کرتے۔

بعض لوگ جو نہ صوفیہ کے ہمنوا ہیں اور نہ ابجد کے طریقہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ ان فواتح میں کا ہر حرف اسماء الٰہی سے ماخوذ ہے یا یہ جن سورتوں کے شروع میں وارد

ہوئے ہیں ان کی غرض و غایت کو واضح کرتے ہیں۔

مثلاً حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کھیعص میں کاف کریم سے ھا ھادی سے

یا حکیم سے عین علیم سے اور صاد صادق سے ماخوذ ہے۔[2]

---

[1] تفسیر روح المعانی۔ ج ا۔ ص ۱۰۲۔

[2] الاتقان ج ۲۔ ص ۱۲۔

اسی طرح "الر" کا مطلب "أنا الله أرى" (میں اللہ ہوں سب کچھ دیکھ رہا ہوں) ہے۔

المص کے معنی ہیں "أنا الله أفصل" (میں اللہ ہوں اور میں کھول کر بیان کرتا ہوں)

طسم سے بعض علماء نے طور سیناء اور موسیٰ مراد لیے ہیں۔ کیونکہ جن دو سورتوں کے شروع میں "طسم" آیا ہے ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے جو طور سیناء پر پیش آیا۔

یہ آراء مبنی بر ظن وتخمین ہیں:

یہ بات کسی شخص پر پوشیدہ نہیں کہ مذکورہ صدر افکار ونظریات دلائل سے عاری اور محض قیاس آرائی اور ڈھکوسلا بازی کی کرشمہ سازی ہیں۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ سابق الذکر اقوال میں سے ہر ایک کے بارے میں متنوع ومتضاد خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۱) مثلاً حضرت ابن عباسؓ سے کھیعص کے بارے میں منقول ہے کہ اس سے "کاف، ہاد، امین، عالم اور صادق" مراد ہے۔

(۲) ابن عباسؓ کا دوسرا قول یہ ہے کہ کاف ملک سے، ہا اللہ سے، یاء و عین عزیز سے اور صاد مصور سے ماخوذ ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ کبیر، ہاد، امین، عزیز اور صادق[۳] کی جانب اشارہ ہے۔

دیگر علماء سے اسی لفظ "کھیعص" کے بارے میں موافق ومخالف ہر طرح کے اقوال منقول ہیں۔

کرمانی[۴] اپنی کتاب "عجائب" میں لکھتے ہیں کہ ضحاک کی رائے میں "الر" کے معنی ہیں:-

أنا الله أعلم وأرفع — میں اللہ ہوں۔ میں بہت علم رکھتا ہوں اور بہت بلند

---

۱ البرہان، ج ۱۔ ص ۱۷۴۔ ۲ تفسیر طبری، ج ۳ ص ۱۷۷

۳ الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۳۔

۴ ابو القاسم برہان الدین محمود بن حمزہ بن نصر کرمانی شافعی کا لقب تاج القراء۔ آپ نے ۵۰۰ھ کے بعد وفات پائی۔

۵ الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۳۔

حضرت ابن عباسؓ "المر" کے ساتھ حم اور ن کو ملا دینے اس طرح ان کے نزدیک الرحمٰن کے الفاظ متفرق طور پر کئی سورتوں کے شروع میں آ گئے ہیں[1]

اسی طرح "المص" کے معنی و مفہوم کے بارے میں کئی روایات منقول ہیں۔

(۱) اس کے معنی ہیں انا اللہ الصادق (میں سچا خدا ہوں)

(۲) اس سے المصور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو خدا کا نام ہے۔

(۳) تین مختلف اسماء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ الف اللہ سے میم الرحمٰن سے اور صاد الصمد[2] سے ماخوذ ہے۔

اس ضمن میں سب سے نرالی اور انوکھی بات مشہور مستشرق اسپرنگر نے کہی ہے کہ طسم سے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ دونوں کے نمایاں حروف یکساں ہیں "المطہرون" میں نمایاں حرف طاء ہے اور "یمسہ" میں نمایاں حروف سین اور میم ہیں۔ اور یہ تینوں حروف طسم میں موجود ہیں۔ مستشرق بلاشیر نے اپنی کتاب "المدخل الی دراسۃ القرآن" میں لکھا ہے کہ مستشرق لوث (LOTH) نے انتہائی احتیاط کے باوجود اسپرنگر کی بے کار رائے کی پیروی کی ہے۔

حق بات یہ ہے کہ حروف مقطعات کی تاویل و تفسیر میں اس قسم کے اٹکل پچو کسی جگہ جا کر ختم نہیں ہوتے۔ یہ ایک قسم کی شخصی تاویلات ہیں۔ جن کا مرکز و محور ہر شخص کی اپنی پسند اور صواب دید ہے۔ سوال یہ ہے کہ قاف کا لفظ مثلاً قاہر سے ماخوذ ہو اور القدوس یا القدیر یا القوی کی جانب کیوں نہ مشیر ہو؟ اسی طرح عین کا لفظ علیم کی طرف اشارہ کرتا ہو اور عزیز سے کیوں نہ ماخوذ ہو؟ علی ہذا القیاس نون کا لفظ نور پر دلالت کرتا ہو اور ناصر پر کیوں نہیں؟ صاد صادق پر دلالت کرتا ہو صمد پر کیوں نہیں؟ آخر اس کی کیا دلیل ہے کہ "الر" کے حروف "الرحمٰن" کے نمایاں حروف ہیں

[1] تفسیر طبری۔ ج ۱۱۔ ص ۵۰۔ نیز الاتقان

[2] الاتقان۔ ج ۲۔ ص ۱۴۔

ھذا لرحمٰن کے نہیں اور نہ اللھمہ کے[1]؟

بعض لوگوں نے حروفِ مقطعات کو اسماءِ الٰہی سے ماخوذ قرار نہیں دیا - بلکہ یوں کہا ہے کہ یہ حروف اسمِ اعظم[2] ہیں - ان کو مختلف الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے - اس رائے کو ابن عطیہ[3] نے نقل کیا ہے -

اس کے قریب قریب ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ حروفِ قسم ہیں - اللہ تعالیٰ نے ان کیساتھ قسم کھائی ہے[4] - کیونکہ سورتوں کے یہ ابتدائی الفاظ اسماءِ خداوندی ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حروف علی وجہ العموم قرآنِ کریم کا نام ہو - یا یہ حروف ان سورتوں کے اسماء ہوں جن کے شروع میں آئے ہیں[5]۔

مستشرق نولڈیکی کی ہرزہ سرائی :

اس ضمن میں سب سے زیادہ عجیب و غریب اور بعید از حق و صواب رائے کا اظہار مشہور جرمنی مستشرق نولڈیکی (NOLDEKE) نے کیا ہے - اگرچہ بعد ازاں اس نے اس نظریہ سے رجوع کر لیا تھا - اس رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ حروفِ مقطعات قرآنِ کریم کا جزو نہیں بلکہ اس میں اضافہ کیے گئے ہیں - نولڈیکی نے مستشرق شفالی (SCHWALLY) سے مل کر تاریخ القرآن سے

---

[1] قاضی ابوبکر باقلانی اس قسم کی تاویلات بعیدہ ذکر کرکے ان پر اظہار حیرت کرتے ہیں - دیکھئے تفسیر رازی، ج ۴ - ص ۱۷۷ - مثلاً اسی قسم کی ایک حیرت انگیز تاویل یہ کی گئی ہے کہ " طٰہٰ " کے معنی ہیں " یا بدر " اس لیے کہ طاء کے ۹ عدد ہیں - ھاء کے پانچ کل چودہ[14] ہوئے اور بدر میں یہ پورے ہو جاتے ہیں -
(الاتقان، ج ۲ - ص ۱۸)

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ۱ - ص ۳۶ نیز الاتقان، ج ۲ - ص ۱۵ -

[3] الاتقان، ج ۲ - ص ۱۵۲ - ابن عطیہ کا پورا نام عبدالحق بن غالب بن عبدالرؤف ہے موصوف نے ایک تفسیر " المحرر الوجیز " نامی تحریر کی ہے اس کا ایک قلمی نسخہ قاہرہ کے دارالکتب میں زیر نمبر ۱۶۸ موجود ہے - ابن عطیہ نے لورقہ نامی شہر میں ۵۴۶ھ میں وفات پائی -

[4] الاتقان، ج ۲ - ص ۱۵ -

[5] تفسیر طبری، ج ۱ - ص ۶۷ و تفسیر ابن کثیر، ج ۱ - ص ۳۶ -

متعلق جو کتاب تحریر کی تھی اس کے پہلے ایڈیشن میں اس نظریہ کا اظہار کیا تھا۔ نولدیکی کی رائے ہے کہ سورتوں کے شروع میں جو حروفِ مقطعات ہیں وہ ان صحابہ کے ناموں کے ابتدائی یا آخری حروف ہیں جن کے پاس خاص خاص قرآنی سورتوں کے نسخے تھے۔ چنانچہ سعد بن ابی وقاص کے نام سے سین اور مُغیرہ سے میم اور عثمان بن عفان سے نون اور ابوہریرہ رضہ سے ھا، لی گئی ہے۔ علی ہٰذا القیاس [1]

غالباً نولدیکی کو خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے اس نظریہ سے رجوع کر لیا تھا شفالی نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس نظریہ کو حذف کر دیا تھا۔ مگر مستشرقین میں سے بُہل [2] (BUHL) اور ہرشفیلڈ [3] (HIRSCHFELD) نے اس کی پرزور حمایت کی اور یہ نہ خیال کیا کہ یہ نقطۂ نگاہ عقلِ سلیم سے بعید ہے۔

مستشرق بلاشیر کی رائے:

بخلاف ازیں مستشرق بلاشیر نے اس کو بعید از عقل اور ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے۔ مستشرق لوٹ (LOTH) اور بویر (BAUER) نے اس پر اظہارِ حیرت کیا ہے کہ ایسے پاکباز مومن اور متقی صحابہ اپنی طرف سے قرآن میں اضافہ کیسے کر سکتے تھے؟ اس فعل کا مرتکب تو وہ شخص ہو سکتا ہے جو ضعیف الایمان اور قلیل الیقین ہو۔ مزید براں بلاشیر لکھتا ہے:

"یہ بات کسی طرح قرین قیاس نظر نہیں آتی کہ جن صحابہ کے پاس قرآن کریم کے ذاتی نسخے تھے۔ وہ ان میں اپنے معاصر صحابہ کے ناموں کے پہلے حروف شامل کر دیتے تھے مزید براں ہمیں اس امر کی کوئی وجہ جواز دکھائی نہیں دیتی کہ حضرت علی رضہ یا

---

[1] GESCHICHTE DES QORANS, 9ERE ED, P. 215

[2] CF BLACH. INTRO. COR., P. 148

[3] HIRSCHLD. NEW RESEARCHES INTO THE COMPOSITION AND EXEGESIS OF THE QURAN.

ابی بن کعب اپنے مصاحف میں ان لوگوں کے ناموں کے پہلے حروف درج کرنے کے شائق ہوں جن کے مابین قرآن کی جمع وکتابت کے بارے میں رشک و رقابت کا جذبہ پایا جاتا تھا"[1]

خلاصۂ کلام یہ کہ بلانشیر اس ضمن میں مختلف افکار و آراء پیش کر کے ان میں تقابل کرتے ..... اور آخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صحیح ترین نقطۂ نگاہ وہی ہے جس کو مسلم علماء نے پیش کیا ہے۔ انھوں نے بے سند اور بے معنی اقوال کو دانستہ حذف کر دیا ہے۔ وہ ببانگ دہل کہتے ہیں

"پاکباز مسلمانوں نے جو قرآنی فواتح کے اسرار کو توڑنے کی ہر سعی کو مذموم قرار دیتے تھے بلاشک وشبہ یہ بات ثابت کر دی ہے کہ در حقیقت وہی عقلاء و حکماء کے مقام پر فائز ہیں"[2]

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس میدان میں مسلم علماء عقل وحکمت میں مستشرقین سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان کا انداز بحث سیدھا سادھا اور اوائل سُوَر کے بیان کرنے میں زیادہ روشن اور واضح ہے۔ ان کے نقطۂ نگاہ پر تین مختلف مراحل و ادوار گزرے اور آخر کار اس نے ایک پختہ اور مستحکم نظریہ کی صورت اختیار کر لی۔

مسلم علماء نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ بعض قرآنی سورتوں کا آغاز ان حروف کے ساتھ اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح عربی قصیدہ عموماً "لا ورَبِّی" کے الفاظ کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔ ابتداءً وہ ان حروف کو صرف فواتح سے موسوم کرتے تھے۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان حروف کو سورتوں کے شروع میں رکھ دیا ہے۔ اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ تابعین کبار میں سے مجاہد کا نقطۂ نظر یہی تھا[3]

---

[1] LE CORAN INTRODUCTION, P. 148.

[2] ID., IBID., 149

[3] الاتقان ج ۲ ص ۱۱۔

بعد ازاں اس نظریہ میں مزید وسعت پیدا ہوگئی اور بعض علماء نے ان کو تنبیہ یا وسائل تنبیہ قرار دے دیا۔ مگر ان میں تنبیہ پر مشتمل مشہور الفاظ مثلاً "اَلَا اور اَمَا" استعمال نہیں کیے گئے۔ اس لیے کہ یہ الفاظ عام طور سے لوگوں میں رائج ہیں۔ اور قرآن لوگوں کے کلام سے مشابہ نہیں ہو سکتا اس لیے قرآن کریم میں ایسے الفاظ لائے گئے جو لوگوں کے یہاں تنبیہ اور آگاہی کے لیے متعارف نہیں ہیں[1] امام الخُوَیّی[2] فرماتے ہیں کہ ان الفاظ کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کرنا مقصود ہے۔ ممکن ہے کہ آپ بعض اوقات دنیوی مشاغل میں منہمک ہوتے ہوں اور اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم دیا ہو کہ آپ کے پاس پہنچ کر الٓمٓ الٓرٰ یا حٰمٓ کے الفاظ کہیں۔ تاکہ آپ جبریل کی آواز سن کر ان کی طرف متوجہ ہوں[3]

امام سید رشید رضا صاحب تفسیر المنار اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ان الفاظ کے ذریعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب وحی کا نزول ہوتا تھا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر روحانیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اور آپ اس وقت پوری طرح متوجہ ہوتے تھے۔ احادیث صحیحہ سے یہی ثابت ہے۔ اس لیے یہ بات درست نہیں کہ ان الفاظ سے آپ کو آگاہ کرنا مقصود ہے[4]

سید رشید رضا فرماتے ہیں:

"ان آیات میں دراصل مشرکین مکہ اور پھر مدینہ کے اہل کتاب کو آگاہ کرنا مقصود تھا"

سید موصوف کو بظاہر یہ معلوم نہ تھا کہ ان سے پہلے کسی اور نے بھی یہ تاویل کی ہے۔ پھر وہ خود ہی امام رازی کی تفسیر کبیر میں سے بارھواں[12] قول ابن رَوق[5] اور قطرب[6] سے نقل کرتے ہیں۔ جب

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۷

[2] الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۷ و تفسیر المنار، ج ۸۔ ص ۳۰۲ بحوالہ شرح الاحیاء۔

[3] الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۷۔ [4] تفسیر المنار، ج ۸۔ ص ۳۰۲۔

[5] محمد بن حسن بن عبداللہ بن روق الراسبی الروقی عظیم محدث تھے۔ ۱۶۸ھ میں وفات پائی۔

[6] قطرب کا نام محمد بن مستنیر ہے۔ یہ مشہور علمائے لغت میں سے تھے اہل البصرہ کے ہمنوا تھے۔

کفار نے کہا کہ "قرآن مت سنو اور اس میں شور ڈالو ہو سکتا ہے کہ تم غالب آجاؤ" اور وہ ایک دوسرے کو قرآن سے اعراض و انحراف کی تلقین کرنے لگے۔ تو مشیت ایزدی ان کی اصلاح و فلاح کے پیش نظر اس بات کی مقتضی ہوئی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا کلام اتارا جائے جس کو وہ پہچانتے نہ ہوں۔ تاکہ وہ یہ الفاظ سن کر خاموش ہو جائیں اور قرآن سنیں۔ چنانچہ حروفِ مقطعات نازل کیے گئے۔ جب کفار یہ الفاظ سنتے تو تعجب سے کہتے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ سنیے" جب وہ توجہ سے سننے لگتے تو قرآن ان پر خوب تنقید کرتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار قرآن کو سننے اور اس سے مستفید ہونے لگے[1] امام زرکشی نے البرھان[2] میں اور سیوطی نے الاتقان[3] میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح ابن جریر[4] اور ابن کثیر[5] نے بھی اپنی اپنی تفسیر میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

سید رشید رضا کا زاویۂ نگاہ:

ہمارے خیال میں قرآنی سورتوں کو حروفِ مقطعات کے ساتھ شروع کرنے کی حکمت و مصلحت پر سب سے بہتر روشنی سید رشید رضا نے ڈالی ہے۔ ہم ذیل میں اس کا لبِ لباب پیش کرتے ہیں۔ وہ حسن بیان اور بلاغتِ تعبیر جس کا مقصد یہ ہو کہ مخاطب کو اپنی بات سمجھانے کے ساتھ ساتھ مطمئن اور متاثر بھی کیا جائے اس کا طریقہ یہ ہے کہ متکلم مخاطب کو اپنی گفتگو کے اولین غایات و مقاصد سے آگاہ کرے۔ اور اس بات کا آرزو مند اور خواہاں ہو کہ مخاطب کا علم اس کے مقصد و منشاء پر حاوی ہو جائے۔ اور اس کے رگ و پے میں رچ بس جائے

---

[1] تفسیر المنار، ج ۸ - ص ۳۰۲ -
[2] البرھان، ج ۱ - ص ۱۷۵ -
[3] الاتقان، ج ۲ - ص ۱۷ -
[4] ابن جریر طبری، ج ۱ - ص ۶۹ -
[5] تفسیر ابن کثیر، ج ۱ - ص ۳۷ -

اس کا طریقہ یہ بھی ہے کہ کلام شروع کرنے سے قبل مخاطب کو متنبہ کیا جائے۔ تاکہ مخاطب سے کوئی چیز رہ نہ جائے۔ عربی زبان میں مخاطب کو آگاہ کرنے کے لیے ھا و برائے تنبیہ اور حروفِ ابتدا استعمال کرتے ہیں۔ نظر بریں اس میں غرابت و حیرت کی کوئی بات نہیں کہ قرآن جو بلاغت اور حسنِ بیان میں اعجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہے اس پر اور اضافہ کرتا۔ قرآن جس طرح اصلاح و ہدایت میں پیشوا اور رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ بلاغت میں بھی امامت کے درجہ پر فائز ہو۔

حسنِ بیان کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ متکلم کی آواز بلند ہو اور اسی کیفیت سے متکیف ہو۔ جس کو مخاطب کی حالت چاہتی ہو۔ مثلاً تخویف و زجر کے وقت چیخنا چلاّنا۔ رحم و کرم کا مطالبہ کرتے وقت نرم آواز نکالنا۔ اظہار الم و رنج کے وقت اونچی آواز سے رونا۔ اسی طرح تشویق و ترغیب گھبراہٹ اور جدل و نزاع کے وقت موزوں و مناسب انداز اختیار کرنا چاہیے۔ کسی سے مدد طلب کرنا ہو تو اشارہ کرنا چاہیے۔ معانی و مطالب کی تصویر مناسب حرکات کے ذریعہ کھینچنی چاہیے۔ بعض کلمات اور جملوں کو خطِ جلی کے ساتھ لکھنا یا ان کے نیچے یا اوپر لکیر کھینچنا بھی اسی زمرہ میں شامل ہے۔[1]

نزولِ وحی کے وقت جو لوگ قرآن کے مخاطب تھے ان کے حالات پر بیان کردہ حکمت کا انطباق و اطلاق ہمیں اس رائے کا اور زیادہ قائل و عامل بنا دیتا ہے۔ عظیم حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر جن سورتوں کے شروع میں حروفِ مقطعات ہیں ان کو قرآن کریم یا نبوت و رسالت سے متعلق مضامین کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔[2] ظاہر ہے کہ سورۂ بقرہ اور آلِ عمران کے سوا

---

[1] تفسیر المنار، ج ۸۔ ص ۲۹۹ ۔

[2] یہ بات سورۂ مریم، عنکبوت، روم اور نون پر صادق آتی ہے۔ اگرچہ ان سورتوں کا آغاز کتابِ خداوندی کے ذکر کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ تاہم ان کے شروع میں ایسے دلائل ذکر کیے گئے ہیں جن سے وحی و نبوت کا اثبات ہوتا ہے (تفسیر المنار، ج ۸۔ ص ۲۹۶ ۔ ۲۹۸ ۔)

امام زرکشی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے البرہان، ج ۱۔ ص ۱۰۰ پر فرماتے ہیں: ۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

ایسی سب سورتیں مکی ہیں مکی سورتوں میں مشرکین کو اثباتِ رسالت و نبوت کی دعوت دی گئی ہے۔ سورہ بقرہ اور آل عمران دونوں مدنی سورتیں ہیں۔ یہ اہل کتاب کے ساتھ جدالِ احسن کی آئینہ دار ہیں[1]۔ سورتوں کے یہ ابتدائی حروف اہل کتاب اور مشرکین دونوں کو متنبہ کرتے رہے تاکہ وہ نازل شدہ قرآن کریم کو اچھی طرح سے اخذ کریں۔ اور اس ضمن میں ان سے کوتاہی سرزد نہ ہو۔ حروفِ مقطعات ہمیشہ لوگوں کو دعوتِ حیرت و استعجاب دیتے رہیں گے۔ حیرت اہتمام کی پیداوار ہے اور تنبیہ اہتمام کو جنم دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو سب سے زیادہ متنبہ کرنے والے یہ ازلی حروفِ مقطعات ہیں جو آسمان سے زمین پر نازل ہوئے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) "قرآن کریم کا عام انداز یہ ہے کہ حروفِ مقطعات کے بعد قرآن کے متعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ مثلاً "الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" (سورۃ البقرہ آیت ۱-۲) مگر سورۂ عنکبوت اور روم میں اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی گئی ہے"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ نظریہ اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ بقرہ و آل عمران بقول مشہور مدنی زندگی کے آغاز میں نازل ہوئیں۔ ان سورتوں کو حروفِ مقطعات سمیت نازل کرنے سے یہود کو دعوتِ اسلامی سے آگاہ کرنے سے متعلق حکمتِ ربانی کی تکمیل ہو گئی۔ اس لیے اگلی سورتوں کو حروفِ مقطعات کے ساتھ شروع کرنے میں کوئی حکمت مضمر نہ تھی۔ بنا بریں وہ سورتیں فواتح سے خالی ہیں۔ اس لیے ابن کثیر نے اپنی تفسیر، ج ۱ ص ۳۷-۳۸ پر جو اعتراض وارد کیا ہے اس کو تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابن کثیر نے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ سورہ بقرہ و آل عمران چونکہ مدنی ہیں۔ اس لیے ان کے مخاطب مشرکین نہیں ہو سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان سورتوں کے شروع میں حروفِ مقطعات لانے کی غرض و غایت ابدی و دائمی ہے اسی لیے یہ تنبیہ سب کے لیے ہے صرف مشرکین کے لیے نہیں ہے۔

فصل پنجم!

علمِ قرأت و قرّاء کا اجمالی تذکرہ

اَحرفِ سَبعہ سے سات قراءتیں مراد نہیں:

ہم سابقہ مباحث میں اس حقیقت سے آگاہ کر چکے ہیں کہ حدیث میں جن اَحرفِ سبعہ کا ذکر آیا ہے ان سے سات قراءتیں مراد نہیں ہیں۔ ہم نے اس کے وجوہ و اسباب بھی بیان کر دیے تھے۔ اس کے ذکر و بیان کی ضرورت اس لیے لاحق ہوئی کہ بہت سے قدیم و جدید محدثین اس وہم میں مبتلا ہیں کہ سات قراءتیں ہی حروفِ سَبعہ ہیں۔ چنانچہ ابوشامہ اپنی کتاب "المرشد الوجیز الی علوم تتعلق بالقرآن العزیز" میں رقم طراز ہیں:۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آج کل جو سات قراءتیں پائی جاتی ہیں وہی احرف سبعہ ہیں جن کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ مگر یہ اہل علم کے اجماع کے خلاف ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل بعض جہلاء ہیں[1]"

اس غلط فہمی کو ہوا دینے اور اجاگر کرنے کی ذمہ داری بڑی حد تک امام کبیر ابوبکر احمد بن موسیٰ بن عباس پر عائد ہوتی ہے جو "ابن مجاہد[2]" کے نام سے معروف تھے۔ اور جس نے بغداد میں تیسری صدی ہجری کے اختتام پر حرمین و عراقین و شام کے مشہور ثقہ اور امین قراء کی سات قراءتوں کو جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا[3]۔ یہ جمع و تالیف محض حسن اتفاق کی کرشمہ سازی تھی۔ ورنہ ان کے

[1] الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۳۸۔ نیز زرقانی شرح مؤطا امام مالک ج ۱۔ ص ۱۳۴۔
[2] ابن مجاہد بغداد میں اپنے عہد و عہد کے شیخ القراء تھے۔ ۳۲۴ھ میں فوت ہوئے۔ (طبقات القراء ج ۱۔ ص ۳۹ و تاریخ بغداد۔ ج ۵۔ ص ۱۴۴)۔
[3] البرہان۔ ج۔ ص ۳۲۰۔

علاوہ خاصی تعداد میں قراء موجود تھے جن کا علمی پایہ ان سے بھی بلند تر تھا۔[1] ابو العباس بن عمار ابن مجاہد پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سات قراءتوں کے مؤلف نے ایک غیر ضروری اور نا روا فعل انجام دیا۔ نتیجہ کے طور پر عوام سخت مشکل میں مبتلا ہو گئے۔ کم علم لوگ یہ سمجھنے لگے کہ احادیث میں جن احرفِ سبعہ کا ذکر کیا گیا ہے ان سے سات قراءتیں مراد ہیں۔ ابن مجاہد کو چاہیے تھا کہ سات سے کم راویوں کا ذکر کرتے یا زیادہ کا تاکہ کوئی شخص اس شبہ میں مبتلا نہ ہوتا۔"[2]

سات قراءتوں کی اصطلاح دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مشہور ہوئی:

جب علماء نے علم قراءت پر تصنیف و تالیف کا آغاز کیا اس وقت قراءتِ سبعہ کی اصطلاح اسلامی بلاد و امصار میں معروف نہ تھی۔ جن مصنفین کو اس ضمن میں اوّلیت و تقدم کا شرف حاصل ہے مثلاً ابو عُبید قاسم بن سلام و ابو جعفر طبری و ابو حاتم سجستانی انہوں نے اپنی تصنیفات میں ان سے کئی گنا زائد قراءتوں کا ذکر کیا تھا۔ سات قراءتوں کا چرچا لوگوں میں دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوا۔

قراءِ سبعہ:

جب کہ بعض اسلامی شہروں میں لوگ خاص خاص قاریوں کی قراءت کی طرف مائل ہوئے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مکہ میں عبداللہ بن کثیر الداری[3] متوفی ۱۲۰ھ کی قراءت مشہور تھی۔ آپ صحابہ میں سے انس

[1] البرھان، ج ۱۔ ص ۳۲۹۔

[2] الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۳۸۔ ابو العباس بن عمار سے امام قاری مفسر احمد بن عمار مہدوی مراد ہے۔ بقول محدث ذہبی ۴۳۰ھ کے بعد فوت ہوئے (النشر، ج ۱۔ ص ۹۸)

[3] ان کے ترجمہ و تعارف کے لیے دیکھیے طبقات القراء، ج ۱۔ ص ۴۴۳۔

بن مالک عبداللہ بن زبیر اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم کو مل چکے تھے۔

۲۔ مدینہ منورہ میں نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم[1] متوفی ۱۶۹ھ کی قراءت رائج تھی۔ آپ نے ستر ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا جنہوں نے براہ راست حضرت اُبی بن کعب عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے کسبِ فیض کیا تھا۔

۳۔ شام میں عبداللہ یحصبی المعروف با بن عامر[2] متوفی ۱۱۸ھ کا طریقہ رائج تھا۔ آپ نے قراءت کا فن مغیرہ بن ابی شہاب مخزومی سے سیکھا۔ انہوں نے حضرت عثمان بن عفانؓ سے استفادہ کیا۔ آپ صحابہ میں سے نعمان بن بشیر اور واثلہ بن اسقع کو مل چکے تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آپ نے براہ راست حضرت عثمانؓ سے اخذ و استفادہ کیا تھا۔

۴۔ **ابو عمرو** = بصرہ میں ابو عمرو اور یعقوب کی قراءت رائج تھی۔ ابو عمرو[3] کا نام زبان بن العلاء بن عمار متوفی ۱۵۴ھ ہے۔ آپ نے مجاہد بن جبر اور سعید بن جُبیرؒ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور اُبی بن کعبؓ سے روایت کی ہے۔

۵۔ **یعقوب** = یعقوب کا نام و نسب یعقوب بن اسحاق[4] حضرمی متوفی ۲۰۵ھ ہے۔ آپ نے سلام بن سلیمان الطویل سے استفادہ کیا۔ اور انہوں نے عاصم اور ابو عمرو سے۔

کوفہ میں حمزہ اور عاصم دونوں کی قراءت مشہور تھی:۔

۶۔ **حمزہ** = حمزہ کا نام و نسب حمزہ[5] بن حبیب زیات مولیٰ عکرمہ بن ربیع التیمی متوفی ۱۸۸ھ ہے۔ آپ نے سلیمان بن مہران اعمش سے روایت کی انہوں نے یحییٰ بن وثاب سے انہوں نے زر بن حُبیش سے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ سے کسبِ فیض کیا۔

---

[1] طبقات القراء، ج ۲۔ ص ۳۳۰۔ ۳۳۴۔

[2] طبقات القراء، ج ۱۔ ص ۴۲۳۔ ۴۲۵۔

[3] طبقات القراء، ج ۱۔ ص ۲۸۸۔ ۲۹۲۔

[4] ان کے تعارف کے لیے دیکھیے طبقات القراء ج ۲۔ ص ۳۸۶۔ ۳۸۹۔

[5] طبقات القراء، ج ۱۔ ص ۲۶۱۔ ۲۶۳۔

۷۔ عاصم = عاصم کا نام ونسب، عاصم بن ابی النجود اسدی کوفی متوفی ۱۲۸ھ ہے۔ آپ نے زر بن حبیش کے توسط سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کسب فیض کیا۔

قاری حضرات زیادہ تر فارسی الاصل اور عجمی تھے ان میں بہت کم عربی نژاد تھے چنانچہ قراء سبعہ میں سے صرف ابن عامر اور ابو عمرو عربی النسل تھے۔ باقی پانچوں عجمی الاصل تھے۔

ابن مجاہد نے قراءتِ سبعہ جمع کرتے وقت یعقوب کا نام حذف کر کے اس کی جگہ علی بن حمزہ متوفی ۱۸۹ھ المعروف بالکسائی کا نام درج کر دیا۔ ہم اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کسائی کوفی اور یعقوب بصری تھے۔ گویا ابن مجاہد نے بصرہ کے صرف ایک قاری کا نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا اور وہ ابو عمرو ہیں۔ جب کہ کوفہ کے قراء میں سے حمزہ عاصم اور کسائی تینوں کو شامل کر لیا۔

قراءاتِ عشرہ:

ابن مجاہد کے زمانہ سے یہ سات قراءتوں نے بڑی شہرت پائی۔ یہاں تک کہ بعض علماء اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ حدیث میں جن "احرفِ سبعہ" کا ذکر کیا گیا ہے ان سے سات قراءتیں ہی مراد ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ اس ضمن میں ایک ضابطہ کلیہ ہے وہ جہاں بھی پایا جائے۔ وہ قراءت مقبول ہو گی۔ اسی ضابطہ کے موجود ہونے کی بناء پر دس بلکہ چودہ قراءتوں نے شہرت پائی۔ دس قراءتوں کا مطلب یہ ہے کہ جب سابق الذکر سات قراء میں مندرجہ ذیل تین قاریوں کو شامل کر لیا جائے تو ان کو قراءِ عشرہ اور ان کی قراءت کو "قراءاتِ عشرہ" کہیں گے۔

۱۔ یعقوب بن اسحاق حضرمی متوفی ۲۰۵ھ جن کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔

۲۔ خلف بن ہشام متوفی ۲۲۹ھ آپ نے سلیم بن عیسیٰ بن حمزہ بن حبیب زیات سے

۱؎ طبقات القراء، ج ۱۔ ص ۳۴۶۔ ۳۴۹۔

۲؎ البرھان ج ۱۔ ص ۳۲۹۔

۳؎ البرھان، ج ۱۔ ص ۳۲۹۔ دیکھیے کسائی کے ترجمہ و تعارف کے لیے طبقات القراء، ج ۱۔ ص ۵۳۵

۴؎ نیز قراء سبعہ کی اسانید کے لیے ملاحظہ کیجیے "التیسیر فی القراءات السبعہ" الدانی ص ۸۔

۵؎ طبقات القراء۔ ج ۱۔ ص ۲۷۲۔

استفادہ کیا تھا۔

۳- یزید بن قعقاع[1] المعروف بابی جعفر متوفی سنہ ۱۳۰ھ - آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس اور ابوہریرہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے استفادہ کیا تھا۔

چودہ قراءتیں :

جب مذکورہ بالا دس قراء پر حسب ذیل چار قاریوں کا اضافہ کر دیا جائے تو ان کی قراءتوں کو چودہ قراءتیں کہیں گے۔

۱- حسن بصری[2] متوفی سنہ ۱۱۰ھ۔

۲- محمد بن عبدالرحمٰن متوفی سنہ ۱۲۳ھ جو ابن محیصن[3] کہلاتے تھے۔

۳- یحییٰ بن مبارک[4] یزیدی متوفی سنہ ۲۰۲ھ۔

۴- ابوالفرج محمد بن احمد شنبوذی[5] متوفی سنہ ۳۸۸ھ۔

روایات کے ساتھ اثبات قراءت :

محدثین کی اسانید نے مختلف قراءتوں کی مسلسل نقل و روایت پر بڑا اثر ڈالا۔ جس طرح علماء نے صحیح الاسناد روایات سے شرعی احکام اور اصول تفسیر استنباط کیے تھے۔ بعینہٖ اسی طرح قراء کی روایت اس وقت تسلیم کی جاتی ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ راوی نے یہ قراءت اپنے

---

[1] طبقات القراء ج ۱۔ ص ۳۸۲

[2] حسن بصری کا نام و نسب حسن بن ابی الحسن یسار بصری تھا۔ آپ انصار کے موالی اور کبار تابعین میں سے تھے۔ آپ بڑے عابد و زاہد تھے۔

[3] ابن محیصن نے مجاہد اور درباس سے استفادہ کیا۔ آپ ابوعمرو کے استاد تھے۔

[4] یحییٰ بن مبارک بغداد کے مشہور نحوی تھے۔ آپ نے ابوعمرو اور حمزہ سے استفادہ کیا۔ آپ الدوری اور السوسی کے استاد تھے۔

[5] محمد بن احمد بن ابراہیم بن یوسف بن عباس بن میمون بغدادی اپنے استاد ابن شنبوذ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے شنبوذی کہلاتے تھے (النشر ج ۱۔ ص ۱۲۲)۔

استاد سے بالمشافہ سنی ہے۔ اسی طرح آگے سے آگے نقل ہوتے ہوتے یہ سلسلۂ سند اس صحابی تک پہنچ جائے۔ جس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست استفادہ کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان اسانید کے اوائل میں ان صحابہ کے نام بکثرت آتے ہیں جنہوں نے حلال و حرام یا اسبابِ نزول یا تفسیر آیات کے بارے میں حدیثیں روایت کی ہیں[1] قراء کی اسانید میں اسی ربط و تسلسل کے زیرِ اثر علماء نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ قراءتیں توقیفی یعنی حکمِ خداوندی کے مطابق ہیں۔[2]

نظر بریں جو قراءت صرف مبنی بر قیاس ہو۔ اور روایت سے ثابت نہ ہو علماء نے اس کی اجازت نہیں دی۔ زمخشری اور ان کے ہمنواؤں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قراءت فصحاء و بلغاء کی صوابدید پر منحصر ہے[3] مگر عام علماء اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ جو قراءت عربیت کے قواعد اور رسم الخط کے مطابق ہو مگر معتبر محدثین کی سند کی طرح سندِ صحیح کے ساتھ منقول نہ ہو وہ مردود ہوگی۔ بہت سی قراءتیں ایسی ہیں جن کو اکثر یا بعض نحوی تسلیم نہیں کرتے۔ مگر علماء ان کے انکار کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔[4] مثلاً "بَارِئْكُمْ" کو باسکانِ ہمزہ پڑھنا اور "يَأْمُرْكُمْ" باسکان الراء "وَالْأَرْحَامِ" کو مجرور پڑھنا اور "لِيُجْزَىٰ قَوْمًا" کو منصوب قرار دینا اور مضافین کے درمیان فصل پیدا کرکے "أَوْلَادَهُمْ شُرَكَائِهِمْ" پڑھنا۔ وعلاوہ ازیں[5]

---

[1] ابو عمرو الدانی کی کتاب التیسیر کے صفحہ ۸ پر قراء سبعہ کی سندات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ علماء صحت روایت اور بالمشافہ اساتذہ سے اخذ روایت اور سماع پر کس قدر زور دیتے تھے۔

[2] البرھان، ج ۱۔ ص ۳۲۱۔ [3] الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۲۱۔

[4] البرھان، ج ۱۔ ص ۳۲۱۔

[5] الاتقان ج ۱۔ ص ۱۳۰ نیز اتحاف فضلاء البشر ص ۱۸۵۔ کتاب مذکور میں دمیاطی لکھتے ہیں کہ حمزہ یوں پڑھتے ہیں "وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامِ" سورۃ النساء۔ ۱) یعنی کوفی نحویوں کے قول کے مطابق "وَالْأَرْحَامِ" میں میم کو ضمیر مجرور "بِهِ" پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور پڑھتے ہیں۔ اسی طرح علامہ موصوف الاتحاف ص ۲۱۰ پر ابن عامر کی قراءت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"آیت قرآنی "وَكَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلُ أَوْلَادَهُمْ شُرَكَائِهِمْ" میں "قَتْلُ" کو "زُيِّنَ" کا نائب فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا گیا ہے۔ "أَوْلَادَهُمْ" کو اس لیے منصوب

(باقی برصفحہ آئندہ)

اس میں حیرت و تعجب کی کوئی بات نہیں کہ قراء نے ابوبکر ابن مقسم[1] کو اس لیے تنقید شدید کا نشانہ بنایا تھا کہ وہ جس قراءت کو بھی عربیت کے اعتبار سے صحیح تر سمجھتے تھے اختیار کر لیتے۔ قطع نظر اس سے کہ نقل سے اس کی تائید ہوتی ہو یا نہ ہو۔ یا یہ کہ نسخہ ہائے قرآنی میں مرقوم قراءت کے موافق ہو یا مخالف۔ علماء نے اس ضمن میں ایک مجلس منعقد کر کے ابن مقسم کو اس سے منع کیا تھا[2]۔ اسی طرح ایک اور مجلس منعقد کر کے ابن شنبوذ[3] سے بھی توبہ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ابن شنبوذ حضرت ابی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت کے مطابق قرآن مجید لکھا کرتے تھے[4]۔

ہر دو مجالس کا انعقاد شیخ القراء ابن مجاہد کے حسب الحکم عمل میں آیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ابن مجاہد ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے سات قراءتوں کو یکجا کیا۔ ابن مجاہد اور ان کے دو رفقاء ابن مقسم اور ابن شنبوذ تینوں ابن شاذان رازی کے خرمن علم سے خوشہ چینی کر چکے تھے۔ مگر با یں ہمہ اشتراک ابن مجاہد ان پر تشدد روا رکھتے تھے۔ اس لیے کہ اس دور کے قراء اس قراءت پر اعتماد کرتے تھے جو نقل و روایت کے اعتبار سے صحیح تر ہوتی تھی[5]۔ بخلاف ازیں وہ اس قراءت کو در خور اعتناء نہیں سمجھتے تھے جو لوگوں میں عام طور سے ذائع و شائع اور عربیت کے اصول و

(بقیہ صفحہ گزشتہ) قرار دیا گیا کہ یہ مصدر کا مفعول بہ ہے۔ "شرکاء" ہم مجرور ہے۔ اس لیے کہ مصدر (قتل) کا مضاف الیہ ہے۔"

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] محمد بن حسن بن یعقوب ابن مقسم کہلاتے تھے۔ یہ بغداد کے عظیم نحودان اور قاری تھے ۳۵۴ھ میں فوت ہوئے (طبقات القراء ج ۲۔ ص ۵۴)

[2] الاتقان ج ۱۔ ص ۱۳۲۔ نیز طبقات القراء ج ۲۔ ص ۵۴۔

[3] محمد بن احمد بن ایوب بن شنبوذ بغداد کے بہت بڑے نحوی اور قاری تھے۔ ۳۲۸ھ میں فوت ہوئے (طبقات القراء، ج ۲۔ ص ۵۲)

[4] اغلب یہ ہے کہ متہم و مبتلی ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن ابی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قراءت کی پیروی کرتے تھے۔ (کتاب المصاحف ص ۹۱) کتاب مذکور میں ان کی قراءت کے وجوہ و طرق مذکور ہیں۔

[5] مستشرق بلاشیر نے اس طرف اشارہ کیا ہے مگر عقل و منطق سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی علت و مصلحت وہی ہے جو ہم نے بیان کی کہ اس عصر و عہد میں نقل صحیح پر زیادہ اعتماد کیا جاتا تھا۔

قواعد سے قریب تر ہو[1] مگر روایتہً صحیح نہ ہو۔

تاہم لغت و نحو کے بعض علماء نے شاذ قراءتوں کو بڑے اہتمام سے جمع کیا تھا۔ ابن خالویہ متوفی سنہ ۳۷۰ھ نے اس موضوع پر "المختصر فی شواذ القراءات" نامی ایک کتاب مرتب کی تھی[2] اسی طرح مشہور نحوی ابن جنی[3] نے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "المحتسب فی توجیہ القراءات الشاذۃ" تھا۔ ابوالبقاء العکبری[4] نے اس ضمن میں ایک جامع ترین کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کا نام "املاء ما من بہ الرحمن من وجوہ الاعراب والقراءات فی جمیع القرآن" ہے بعض علماء بلا جھجک کہا کرتے تھے کہ "قراءتِ شاذہ کی تاویل و توجیہ قراءتِ مشہورہ کی تاویل سے قوی تر ہے[5]"۔ اس لیے کہ قراءتِ شاذہ سے آیت کی صحیح تاویل معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْمَانَهُمَا۔ — چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالو۔

---

[1] الاتقان۔ ج ۱۔ ص ۱۳۰۔

[2] اس کتاب کو مشہور مستشرق برگسٹراسر (BERGSTRASSER) نے سنہ ۱۹۳۴ء میں قاہرہ سے شائع کیا تھا۔ "مجموعۃ المکتبۃ الاسلامیۃ" کی ساتویں جلد اسی کتاب پر مشتمل ہے۔ ابن خالویہ کا نام و نسب حسین بن احمد ابو عبداللہ ہمدانی ہے۔ یہ عربیت کے امام تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مشہور کتب کے نام یہ ہیں:

(۱) کتاب الاشتقاق۔ (۲) کتاب لیس (۳) المختصر فی شواذ القراءات

سنہ ۳۷۰ھ میں بمقام حلب فوت ہوگئے (بغیۃ الوعاۃ۔ ص ۲۳۲۔)

[3] ابوالفتح عثمان بن جنی نحو و لغت کے عظیم امام تھے۔ آپ کی مشہور تصانیف "کتاب الخصائص اور سر الصناعۃ التصریف" ہیں۔ سنہ ۳۹۲ھ میں فوت ہوئے (نزہۃ الالباء ص ۴۰۶)۔ آپ کی کتاب "توجیہ القراءات الشاذۃ" کا ایک قلمی نسخہ قاہرہ کے دار الکتب میں موجود ہے۔

[4] عبداللہ بن حسین ابوالبقاء عکبری کے نام سے معروف تھے سنہ ۶۱۶ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کی تصنیف "املاء ما من بہ الرحمٰن" قاہرہ کے مطبع المیمنیۃ میں سنہ ۱۳۲۱ھ میں طبع ہوئی تھی۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۲۸۱)

[5] البرہان۔ ج ۱۔ ص ۳۴۱۔

میں "أَيْدِيَهُمَا" کی جگہ "أَيْمَانَهُمَا" کے الفاظ ہیں۔ اس قراءت سے واضح ہوتا ہے کہ چور کا دایاں ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی قراءت :

وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ مِنْ أُمٍّ فَلِكُلِّ[۱]

سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم میراث کے مسئلہ زیر بحث میں کس قسم کے بہن بھائی مراد ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز کی مشہور قراءت جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے حسب ذیل ہے[۲]

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءَ۔

(لفظ اللہ مرفوع اور العلماء منصوب) اس قراءت سے واضح ہوتا ہے کہ علماء کو خشیت سے مخصوص کرنے کا مقصد ان کے مرتبہ و مقام کا اظہار و اعلان ہے۔

امام زرکشی کہتے ہیں کہ خشیت سے یہاں اکرام و احترام مراد ہے خوف نہیں[۳]

امام موصوف مزید فرماتے ہیں :

"اس قسم کے حروف سے قرآن کا مطمح نظر روشن ہو جاتا ہے تفسیر قرآن کے ضمن ایسے اقوال بعض تابعین سے منقول ہیں اور ان کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کبار صحابہ سے ایسی کوئی قراءت منقول ہو تو وہ ہر حال میں لائق ترجیح ہے اور یہ تفسیری اقوال سے بھی اقوی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے قرآن کی صحیح تاویل و تفسیر معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے[۴]"

یہی وجہ ہے کہ علماء کے یہاں یہ مقولہ زبان زد عام ہے کہ :

اختلافِ قراءت اختلافِ احکام کا مظہر ہے[۵]"

مگر یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ بعض شاذ قراءتوں کی توجیہہ و تاویل میں بڑے تکلف سے کام

۱؎ سورۃ النساء آیت ۱۲۔ حفص کی قراءت میں "مِنْ أُمٍّ" نہیں ہے۔

۲؎ سورۂ فاطر، آیت ۲۸ (تفسیر القرطبی، ج ۱۴۔ ص ۳۴۴)۔

۳؎ البرھان، ج ۱۔ ص ۳۴۱۔

۴؎ البرھان، ج ۱۔ ص ۳۷۷۔

۵؎ الاتقان، ج ۱۔ ص ۱۴۱۔

لینا پڑتا ہے۔ بعض اوقات قراءتِ شاذہ کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ اور اس کی ناپسندیدگی کے ازالہ کے لیے تاویل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مثلاً یہ قراءت:

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوَّرُ۔ (الْمُصَوَّرُ بفتح الواو والراء بروزن اسم مفعول)

اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ "الْمُصَوَّرَ" الْبَارِئُ اسم فاعل کا مفعول ہے اور اسم فاعل نے یہاں فعل کا عمل کر کے المصوّر کو نصب دی ہے۔[1]

عجیب و غریب قسم کی تاویلات کی طلب و تلاش کے لیے شاذ قراءتوں کی نقل و روایت ایک طرح کی علمی و ادبی عیاشی تھی۔ اور اس کے دلدادہ وہ علماء تھے جو قرآن کے متعلقات و لوازمات کے سلسلہ میں وسیع مطالعہ کے خوگر تھے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کریم کی آیات شمار کیں۔[2] یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کریم کا سب سے طویل لفظ کون سا ہے اور مختصر ترین کون سا؟[3] قرآن کریم کے کس لفظ میں حروفِ متحرکہ زیادہ ہیں؟[4] اور اس قسم کے دیگر بے کار مباحث جن سے شاذ و نادر ہی کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اس قسم کے علماء بحث کے دائرہ کو طول دینے کے لیے شاذ قراءتوں کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتے تھے۔ ورنہ یہ حقیقت ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی کہ جو قراءت بتواتر ثابت نہ ہوا سے ہرگز قرآن نہیں کہہ سکتے۔ نماز میں اس کی تلاوت ناروا ہے۔ اور اس کو قرآن تصور کرنا بھی کسی کے لیے ضروری نہیں ہے۔

---

[1] البرھان ج ۱ ص ۳۴۱۔ مگر اس تاویل کا تکلف واضح ہے۔

[2] البرھان ج ۱ ص ۲۵۱۔

[3] البرھان ج ۱ ص ۲۵۲۔

[4] البرھان ج ۱ ص ۲۵۳۔ زرکشی اس ضمن میں جس مبالغہ آمیزی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ وہ حروف متحرکہ کی کثرت پر آیت قرآنی "حَتّٰى يَأْذَنَ لِيْ اَبِيْ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ" سے استشہاد کرتے ہیں۔ یہ استشہاد ان قراء کی رائے کے مطابق کیا گیا ہے جو لی اور ابی میں یاء کو متحرک پڑھتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اس مبالغہ آمیزی کو علمی اور ذہنی عیاشی قرار دیا ہے۔

امام نووی المہذب[1] کی شرح میں رقم طراز ہیں :

"قراءت شاذہ کو نماز میں اور خارج از نماز تلاوت کرنا درست نہیں - اس لیے کہ وہ قرآن میں شامل نہیں ہے - قرآن کریم روایاتِ متواترہ سے ثابت ہوتا ہے ظاہر ہے کہ قراءت شاذہ متواتر نہیں ہے - جو شخص اس کے خلاف کہتا ہے وہ یا تو جاہل ہے اور یا مغالطہ باز ہے - اگر کوئی شخص نماز میں یا نماز سے باہر قراءتِ شاذہ پڑھنے لگے تو اس کو بروقت ٹوک دینا چاہیے - فقہائے بغداد کا اس بات پر اجماع ہے کہ قراءتِ شاذہ کا ارتکاب کرنے والے سے توبہ کا مطالبہ کرنا چاہیے - ابن عبدالبر نے اس بات پر تمام اہل اسلام کا اجماع نقل کیا ہے کہ قراءتِ شاذہ ناروا ہے اور ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے[2] اسی لیے امام مالک فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز میں ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہ کی بیان کردہ خلافِ مصحف قراءت کرے اس کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھنا چاہیے"[3]

قراءتِ ابن مسعودؓ :

علماء نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت کے بارے میں ——— ان کے ورع و تقویٰ اور کثرتِ علم کے باوصف ——— جو موقف اختیار کیا ہے اس کی وجہ وجیہ یہ تھی

---

[1] المہذب شافعی فقہ کے فروعات پر مشہور فقیہ ابراہیم بن محمد شیرازی متوفی ۴۷۶ھ کی تصنیف (کشف الظنون) -

[2] البرہان ، ج ۱ ، ص ۳۳۲ -

[3] البرہان ، ج ۱ ، ص ۳۲۲ مستشرقین امام مالک کے فتویٰ کو بڑھا چڑھا کر اور بڑا آب و رنگ دے کر بیان کرتے اور اس کے مقابلہ میں حنفیہ کا فتویٰ پیش کرتے ہیں جو اس ضمن میں سہل انگاری سے کام لینے کے خوگر ہیں - حالانکہ یہ مسئلہ صرف علماء کے تشدد کا آئینہ دار ہے اور ان کے پیش رو اور سرخیل اس ضمن میں حضرت امام مالکؒ ہیں - اس نزاع کی اصل و اساس یہ بات ہے کہ آیا قرآن کا اثبات صرف روایات متواترہ سے ہوتا ہے یا دیگر روایات سے بھی اس کا امکان ہے ؟

کہ آپ قرآنِ کریم کی آخری دو سورتوں (المعوذتین) اور سورہ فاتحہ کو جزو قرآن قرار نہیں دیتے تھے۔ اکثر مفسرین آپ کے اس موقف کی منطقی تاویل کرتے ہیں۔ مثلاً ابن قتیبہ "مشکل القرآن" میں فرماتے ہیں:

"ابن مسعودؓ کا خیال ہے کہ معوذتین قرآن میں شامل نہیں۔ اس لیے کہ موصوف نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سورتیں پڑھ کر حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو دم کرتے دیکھا تھا۔ اس لیے ابن مسعود کا خیال یہی رہا کہ یہ سورتیں جزو قرآن نہیں ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ کا خیال درست تھا اور مہاجرین و انصار سب غلطی میں مبتلا تھے۔ ابن مسعودؓ نے اپنے نسخہ قرآن سے سورۂ فاتحہ کو اس لیے حذف نہیں کیا تھا کہ وہ قرآن میں شامل نہیں ——— نعوذ باللہ من ذالک ———

بلکہ ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ قرآن کو کتابی صورت میں اس لیے جمع کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ سہو و نسیان اور زیادت و نقصان کی آماجگاہ نہ بن جائے۔ چونکہ سورۂ فاتحہ میں یہ احتمال اس لیے موجود نہ تھا کہ یہ چھوٹی سی سورت ہے اور ہر مسلم کے لیے اس کا پڑھنا اور سیکھنا لازم ہے۔ لہٰذا اس کو مصحف میں ثبت کرنا ضروری نہ سمجھا"[1]

قراءت اُبی بن کعب:

حضرت اُبی بن کعبؓ کی قراءت بھی عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت کی طرح شاذ ہے۔ وہ نماز کے شروع میں پڑھی جانے والی دعا (دعائے استفتاح) اور دعائے قنوت کو جزو قرآن قرار دیتے تھے اور اپنے مصحف کے آخر میں دو سورتیں [illegible] ان کو تحریر [illegible] ان کی حیثیت صرف ایک دعا کی ہے اور ان کا جزو قرآن ہونا ثابت نہیں ہے۔ اگر یہ قرآن ہوتیں تو قرآن کی طرح ان کو نقل کیا جاتا اور امت کو ان کی صحت کا علم اور یقین ہوتا[3]

---

[1] الاتقان، ج ۱ ص ۱۳۷ - ۱۳۸ - [2] البرہان، ج ۱ ص ۲۵۱ -

[3] البرہان، ج ۲ ص ۱۲۸ - بخلاف ازیں باقلانی فرماتے ہیں: (باقی بر صفحہ آئندہ)

نقدِ قراءات کا معیار و مدار:

علماء نے قراءاتِ شواذ و غیر مقبولہ شاذہ کے مابین فرق و امتیاز کے لیے ایک ضابطہ کلیہ مقرر کیا ہے جس کی حسبِ ذیل تین شرطیں ہیں :-

(۱) پہلا یہ کہ وہ قراءت مصحفِ عثمانی کے مطابق ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ عربیت کے قواعد و اصول سے ہم آہنگ ہو۔

(۳) تیسرے یہ کہ صحیح السند ہو اگرچہ اس کی نقل و روایت قراءِ سبعہ و عشرہ کے علاوہ اوپر کے قراء سے کی گئی ہو[1]

ابن الجزری نے اپنی کتاب "منجد المقرئین" میں لکھا ہے کہ قراءت سندِ متواتر سے ثابت ہونی چاہیے۔ ان کے نزدیک اس ضابطہ میں یہ شرط بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ قرآن صرف سندِ متواتر سے ثابت ہوتا ہے۔ بنا بریں جو قراءتیں دس[1] سے زائد ہیں وہ اگرچہ سنداً صحیح ہیں مگر آحاد ہیں اور متواتر نہیں ہیں۔ اس لیے وہ قرآن نہیں۔ نہ ان کو نماز میں پڑھ سکتے ہیں نہ کسی اور عبادت میں۔ مقبول قراءتیں صرف دس ہیں جن کو سلف سے لے کر خلف تک لوگ روایت کرتے چلے چلے آئے ہیں۔ دس قراءتوں کے سوا دوسری کوئی قراءت متواتر نہیں ہے۔

سنّت کے اعتبار سے قراءت کی چھ قسمیں:

امام سیوطی[2] ابن الجزری سے نقل کرتے ہیں کہ سنّت کے اعتبار سے قراءت کی چھ قسمیں ہیں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) یہ بات درست نہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ یا ابی بن کعب یا زید بن ثابت یا عثمان و علی رضی اللہ عنہم یا ان کی اولاد میں سے کسی کی جانب قرآن کی کسی آیت یا حرف کے انکار یا تبدیل یا درجہ مشہور کے برعکس تلاوت و قراءت کا نسبت صرف اخبار احاد کی اساس پر کی جائے یہ بات نہ جائز ہے نہ مسموع و مقبول بلکہ اس کی نسبت ہمارے زمانہ کے کسی مومن کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی۔ صحابہ کی جانب اس کی نسبت تو بڑی بات ہے۔"

(البرہان، ج ۲ - ص ۲۷)

[1] الاتقان، ج ۱ - ص ۱۲۹ - [2] الاتقان، ج ۱ - ص ۱۳۲ - ۱۳۳

(۱) متواتر :۔ یہ وہ قراءت ہے جس کو ایک ایسی جماعت دوسری جماعت سے نقل و اخذ کرتی ہو جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔ مثلاً جو قراءت بتعدد طرق قراء سبعہ سے منقول ہو۔ اکثر قراءتیں اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔[1]

(۲) مشہور :۔ یہ وہ قراءت ہے جس کی سند صحیح ہو۔ اور جس کو ایک عادل و ضابط راوی اپنے جیسے راوی سے نقل کرتا ہو۔ اصولِ عربیت اور مصحفِ عثمانی سے ہم آہنگ ہو۔ خواہ قراءِ سبعہ یا عشرہ سے منقول ہو یا دیگر آئمہ مقبولین سے۔ مزید براں وہ قراءت قراء کے یہاں مشہور ہو اور اس کو غلط یا شاذ قراءتوں میں شمار نہ کیا گیا ہو۔ مگر وہ متواتر کے درجہ تک نہ پہنچتی ہو۔ اس کی مثال وہ قراءت ہے جس کو قراءِ سبعہ نے نقل کرنے میں اختلاف رونما ہوا ہو۔

قراءتِ متواتر و مشہور کے بارے میں مندرجہ ذیل کتب تصنیف کی گئی ہیں۔

۱۔ التیسیر للدانی۔[2]

۲۔ الشاطبیہ[3]

۳۔ طیبۃ النشر فی القراءاتِ العشر[4]

قرآن کریم کی تلاوت مذکورہ صدر دو قسموں کے مطابق کی جاتی ہے۔ ان پر اعتقاد واجب ہے اور ان میں سے کسی چیز کا انکار درست نہیں۔

---

[1] جمہور کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ قراءتِ سبعہ متواتر ہیں (البرھان ج ۱، ص ۳۱۸)

[2] کتاب التیسیر کو مشہور مستشرق پرٹزل (PRETZEL) نے سنہ ۱۹۳۰ء میں استنبول سے شائع کیا تھا۔ اس میں قراءِ سبعہ کے مذاہب ذکر کیے گئے ہیں۔ ابو عمرو الدانی نے اس کتاب میں ہر قاری سے دو دو روایتیں ذکر کی ہیں۔

[3] الشاطبیہ ایک منظومہ ہے جس کی نسبت امام ابو محمد قاسم شاطبی متوفی سنہ ۵۹۰ھ کی طرف کی گئی ہے۔ شاطبی نے اس میں کتاب التیسیر کو ۱۱۷۳ اشعار میں بصورت نظم پیش کیا اور اس کا نام "حرز الامانی و وجہ التہانی فی القراءات السبع المثانی" رکھا ہے (کشف الظنون، ج ۱، ص ۶۴۶)

[4] یہ کتاب امام ابن الجزری کی تصنیف ہے۔ یہ نظم کی صورت میں ہے۔ اس کی طباعت کا اہتمام ۱۳۰۸ھ میں مطبع شرف میں کیا گیا تھا۔ ابن الجزری کی تصنیف "النشر" ایک الگ کتاب ہے۔ اس کو دوبارہ ... طبع ...

۳۔ قراءت کی تیسری قسم وہ ہے جو صحیح السند ہو، مگر مصحف عثمانی یا قواعد عربیت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یا اسے زیادہ شہرت حاصل نہ ہوئی ہو۔ اس قسم کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ نہ اس پر اعتقاد واجب ہے۔ مثلاً حاکم بطریق عاصم جحدری از ابوبکرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفَارِفَ خُضْرٍ وَعَبَاقِرِيِّ حِسَانٍ "

نیز یہ قراءت[۲] لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفَسِكُمْ

۴۔ قراءتِ شاذہ وہ[۳] ہے جس کی سند صحیح نہ ہو۔ مثلاً ابن سمیفع کی قراءت :-

فَالْيَوْمَ نُنَحِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَفَكَ آيَةً

(نُنَحِّيكَ بالحاء اور خَلَفَكَ بفتح لام)

۵۔ موضوع :

موضوع وہ قراءت ہے جس کو بلا دلیل اس کے قائل کی طرف منسوب کیا جائے۔ اس کی مثال وہ قراءتیں ہیں جن کو محمد بن جعفر خزاعی[۴] نے جمع کر کے امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کر دیا تھا مثلاً یہ قراءت: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهُ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءَ "

(لفظ اللہ مرفوع اور العلماء منصوب)

۶۔ قراءت کی چھٹی قسم وہ ہے جو حدیث مُدرج سے ملتی جلتی ہے۔ یہ وہ قسم ہے جس میں تفسیر و

(بقیہ صفحہ گزشتہ) محمد احمد دھمان نے ۱۳۴۵ھ میں دمشق سے شائع کیا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] سورۃ الرحمٰن آیت ۷۶۔ حفص کی قراءت یوں ہے مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ [۲] سورۃ التوبۃ آیت ۱۲۸۔ امام حفص اس کو "مِنْ أَنْفُسِكُمْ" بضم الفاء پڑھتے ہیں

[۳] سورہ یونس، آیت ۹۲۔ امام حفص کی قراءت متداول اور مشہور ہے۔

[۴] امام ابو الفضل محمد بن جعفر خزاعی جو کتاب "المنتهی" کے مصنف ہیں۔ موصوف نے اس میں وہ مقامات جمع کر دیے تھے جو اس سے پہلے کسی کتاب میں مذکور نہ تھے۔ ۴۰۸ھ میں فوت ہوئے۔ ابن الجزری ان کو امام کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ (النشر ج ۱ ص ۳۴)

تشریح کے پیش نظر کسی لفظ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حسب ذیل قراءت:

"وَلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ مِّنْ اُمٍّ" —— اس میں "مِنْ اُمٍّ" کا اضافہ کیا گیا ہے"

اسی طرح قراءت:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فِيْ مَوَاسِمِ الْحَجِّ۔

اس میں "فِيْ مَوَاسِمِ الْحَجِّ" کے الفاظ تشریح کے طور پر پڑھائے گئے ہیں"

قرآن قواعدِ عربیت پر حکم ہے:

یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن کی تلاوت کرنے والا اگر دس بلکہ چودہ قراءتوں کا حافظ بھی ہو جائے وہ اس وقت تک قاری نہیں کہلا سکتا جب تک استاد سے بالمشافہ اس کا سماع نہ کرے۔

ہم نے اس مختصر کتاب میں قراءت کی حقیقت اور قرّاء پر اجمالی تبصرہ کر دیا ہے تاکہ اس کتاب کی تحریر و تصنیف سے جو ہمارا بنیادی مقصد ہے وہ حاصل ہو جائے۔ وہ مقصد قرآنی نصوص کا فہم و ادراک ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مطالعہ کی اصل و اساس وہی آیات ہیں جن کا قرآن ہونا تواتر سے ثابت ہے۔ چونکہ قرآن سات حروف کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اس لیے ہم ہر ایسی قراءت کو اختیار کرتے ہیں جو تواتر سے ثابت ہو۔ اس ضمن میں ہمارا اعتماد صحتِ نقل پر ہے۔ عربیت کے قواعد سے موافقت و مطابقت پر نہیں۔ اس لیے کہ قرآن لغت و نحو کے قواعد پر حکم ہے۔ بخلاف ازیں عربیت کے ضوابط و کلیات قرآن پر حکم نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قواعدِ لغت و نحو کا اصلی منبع و ماخذ قرآن کریم ہی ہے۔ علمائے نحو نے اولاً بالذات اسی سرچشمہ سے یہ قواعد وضع کیے۔ پھر دوسرے مرحلہ پر حدیث اور کلام عرب سے استفادہ کیا۔

فصل ششم

علمِ ناسخ ومنسوخ

نزولِ قرآن میں تدریج کی حکمت ومصلحت:

قبل ازیں قرآن کے تدریجی نزول کی فصل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ شرعی احکام یکدفعہ نازل نہیں ہوئے۔ علاوہ ازیں جوں جوں نئے واقعات واحوال پیش آتے رہے ان کے بارے میں وحی کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا جاتا رہا۔ اس تدریج میں انفرادی اخلاق وعادات سے لے کر قومی واجتماعی رسم ورواج تک سب شامل ہیں۔ اسلام نے ان امور میں مہلت پسندی اور تاخیر کو ترجیح دی اور لوگوں کو اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ تاخیر میں جب نظم وربط پایا جاتا ہو تو وہ اس عجلت سے بہتر ہے جس میں انتشار پسندی اور انارکی کا ثبوت دیا گیا ہو۔

مکی مدنی سورتوں کے یکے بعد دیگرے آنے والے مراحل وادوار کے ذکر وبیان میں ایک ایسے علم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ان کے تاریخی ادوار پر روشنی ڈالتا اور بڑی عمدگی سے ان کی نشان دہی کرتا ہو ——— اور وہ ناسخ ومنسوخ کا علم ہے ———

ہم اس علم کو نزولِ وحی میں تدریج وترتیب کی ایک قسم قرار دے سکتے ہیں۔ اس علم کی مدد سے ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ کون سی سورت یا آیت پہلے اتری اور کون سی بعد میں۔ نیز یہ کہ مخلوقات کی تربیت میں کیا حکمت مضمر ہے۔ اس علم سے یہ حقیقت بھی اجاگر ہوتی ہے کہ قرآن کا اصلی سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے۔ اس لیے کہ وہی جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رہنے دیتا ہے۔ وہ ایک حکم کو بدل کر اس کی جگہ نیا حکم لاتا ہے۔ اس میں مخلوقات کی رائے کو کوئی دخل نہیں حتیٰ کہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

بھی اس میں بے بس ہیں۔

نسخ کی تعریف میں علماء کا اختلاف:

نسخ اصطلاحی کی تعریف میں علماء کے یہاں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس لفظ کو لغوی اعتبار سے متعدد معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان معانی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ نسخ کے معنی ہیں زائل کرنا۔ دور کرنا۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ[1] شیطان جو القاء کرتا ہے اللہ اس کو مٹا دیتا ہے

۲۔ نسخ بمعنی تبدیل۔ مثلاً یہ آیت:

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ[2] جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت کو رکھ دیتے ہیں۔

۳۔ نسخ بمعنی تحویل۔ مثلاً تناسخ مواریث[3]۔

۴۔ نسخ بمعنی نقل یعنی نسخ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ عربی میں بولتے ہیں "نَسَخْتُ الْكِتَابَ" (میں نے کتاب نقل کر لی) یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب نقل کرنے والا وہی الفاظ اس طرز تحریر میں لکھ رہا ہو۔[4]

بعض علماء اس آخری وجہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ ناسخ (نقل کنندہ) بعینہٖ وہی الفاظ نقل نہیں کرتا۔ بلکہ اس عبارت کو بالفاظ دیگر تحریر کرتا ہے۔ مگر

---

[1] سورۃ الحج آیت ۵۲۔ عربی میں بولتے ہیں نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ (آفتاب نے سایہ کو دور کر دیا) نیز نَسَخَ الشَّيْبُ الشَّبَابَ (بڑھاپے نے جوانی کو زائل کر دیا) اساس البلاغۃ ص ۴۵۲ نیز البرھان ج ۲ ص ۲۹

[2] سورۃ النحل آیت ۱۰۱۔ نیز الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۲۔

[3] تناسخ مواریث کا مطلب یہ ہے کہ میراث کو ایک شخص سے دوسرے کی طرف منتقل کیا جائے البرھان، ج ۲۔ ص ۲۹)۔

[4] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۴ نیز البرھان، ج ۲۔ ص ۲۹۔ [5] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۴۔

سعدی[1] اس کی صحت پر مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا:

اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ[3] جو کام تم کرتے تھے ہم ان کو لکھتے جاتے تھے۔

نیز فرمایا:

وَاِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ[4]۔

علامہ سعدی فرماتے ہیں کہ اُمّ الکتاب سے یا تو لوحِ محفوظ مراد ہے اور یا وہ پوشیدہ کتاب، جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[5] اس کو صرف پاک باز ہی چھوتے ہیں۔

مندرجہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ نسخ نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں لوحِ محفوظ کے الفاظ ہی نقل کیے گئے تھے۔ جو قسط وار آپ پر نازل ہوتے رہے[6]۔

نسخ کی تعریف میں علماء کے یہاں جو جدل و نزاع رونما ہوا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اس لفظ کے لغوی و اصطلاحی معنی و مفہوم کے مابین جو ربط و تعلق پایا جاتا ہے اس کو ملحوظ رکھنا از بس ناگزیر ہے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ قرآن نے ایک نہایت اہم دینی معاملہ میں ایک ایسا لفظ استعمال کیا جو عربوں کے طرز و انداز اور اسلوبِ بیان کے منافی تھا۔ مثلاً نسخ کا لفظ مندرجہ ذیل آیت میں وارد ہوا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا[7]۔

ہمارا خیال ہے کہ قرآن نے جہاں بھی نسخ کا لفظ ذکر کیا ہے اس کو حقیقی معنی میں استعمال

---

[1] امام ابو عبداللہ محمد بن برکات سعدی نے افضل بن امیر الجیوش کے لیے ایک کتاب "الایجاز فی معرفۃ ما فی القرآن من منسوخ و ناسخ" نامی تالیف کی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ دار الکتب المصریہ میں زیر نمبر ۱۰۸۵ بعنوان تفسیر موجود ہے۔ اس کی تاریخ تحریر ۶۵۳ھ ہے۔

[2] البرہان، ج ۲ ص ۲۹ - نیز اساس البلاغۃ ص ۴۵۳۔

[3] سورۃ الجاثیۃ آیت ۲۹۔ [4] سورۃ الزخرف آیت ۴۔

[5] الاتقان، ج ۲ ص ۴۳۔ [6] سورۃ البقرۃ آیت ۱۰۶۔

کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نسخ کا لفظ جہاں بھی مذکور ہو اس سے اس معنی کے سوا دوسرا کوئی مفہوم ذہن میں آتا ہی نہیں۔ بشرطیکہ جدل و نزاع اور اختلافِ لفظی و ذہنی عیاشی کا شوق دامنگیر نہ ہو۔

نسخ کی صحیح ترین اصطلاحی تعریف:

نظر بریں نسخ کی صحیح ترین اصطلاحی تعریف جو لغتِ عرب اور شرعی نصوص دونوں کے مطابق ہے، حسبِ ذیل ہے۔

"کسی شرعی دلیل کی بناء پر کسی دینی حکم کے اُٹھ جانے (باقی نہ رہنے کو) نسخ کہتے ہیں۔"

اس لیے کہ عربی زبان میں نسخ ازالہ اور رفع (اُٹھ جانے) کو کہتے ہیں۔ اسی طرح شرعی نصوص کے پیشِ نظر یہ بالکل جائز ہے کہ قوی اور صریح دلائل کے باعث خاص حالات میں کسی حکمت و مصلحت کی وجہ سے جن سے صرف اہلِ علم ہی آشنا ہوتے ہیں کوئی شرعی حکم اُٹھ جائے اور باقی نہ رہے۔

نسخ السنّۃ بالقرآن:

علماء کے یہاں نسخ کی تعریف میں جو جدل و نزاع پایا جاتا ہے اس سے نسخ کی بعض دیگر اقسام کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً بعض علماء کی رائے میں نسخ قرآن کریم تک محدود ہے۔ اس لیے قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ عقلی و نقلی دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اکثر علماء کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ قرآن سنت کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن کریم میں جب ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت نازل ہوئی تو یومِ عاشورا کا روزہ جو حدیث سے ثابت تھا منسوخ ہو گیا۔[1]

نسخ القرآن بالسنّۃ:

---

[1] البرھان، ج ۲۔ ص ۳۲۔

امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالۃ" سے بظاہر مستفاد ہوتا ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔[1] مگر جن لوگوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے انھوں نے دراصل امام شافعی کا مطلب نہیں سمجھا۔ جناب امام درحقیقت کتاب و سنت کی عظمت و فضیلت اور ان کے تطابق و توافق پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کتاب و سنت کے مابین کبھی اختلاف رُونما نہیں ہوتا۔ البتہ ایک آیت اور دوسری آیت یا ایک حدیث اور دوسری حدیث کے مابین تخالف و تضاد ہو سکتا ہے۔ اندریں صورت ایک آیت یا حدیث دوسری آیت یا حدیث کی ناسخ ہو گی۔

نسخ السنۃ بالسنۃ:

اکثر علماء کے نزدیک ایک حدیث دوسری حدیث کی ناسخ ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم خواہ ابتداءً ہو یا نسخاً بإشارہ وحی ہوتا ہے[2]۔ آپ شرعی امور و احکام کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ جو

---

[1] الرسالۃ، ص ۱۳۷-۱۴۶۔

[2] البرھان، ج ۲- ص ۳۲۔ امام زرکشی نے ابن عطیہؒ کی تردید میں جو کچھ تحریر کیا ہے ہم نے اس کا خلاصہ ذکر کر دیا ہے۔ ابن عطیہؒ نے دراصل امام شافعی کا مطلب نہیں سمجھا۔ اور ان کے خلاف یہ دلیل پیش کی ہے کہ آیت وصیت کو حدیث نبوی "لا وصیۃ لوارث" نے منسوخ کر دیا تھا۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے۔ حالاں کہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ آیت وصیت کی ناسخ وہ آیات ہیں جن میں تقسیم میراث کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض محققین کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ آیت وصیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ تاحال اس کا حکم باقی ہے۔ نیز یہ کہ آیتِ وصیت اور تقسیم میراث سے متعلق آیات کے مابین سرے سے کوئی تعارض ہی نہیں۔

[3] یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک حدیث دوسری حدیث کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حدیث جب بطریق وحی حکم خداوندی پر مبنی ہو تو وہ ناسخ ہو سکتی ہے۔ اور اگر مبنی بر اجتہاد ہو تو ناسخ نہیں ہو سکتی۔ ابن حبیب نیشاپوری نے اس کو اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے (البرھان ج ۲- ص ۳۱)۔

کچھ کہتے ہیں بانتشاء وحی کہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حدیث نبوی:

الوضوء مما مست النار

جس چیز کو آگ نے چھوا ہو اس کے کھانے سے وضو لازم ہو جاتا ہے۔

کی ناسخ حدیث یہ ہے کہ "آپ نے بکری کا گوشت تناول فرمایا اور وضو نہ کیا"

نسخ القرآن بالقرآن:

مگر قرآنی مباحث کے دوران ہمارے پیش نظر صرف "نسخ القرآن بالقرآن" کا موضوع ہے ہمیں دوسرے موضوعات کو زیر بحث لانے سے یہ خطرہ مانع ہے کہ کہیں ایسے مباحث نہ چھڑ جائیں، جن سے ہم دامن بچانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ہماری کتاب ایک خاص طرز و انداز اختیار کرے گی جو ہمارے مقصد سے خارج ہے۔ ہم نسخ القرآن بالقرآن کے سلسلہ میں نزاع لفظی کی الجھن میں بھی نہیں پڑنا چاہتے۔ اس لیے کہ اس نزاع کو چھیڑنے کی صورت میں ہمیں فریقین کے دلائل بیان کرنا پڑتے اور دونوں کے نظریات و افکار کو کتاب خداوندی میں اثبات نسخ کی جانب موڑنا اور ڈھالنا پڑتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم ایسے موضوع کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے جس کی اہمیت اسلامی قانون اور قرآنی مباحث میں مسلّم ہے۔ بنابریں اس جدل و نزاع کے اہم نکات کو بیان کرنا ہی پڑے گا۔

ابو مسلم اصفہانی کا نقطۂ نگاہ:

ابو مسلم اصفہانی[1] سے پہلے جمہور علماء کتاب اللہ میں نسخ کے قائل تھے۔ بلکہ بہت سے علماء آیاتِ منسوخہ سے استدلال کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے تھے۔ بعض حد درجہ غلو سے کام لیا کرتے تھے۔ ابو مسلم نے جب نسخ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو اس کو اجمالاً و تفصیلاً بالکل باطل قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس با تحقیق عالم نے بغور وہ آیات مطالعہ کیں

[1] ان کا اصلی نام محمد بن بحر تھا۔ ابو مسلم اصفہانی کے نام سے معروف تھے۔ یہ معتزلہ میں بہت بڑے مفسر تھے ۳۲۲ھ میں وفات پائی تفسیر قرآن میں آپ کی مشہور ترین تصنیف "جامع التاویل" ہے۔

جن میں نسخ کی صراحت پائی جاتی ہے۔ ابومسلم نے نسخ کی ان اقسام کو باطل قرار دیا جو آیتِ قرآنی

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ[1]

سے ٹکراتی ہیں۔ خدا کے نازل کردہ حکم قرآنی کے ابطال سے بچنے کے لیے وہ نسخ کو تخصیص کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

نسخ و تخصیص کے مابین فرق و امتیاز۔

مگر علماء نے ابومسلم اور اس کے ہمنواؤں کی مخالفت کرتے ہوئے نسخ اور تخصیص کے درمیان فرق کیا ہے۔

تخصیص:۔ چنانچہ علماء نے تخصیص کی تعریف یوں کی ہے۔

"عام کو اس کے بعض افراد کے ساتھ مخصوص کرنے کو تخصیص کہتے ہیں"

ظاہر ہے کہ عام کے بعض افراد کی تخصیص کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے حکم شرعی کو اٹھا دیا یعنی ان کو مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ عام کا بعض افراد کے ساتھ مخصوص ہونا بطریق مجاز ہوتا ہے۔ عام کا لفظ اصل میں سب افراد کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ جب وہ چند افراد کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے تو وہاں تخصیص کا کوئی قرینہ ضرور ہوتا ہے۔ اس کے عین برعکس جو نص منسوخ ہوتی ہے وہ بھی اپنے اصلی اور موضوع لہ معنی میں استعمال ہوتی ہے اور سب زمانوں کو شامل ہوتی رہتی ہے۔ اور سب زمانوں کو شامل ہوتی ہے۔ مگر اس کا عام حکم ایک خاص وقت تک جاری رہتا ہے۔ اس کو ایک ناسخ ہی بے کار کر سکتا ہے۔ جس کی بنیاد ایسی حکمت و مصلحت پر رکھی جاتی ہے جو خدا ہی کو معلوم ہوتی ہے[2]

نسخ:۔

تخصیص میں کسی قرینہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ خواہ وہ قرینہ سابقہ ہو یا لاحقہ ہو یا حالیہ

---

[1] سورۂ فصلت۔ ۴۲۔

[2] مناہل العرفان، ج ۲۔ ص ۸۰۔

بخلاف ازیں ناسخ منسوخ سے لازماً متاخر ہوتا ہے۔ نسخ و تخصیص کے مابین ایک فرق یہ بھی ہے کہ تخصیص اخبار میں وقوع پذیر نہیں ہو سکتا[1]

کتاب و سنت کے علاوہ تخصیص عقل و حس سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ مثلاً آیت قرآنی:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا[2] — چوری کرنے والے مرد اور عورت کے دونوں ہاتھ کاٹ دو۔

کی تخصیص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لَا قَطْعَ فِي رُبْعِ دِينَارٍ۔ — ¼ دینار کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

بخلاف ازیں نسخ کا اثبات صرف کتاب و سنت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ عقلی دلیل کی اساس پر کسی شرعی حکم کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا[3] نسخ و تخصیص کے مابین فرق و امتیاز کا ثمرہ یہ ہے کہ عام کی تخصیص کے بعد جو افراد باقی رہتے ہیں وہ معمول بہ ہوتے ہیں اس لیے تخصیص کے بعد بھی عام سے احتجاج و استدلال کر سکتے ہیں۔ بخلاف ازیں جو نص منسوخ ہو چکی ہو۔ اس سے نہ کسی نوع کا استدلال درست ہے۔ نہ اس پر عمل کر سکتے ہیں[4]

قائلین نسخ کی مبالغہ آمیزی:

اگر ایک طرف ابو مسلم اصفہانی اور اس کے ہمنواؤں نے نسخ و تخصیص کو گڈ مڈ کر دیا۔ اور قرآن کے اختیار کردہ لفظ نسخ کے مقابلہ میں تخصیص کا لفظ گھڑ کر خداوند تعالیٰ کی گستاخی کے مرتکب ہوئے۔ تو دوسری جانب قائلین نسخ نے مبالغہ سے کام لے کر عام آیات کو

---

[1] جمہور علماء کے نزدیک نسخ صرف امر و نہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جو لوگ اخبار میں وقوع نسخ کے قائل ہیں وہ ان کو امر و نہی کے اندر محدود کرتے ہیں، (البرہان، ج ۲۔ ص ۳۳) اس لیے یہ رائے قابل التفات نہیں ہے۔ (الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۲۵)۔

[2] سورۃ المائدۃ۔ ۳۸۔ [3] مناہل العرفان، ج ۲۔ ص ۸۱۔

[4] یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب عام کے تمام افراد کا حکم منسوخ ہو چکا ہو۔ جب بعض افراد کا حکم منسوخ ہو اور بعض کا غیر منسوخ تو اس سے کسی حد تک احتجاج و استدلال جائز ہے (مناہل العرفان، ج ۲

جن کی تخصیص ہو چکی تھی منسوخات کے زمرہ میں شمار کر لیا۔ اس طرح یہ لوگ بھی گستاخی کے مرتکب ہوئے۔ اس لیے کہ انھوں نے نسخ و بداء[1] نیز نسخ و انساء[2] اور نسخ احکام و نسخ اخبار کو باہم مخلوط کر دیا۔

قائلین نسخ کی مبالغہ آمیزی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ ایک آیت کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک حصہ کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً آیتِ قرآنی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ	اے ایمان والو! اپنے آپ کا خیال رکھو
أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا	گمراہ ہونے والا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا
اهْتَدَيْتُمْ۔[3]	جب تم خود ہدایت پر رہو۔

کے آخری حصہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی دعوت دی گئی ہے۔ بخلاف ازیں آغاز آیت صرف اپنے آپ کی اصلاح کے حکم پر مشتمل ہے[4]۔ اس لیے بقول ابن العربیؒ آیت ہذا کا آخری حصہ اوّلین حصہ کا ناسخ ہے۔

اس طرفہ پر طرہ یہ کہ ابن العربیؒ کی رائے میں آیت کریمہ:۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ۔[5]

---

[1] بداء شیعہ کا عقیدہ ہے۔ بداء کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم بدلتا رہتا ہے۔ وہ جس بات کو چاہتا ہے بدل دیتا ہے۔ وہ ایک بات کا حکم دیتا ہے۔ لیکن پھر اس کے برعکس حکم صادر کرتا ہے امام شہرستانی لکھتے ہیں مختار ثقفی نے بداء کا عقیدہ اس لیے اختیار کیا کہ وہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا دعویٰ کرتا تھا۔ یا تو اس لیے کہ بقول اس کے اس پر وحی نازل ہوتی تھی۔ یا امام کے پیغام کی بناء پر۔ وہ جب اپنے رفقاء سے کسی واقعہ کے ظہور کا وعدہ کرتا اور وہ اسی طرح وقوع پذیر ہو جاتا تو وہ اسے اپنے دعویٰ کی دلیل قرار دیتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا خدا نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اسی کو بداء کہتے ہیں۔" (غلام احمد حریری)

[2] انساء کے معنی ہیں حکم کو متاخر اور ملتوی کر دینا۔

[3] سورۂ مائدہ آیت ۱۰۵۔

[4] احکام القرآن لابن العربی، ج ۱۔ ص ۲۰۵ و الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۲ نیز الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۱۵۳

[5] سورۃ الاعراف آیت ۱۹۹۔

کا پہلا اور آخری حصّہ منسوخ مگر درمیانی جزو محکم و غیر منسوخ ، ہے[1]

قائلین نسخ نے جس عجیب و غریب مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انہوں نے مندرجہ ذیل کو بھی منسوخ قرار دیا ہے۔

۱۔ دورِ جاہلیت کے عادات و رسوم جن کو قرآن نے باطل قرار دیا ہے۔ مثلاً آباؤ اجداد کی بیویوں سے نکاح کرنے کو حرام ٹھہرایا۔[2]

۲۔ قتل کی دیت (یاداش)[3]

۳۔ قصاص[4]

۴۔ طلاق کو تین میں محدود کرنا[5]

---

[1] احکام القرآن لابن العربی، ج ۱، ص ۳۸۸ نیز الناسخ والمنسوخ لابن سلامتہ ص ۱۷۰۔ ابن العربی نے اس ضمن میں جو عجیب ترہات کہی ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی پانچویں آیت "فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ" اسی سورت کی دیگر ۱۱۴ آیات کی ناسخ ہے۔ اور اس آیت کا آخری حصہ ابتدائی حصّہ کا ناسخ ہے۔ آیت مذکورہ کا آخری حصہ "فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ" ہے (احکام القرآن، ص ۲۰۱)

[2] جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں:
"وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ"۔

(الناسخ والمنسوخ لابن سلامتہ۔ ص ۱۲۵)

[3] قرآن میں فرمایا "فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ"

[4] ارشاد ہوتا ہے"
ابن سلامہ اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ صفحہ ۹۰ پر لکھتے ہیں کہ اس آیت نے جاہلی عربوں کی اس عادت کو منسوخ کر دیا کہ وہ اپنے غلام کے عوض آزاد آدمی کو قتل کیا کرتے تھے۔ اور عورت کے عوض مرد کو اللہ تعالیٰ نے قصاص کے حکم میں ان کو مساوی قرار دیا"

[5] طلاق کا یہ حکم مندرجہ ذیل آیت میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا:
"اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ"۔
عجیب بات یہ ہے کہ جاہلیت میں بے شمار طلاقیں دینے کا جو دستور پایا جاتا تھا اس کو مٹانے اور طلاق کو تین کے دائرہ میں محدود کرنے کو مفسرین نے نسخ قرار دیا ہے۔

۵۔ سابقہ شریعتوں کے وہ احکام جن کو قرآن نے منسوخ کیا ہے۔ مثلاً بعض اشیاء جو پہلے حرام تھیں ان کو حلال ٹھہرایا۔

علمائے محققین کے نزدیک مذکورہ بالا جملہ امور منسوخات میں شامل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان کو منسوخ قرار دیا جائے تو سارا قرآن منسوخ ٹھہرے گا۔ اس لیے کہ پورا قرآن یا اس کا اکثر حصہ کفار اور اہل کتاب کی تردید اور ان کے عادات و رسوم کو مٹانے کے لیے نازل ہوا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ناسخ اس آیت کو کہتے ہیں جو دوسری آیت کے حکم کو منسوخ کر دے۔[۱]

نسخ کو اقسام ثلاثہ میں تقسیم کرنا درست نہیں:

آیاتِ منسوخہ کی تلاش کے ذوق و شوق نے لوگوں کو بہت سی غلطیوں میں مبتلا کر دیا جن سے دور رہنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اس سے قرآن پر اعتراضات وارد کرنے کی راہ کھلتی ہے۔ حالانکہ وہ اس سے بخوبی آگاہ ہیں کہ قرآن تواتر سے ثابت ہوتا ہے۔ اور اخبار احاد ظنی ہیں قطعی نہیں ہیں۔ بایں ہمہ وہ نسخ کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ وہ آیات جن کا حکم منسوخ ہے تلاوت نہیں۔

۲۔ وہ آیات جو منسوخ التلاوت ہیں مگر ان کا حکم باقی ہے۔

۳۔ وہ آیات جن کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہیں۔

اگر وہ چاہیں تو قسم اول کے بہت سے شواہد پیش کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس قسم میں نص قرآنی بدستور موجود ہوتی ہے البتہ بعض تشریعی مصالح و اسرار کے پیش نظر اس کا حکم باقی نہیں رہتا مگر آخری دونوں قسموں میں عجیب جرأت سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں خاص آیات کی تلاوت کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے پھر یا تو ان کا حکم بھی منسوخ ہوتا ہے یا منسوخ نہیں ہوتا۔

جو شخص قائلین نسخ کے رویہ پر غور کرتا ہے۔ اس پر جلد ہی ان کی غلطی منکشف ہو

---

[۱] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۶۔ ۳۷۔

جاتی ہے۔ نسخ کو مختلف انواع و اقسام میں تقسیم کرنا صرف اسی صورت میں درست ہے جب کہ ہر قسم کے دلائل و شواہد اگر زیادہ نہیں تو کم از کم کافی ضرور ہوں۔ حالاں کہ ان کے پاس ان آخری دو قسموں میں سے ہر قسم کے صرف ایک یا دو شاہد پائے جاتے ہیں[1] وہ اس ضمن میں اخبارِ احاد سے احتجاج کرتے ہیں۔ جب کہ قرآن کے نزول یا نسخ پر اخبار احاد سے احتجاج کرنا درست نہیں ہے[2]۔ ابن ظفر[3] نے اپنی کتاب "الینبوع" میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خبرِ واحد سے قرآن کا اثبات نہیں ہوتا[4]

اس پر مزید یہ کہ دلدادگان نسخ نے صرف انہی اقسام پر اکتفاء نہ کیا جو انہوں نے ظنی

---

[1] وہ قسم جس میں آیت کی تلاوت منسوخ اور حکم باقی ہوتا ہے اس کی مشہور مثال سورۂ نور کی وہ آیت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سورۂ نور میں موجود تھی اب الفاظ منسوخ ہو چکے ہیں اور اس کا حکم باقی ہے۔ آیت یہ تھی۔ الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من اللہ۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۳۔ ص ۲۶۱۔) ——— اس روایت کے ضعیف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ صحیح ابن حبان کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت سورۂ نور میں نہیں۔ بلکہ سورۂ احزاب میں تھی۔

جو آیت منسوخ التلاوۃ والحکم ہو اس کی مثال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہے کہ جو قرآن نازل ہوا تھا اس میں دس رضعات کا ذکر کیا گیا تھا کہ ان سے حرمتِ رضاع ثابت ہوتی ہے۔ پھر ان کو منسوخ کر کے پانچ قرار دیا گیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو قرآن میں پانچ رضعات پر مشتمل آیت کی تلاوت کی جاتی تھی (الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۵۔

[2] قاضی ابوبکر نے اپنی کتاب "الانتصار" میں منکرین نسخ تلاوت کے بارے میں اسی طرح لکھا ہے۔ البرھان، ج ۲۔ ص ۳۰۔ نیز الاتقان، ج ۲۔ ص ۴۲۔

[3] ابوعبداللہ بن ظفر محمد بن محمد صقلی متوفی ۵۶۵ھ۔ قاہرہ کے دارالکتب میں آپ کی کتاب "الینبوع" کے مختلف اجزاء فن تفسیر کے تحت مطابق نمبر ۳۱۰ موجود ہیں۔ یہ قلمی نسخہ ہے۔

[4] برھان، ج ۲۔ ص ۳۹۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے نسخ قرآن کے بارے میں تشدد سے کام لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا ناسخ قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک قطعی دلیل ہی حکم قطعی کی ناسخ ہو سکتی ہے۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ: (باقی بر صفحہ آئندہ) .....

اخبار آحاد سے استنباط کی نہیں۔ بلکہ اس حد تک مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ ان کے نزدیک خود ناسخ کسی وقت منسوخ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی مثال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ[1]

بقول ان کے اس آیت کو "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ" نے منسوخ کر دیا۔ پھر یہ آیت بھی منسوخ ہو گئی۔ اس کی ناسخ مندرجہ ذیل آیت ہے:

حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ[3] — حتیٰ کہ وہ عاجز ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

اس ضمن میں عجیب تر بات یہ ہے کہ مذکورہ صدر جزیہ سے متعلق آیت اہل کتاب کے بارے میں اتری ہے۔ اس لیے "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ" کی ناسخ نہیں ہو سکتی[4]

ناسخ و منسوخ آیات کے بارے میں بعض علماء کے مبالغات بداہت اور عقل و منطق سے بھی ٹکراتے ہیں۔ ہبۃ اللہ بن سلامۃ[5] ہی کو دیکھیے سورۂ الدھر پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سورت محکم (غیر منسوخ) ہے۔ البتہ اس کی دو آیتیں اور تیسری آیت کا کچھ حصہ منسوخ ہیں[6]۔ وہ پہلے اس آیت کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کا ایک جزو منسوخ ہے فرماتے ہیں کہ آیت:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا۔

میں "أَسِيرًا" کا لفظ منسوخ ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا"۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی مثل اور اس سے بہتر صرف قرآن ہی ہو سکتا ہے (البرھان، ج ۲-ص ۳۱)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سورۂ الکافرون۔ [2] سورۂ التوبہ۔

[3] سورۂ التوبہ آیت ۲۹ نیز البرھان، ج ۲-ص ۳۱۔

[4] وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت۔ فاعفوا واصفحوا حتی یاتی اللہ بامرہ جو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۹ ہے منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ یہ آیت ہے فاقتلوا المشرکین پھر اس آیت کو حتی يُعْطُوا الْجِزْيَةَ نے منسوخ کر دیا۔ (البرھان، ج ۲-ص ۳۱)

[5] ہبۃ اللہ بن سلامۃ بن ابی القاسم بغدادی متوفی سنہ ۴۱۰ھ (شذرات الذھب) (باقی بر صفحہ آیندہ)

"اسیرا" کے لفظ سے مشرک قیدی مراد تھے۔ اب مشرک قیدیوں کو کھانا کھلانے کا حکم "آیت السیف" سے منسوخ ہو چکا ہے[2]۔ جب ابن سلامہ کو ان کی کتاب الناسخ والمنسوخ پڑھ کر سنائی گئی تو ان کی بیٹی سن رہی تھی۔ جب قاری اس مقام پر پہنچا جہاں قیدی کا ذکر کیا گیا تھا تو ان کی بیٹی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے والد نسخ کے شوق میں ایک اخلاقی ضابطہ بھول گئے جو نہ صرف دین اسلام بلکہ جملہ ادیان میں مسلّم ہے۔ بیٹی کہنے لگی آپ نے اس کتاب میں غلطی کی ہے۔ کہنے لگے کیونکر بیٹی؟ کہا سب مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ قیدی کو کھانا کھلایا جائے اور اسے بھوکا نہ رکھا جائے۔ ابن سلامہ نے کہا آپ نے بجا کہا[3]۔

ایک طرف منکرین نسخ آیاتِ منسوخہ کو مخصوص قرار دیتے ہیں۔ تو دوسری طرف قائلین نسخ آیاتِ مخصوصہ کو منسوخ ٹھہراتے ہیں۔ متعدد آیات ایسی ہیں جن کو حرف[4] استثناء یا کسی خاص حد، غایت یا کسی دوسری آیت کی بناء پر مخصوص کیا گیا ہے مگر قائلین نسخ سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کو منسوخ ٹھہراتے ہیں۔

امام سیوطی[5] فرماتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آپ کی کتاب "الناسخ والمنسوخ" مصر میں "اسباب النزول للواحدی" کے حاشیہ پر شائع ہو چکی ہے۔

[6] الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ، ص ۳۲۰۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سورۃ الدھر۔ ۸۔

[2] الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۳۲۱۔ آیۃ السیف سے "فاقتلوا المشرکین" مراد ہے۔ یہ سورۃ التوبۃ کی پانچویں آیت ہے۔

[3] البرھان، ج ۲۔ ص ۲۹ نیز الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۹۔

[4] الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۲۶۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قرآن کا ہر وہ جملہ جس میں لفظ "إلّا" مذکور ہے وہاں حرف استثناء ناسخ کا حکم رکھتا ہے۔

[5] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۶ نیز الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۸۵۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض علماء کے نزدیک آیت:
"انفروا خفافا وثقالا" (سورۃ التوبۃ) جنگ کے لیے ہلکے ہو یا بوجھل ہر حالت میں نکلو (باقی بر صفحہ آئندہ)

"ایک قسم کی آیات وہ ہیں جو مخصوص ہوتی ہیں نہ کہ منسوخ۔"

ابن العربی کا بیان اس ضمن میں قابل مدح وستائش ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ منسوخ نہیں بلکہ مخصوص ہیں:

۱- اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا"۔

۲- وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"۔

۳- فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ"۔

و دیگر آیات جن کو حرفِ استثناء یا غایت کی بناء پر مخصوص کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ان کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے۔

مندرجہ ذیل آیت قرآنی اسی قبیل سے ہے:-

وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی	مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ
یُؤْمِنَّ ۔	کیجیے جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اس کو آیت کریمہ:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ آیۃ العذر یعنی یہ آیت ہے۔

"لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ" (سورۃ الفرقان)

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل آیت بھی سورۃ التوبۃ والی آیت کی ناسخ ہے:

"وَمَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ"

(الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ۔ ص ۱۸۹-)

حق بات یہ ہے کہ مذکورہ صدر آیت منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ بھی آیات ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ جنگ کے لیے وہ لوگ جائیں جن کی ضرورت ہو۔ اندھا مریض اور کمزور آدمی اس کے (حاشیہ صفحہ ہذا) سلہ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جس آیت میں توقیت اور غایت کا ذکر کیا گیا ہو وہ محکم اور غیر منسوخ ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک مدت مذکور ہوتی ہے۔ اور جو آیت مدت پر مشتمل ہو وہ منسوخ نہیں ہوتی (الاتقان، ج ۲- ص ۳۵)

نے منسوخ کر دیا۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ وہ آیت مخصوص ہے منسوخ نہیں۔

قائلین نسخ نے اس ضمن میں بعض ایسی آیات کو بھی شامل کر دیا ہے۔ جن کا نسخ یا تخصیص کے ساتھ کچھ علاقہ نہیں ہے[۱]۔ مثلاً یہ آیت:

"وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ"[۲]

اور اسی قسم کی دیگر آیات جن میں زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان آیات کو فرضی زکوٰۃ پر مشتمل آیات نے منسوخ کر دیا[۳]۔

مگر علمائے محققین کا نادیۂ نگاہ یہ ہے کہ مذکورہ صدر آیت میں ان منفق اہل ایمان کی مدح وستائش کی گئی ہے جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ انفاق (خرچ کرنا) ایک عام چیز ہے۔ اس کا اطلاق زکوٰۃ پر بھی کیا جا سکتا ہے اور اہل و عیال اور دیگر نیک کاموں میں خرچ کرنے پر بھی۔ مثلاً کسی کی مدد کرنا یا مہمان نوازی کرنا وغیرہ۔ آیت مذکورہ صدر میں کوئی ایسا لفظ نہیں پایا جاتا جس سے معلوم ہو کہ یہاں زکوٰۃ کے سوا کوئی اور واجب صدقہ مراد ہے[۴]۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت کریمہ:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ۔ کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟[۵]

کو آیۃ السیف[۶]، (فاقتلوا المشرکین)، نے منسوخ کر دیا۔ آیۃ السیف کو انہوں نے اور بھی بہت سی آیات کی ناسخ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس جگہ نسخ یا تخصیص کا کوئی کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ احکم الحاکمین رہا ہے اور رہے گا[۷]۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایسی آیات میں نسخ کا تصور بھی بارگاہِ ربانی میں گستاخی اور سوء ادبی کا موجب ہے۔ اگرچہ مفسرین نے ایسے مقامات پر نسخ کا ذکر بڑے نرم لہجہ میں کیا

۱۔ الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۶۔ ۲۔ سورۃ البقرۃ۔ ۳۔
۳۔ الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۲۳۲۔ ۴۔ الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۲۲۹۔ ۲۳۰۔
۵۔ سورۃ التین۔ ۸۔ ۶۔ الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۶۔
۷۔ الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ، ص ۲۳۰۔

ہے۔ بعض مفسرین یوں کہتے ہیں:

"اس آیت کے معنی منسوخ ہیں لفظ نہیں۔ اس کے معنی کی ناسخ آیت السیف ہے گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ ان کو چھوڑ دیجیے اور ان سے درگزر کیجیے"[1]

قائلین نسخ نے کثرتِ ناسخ و منسوخ کے اظہار و بیان میں سہل انگاری سے کام لے کر درحقیقت بارگاہِ ربانی میں بہت بڑی گستاخی کا ارتکاب کیا تھا۔ حالانکہ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ جس بحث و تاویل میں وہ حصہ لے رہے ہیں اس کو نسخ کے بجائے انساء (تاخیر پر) محمول کرنا چاہیے۔ چنانچہ جس بات کا حکم کسی سبب کی بناء پر دیا گیا ہو۔ پھر وہ سبب باقی نہ رہے۔ تو وہ اس کو بھی منسوخ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جب اہل اسلام کمزور اور قلیل التعداد تھے تو اس وقت صبر کا حکم دیا گیا[2] پھر اس کو آیۃ السیف کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ حالانکہ اس کو نسخ نہیں بلکہ انساء یعنی تاخیر البیان الی وقت الحاجۃ (کسی چیز کی توضیح و تشریح کو وقتِ ضرورت تک ملتوی کر دینا) قرار دینا چاہیئے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اَوْ نُنْسِهَا" (یا اس کو ملتوی کر دیں۔)[3]

جو علماء نسخ کے باب میں تحقیق سے کام لیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی آیات کو منسوخ کے بجائے "مُنسأ" یا حکمِ مجمل کی توضیح قرار دینا چاہیئے[4] گویا لڑائی کے حکم کو اہل اسلام کے طاقتور ہونے تک ملتوی کیا گیا۔ اور کمزوری کی حالت میں صبر کی تلقین کی گئی تھی[5]

---

[1] البرھان، ج ۲۔ ص ۴۲ یہ سورۃ الجاثیۃ۔ آیت نمبر ۱۴ کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ ۔ ایمانداروں کو فرمادیں کہ وہ اُن لوگوں کو معاف کر دیں

لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ۔ جو آخری دن کی اُمید نہیں رکھتے۔

یہ آیت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ مکہ کا ایک مشرک آپ سے ہم کلام ہوا تو آپ ناراض ہو گئے۔ اور اس کو سزا دینے کا ارادہ کیا۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۲۷۷)

[2] ابن سلامۃ ص ۲۷۸۔

[3] سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۰۶۔

[4] البرھان، ج ۲۔ ص ۴۳۔

[5] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۵۔

امام زرکشی کا بیان اس ضمن میں لائق تعریف ہے۔ فرماتے ہیں:-

"اس تحقیق سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ اکثر مفسرین نے جو تخفیف کے حکم پر مبنی آیات کو آیۃ السیف کے ساتھ منسوخ قرار دیا ہے۔ ضعیف اور ناقابل اعتماد ہے۔ ایسی آیات منسوخ نہیں بلکہ منسأ ہیں۔ یعنی جب کسی حکم کی تعمیل کسی وقت کسی خاص علت کی بنا پر ضروری ہو۔ اور پھر علت کسی دوسرے حکم کی طرف منتقل ہو جائے تو پہلا حکم بدل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کو نسخ نہیں کہتے نسخ کے معنی ہیں دور کر دینا اور زائل کرنا تاکہ کسی وقت بھی اس کی پیروی جائز نہ ہو۔[1]

یہ امر اسی قبیل سے ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو شروع شروع میں ازرہ رحم وکرم یہ حکم دیا تھا کہ:-

"اے ایمان والو! جب تم خود ہدایت یافتہ ہو تو دوسروں کی گمراہی تمہیں ضرر نہیں پہنچا سکتی"[2]

پھر امر بالمعروف نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کو فرض قرار دیا۔ کیونکہ مسلمان طاقتور ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مناسب حال ومقام احکام نازل کیے نظر بریں بعض علماء نے اہل منکر کے ساتھ مصالحت اور لڑائی سے باز رہنے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ اہل اسلام کمزور ہیں۔ جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اسلام کا ظہور وشیوع اجنبیت کے عالم میں ہوا تھا اور وہ اسی طرح ہو جائے گا جیسے شروع میں تھا"[3]

---

[1] البرھان، ج ۲۔ ص ۴۲۔ نیز الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۵۔

[2] سورۃ المائدہ آیت نمبر ۱۰۵۔

[3] البرھان، ج ۲۔ ص ۴۳۔ امام زرکشی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:
"اللہ تعالیٰ حکیم ہے اس کے احکام بھی حکمت ومصلحت پر مبنی ہیں۔ جب اسلام کمزور تھا تو اس وقت آپ پر وہ احکام نازل کیے جو مناسب حال تھے۔ تاکہ آپ کے متبعین کو (باقی بر صفحہ آئندہ)"

علماء کے یہاں کثرتِ ناسخ ومنسوخ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نسخ کا بیان ان پر مشتبہ رہا مثلاً یہ آیت کریمہ:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ — جو تونگر ہو وہ بچنے کی کوشش کرے، اور جو تنگدست

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ[1] — ہو، وہ جائز حد تک کھائے۔

علماء نے اس آیت کو ایک ایسی آیت کا ناسخ قرار دیا ہے جو قرآنی ترتیب میں اس سے متاخر ہے، اور وہ یہ آیت ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ — جو لوگ ازرہِ ظلم یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ

ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ — اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔ اور وہ

نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا[2] — جہنم میں داخل ہوں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان آیات میں ناسخ ومنسوخ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پہلی آیت میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ تنگدست ہونے کی صورت میں اگر یتیم کا ولی جائز حد تک اس کا کچھ مال کھائے تو یہ ظلم نہیں ہے۔[3]

نسخ فی الاخبار:

شاید اس باب میں عجیب ترین بات یہ ہے کہ بعض مفسرین اخبار میں بھی نسخ کے قائل ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مشقت وتکلیف کا سامنا نہ ہو۔ جب اسلام زور پکڑ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی نصرت واعانت فرمائی تو آپ پر وہ احکام نازل کیے جو اس دور کا تقاضا تھے۔ مثلاً یہ کہ کفار سے لڑا جائے یا جزیہ وصول کیا جائے۔ بشرطیکہ وہ اہل کتاب ہوں۔ اگر اہل کتاب ہوں تو ان سے اسلام کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر نہ مانیں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ یہ دونوں حکم یعنی کمزوری کے وقت کفار سے مصالحت اور طاقتور ہونے کی صورت میں تلوار کا استعمال، اپنے اپنے سبب پر مبنی ہیں۔ "تلوار کے استعمال کا حکم مصالحت کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ حسب مصلحت وضرورت ان دونوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔"

(حاشیہ صفحہ ھٰذا) [1] سورۃ النساء، ۶۔ [2] سورۃ النساء، ۱۰ نیز الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۵۵۔

حالانکہ عقلِ انسانی یہ باور نہیں کر سکتی کہ ایک ثابت شدہ واقعہ کے اعمال و اقوال کو بھی بدلا جا سکتا ہے

حیرت ہے کہ بعض مفسرین آیت السیف کو آیت کریمہ :

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ لوگوں سے اچھی بات کہو۔

کا ناسخ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ آیت کے سیاق سے روشن ہوتا ہے کہ یہ عہد بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا[۲]

آخری بات جس کی طرف دلدادگانِ نسخ نے گہری توجہ مبذول کی اور بڑے ذوق و شوق کا اظہار کیا ہے یہ ہے کہ انہوں نے ان آیات کی نقاب کشائی کی ہے جن پر عرصہ دراز تک اہل اسلام عمل پیرا رہے، اور پھر ان کے حکم کو منسوخ قرار دیا گیا۔ چنانچہ تلاش بسیار کے بعد ان کو سورۃ الاحقاف میں ایک آیت مل ہی گئی، جس پر بقول ان کے مسلمان سولہ[۳] سال عمل کرتے رہے اور پھر اس کو سورۃ الفتح کی آیت نے منسوخ کر دیا۔

سورۃ الفتح کی آیت حسب ذیل ہے :

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ۔

آپ فرما دیں کہ میں انوکھا رسول نہیں ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے اور آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا :

ابن سلامۃ کا خیال ہے کہ اس آیت کا ابتدائی حصہ محکم ہے۔ البتہ " وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ " منسوخ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال تک مکہ میں

۱؎ سورۃ البقرۃ، ۸۳۔ الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۱۱۷۔

۲؎ تفسیر ابن کثیر، ج ۱۔ ص ۱۱۹۔ ۱۲۰ نیز الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۶۔

پوری آیت یوں ہے :۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ"

۳؎ سورۃ الاحقاف آیت ۹۔

اس آیت پر عمل کیا۔ قریش مکہ آپ کو ملعون کہتے رہے کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔ پھر آپ مدینہ تشریف لے گئے۔ تاہم پانچ چھ سال تک اغیار کے ہدف ملامت بنے رہے۔ مشرک کہتے تھے کہ ہم ایسے شخص کی پیروی کیونکر کریں۔ جسے یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کا حشر کیا ہوگا اور ہمارا کیا؟ جب سورۃ الفتح کا ابتدائی حصہ نازل ہوا تو یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ مشرکین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اب آپ کو یہ پتہ چل گیا ہے کہ آپ کے اور آپ کے اصحاب کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا[۱]

نسخ میں تساہل عقیدۂ بداء کا موجب ہے:

کتاب خداوندی کے نسخ کے بارے میں یہ سہل انگاری اور منسوخ ہونے سے قبل عمل درآمد کے زمانہ کی تعیین و تحدید۔ نیز آیات کا وہ مفہوم جو پہلی مرتبہ نازل ہونے کے وقت مقصود ہوتا ہے اور وہ مفہوم جو دوسری آیات کے ان کے حکم کو تبدیل کرنے کے بعد مراد ہوتا ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنہوں نے غیور و جسور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے اس قسم کے خطرناک نسخ سے انکار کر دیا۔ اور اس کو بداء (شیعہ کا عقیدہ کہ خدا اپنا ارادہ بدلتا رہتا ہے) کے مماثل قرار دیا۔ یا یوں کہیے کہ اس عقیدہ کو بداء تک پہنچانے کا معقول ذریعہ خیال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہلاء کو ہر زمان و مکان میں اس امر کی کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ نسخ اور بداء کو گڈمڈ کر دیں۔ حالانکہ نسخ فوائد و مصالح پر مبنی ہے اور عقیدۂ بداء کی اساس قبح و فساد اور جہالت پر رکھی گئی ہے۔

---

[۱] الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ، ص ۲۷۹۔ ابن سلامۃ نے اسی تکلف پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ اس پر ایک اور تکلف کا اضافہ کیا ہے فرماتے ہیں اس آیت کے سوا قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کو سات آیات نے منسوخ قرار دیا ہو (الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۲۸۳)

ابن سلامۃ نے سورۃ الفتح کی سات ابتدائی آیات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ چار ابتدائی آیات: وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا تک آپ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ پانچویں آیت صحابہ کے بارے میں اتری۔ اور چھٹی اور ساتویں منافقین اور یہود کے ضمن میں۔ ابن سلامۃ کا یہ بیان بے حد حیرت و استعجاب کا موجب ہے۔

بداء سے مقصود یہ ہے کہ آدمی ایک رائے رکھتا ہو۔ پھر اُسے ایک نئی رائے سوجھے[1]۔ یہود نے نسخ سے اسی لیے راہ فرار اختیار کی تھی کہ وہ کہیں بداء کے عقیدہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایک حکم کے نازل ہونے اور اس پر عمل پیرا رہنے کے بعد اُس کو منسوخ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ایک ایسی مصلحت کی بناء پر جو اسے پہلے معلوم نہ تھی اپنے احکام کو تبدیل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب درست نہیں ہے۔

منکرین نسخ کی عجلت پسندی:

بعض اہل اسلام محققین نے زمانہ قدیم و جدید میں جب دیکھا کہ مفسرین بہت سی آیات کو بلا دلیل منسوخ قرار دیتے تو انہوں نے عجلت پسندی سے کام لے کر یہود کی طرح نسخ سے انکار کر دیا اور اس کو بداء کا مترادف قرار دیا۔ اس ضمن میں فریقین نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا قائلین نسخ کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ اس میں مبالغہ سے کام لیتے اور نسخ کو ایسے مفہومات کے ساتھ جوڑ دیتے جن کے ساتھ اس کا کچھ تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح منکرین نسخ کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ جو بات آیاتِ قرآنیہ اور ایسے واقعات سے ثابت ہے جن کو کوئی انصاف پسند آدمی رد نہیں کر سکتا اس کو باطل قرار دیں۔ ان کی یہ جسارت بھی قابل قبول نہ تھی کہ نسخ اور بداء کے مابین کوئی فرق ہی نہیں۔

نسخ و بداء کے مابین فرق و امتیاز:

منکرین نسخ یہ بھول گئے یا انہوں نے دانستہ اس حقیقت کو فراموش کر دیا ــــــــــ

---

[1] البرہان، ج ۲ ۔ ص ۳۰۔ البرہان کے تصحیح کنندہ ابوالفضل ابراہیم نے البلاء کو بضم الباء ضبط کیا ہے۔ یہ صریح غلطی ہے جیسا کہ مشہور لغات سے معلوم ہوتا ہے۔ بداء کے معنی پوشیدگی کے بعد ظہور کے ہیں، قرآن کریم میں ہے "وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا" بداء کے ایک معنی اور بھی ہیں۔ یعنی ایک ایسی بات سوجھنا جو پہلے معلوم نہ ہو۔ القاموس میں لکھا ہے:۔ وبدا لہ فی الامر بدوًا وبداءً وبداۃً ۔ یعنی اسے نئی رائے سوجھی جو پہلے معلوم نہ تھی اس کی دلیل یہ آیت ہے:۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ۔

جیسا کہ زرقانی کا خیال ہے ــــــــ کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی نیا حکم دے کر پرانے حکم کو منسوخ کرتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کو کوئی ایسی بات سوجھی جو پہلے معلوم نہ تھی۔ بخلاف ازیں اللہ تعالیٰ کو ازل ہی سے بلکہ اس حکم کو مشروع قرار دینے سے بھی پہلے ناسخ و منسوخ کا علم تھا۔ اس سے بڑھ کر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مخلوقات اور ارض و سماء کو پیدا کرنے سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ و آشنا تھا۔ اس کے ساتھ خداوندِ قدوس کو یہ بھی معلوم تھا کہ جس حکم کو منسوخ کیا جا رہا ہے وہ ایک ایسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ جو فلاں وقت پر ختم ہو جائے گی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ منسوخ کی جگہ ناسخ ایک خاص حکمت و مصلحت کو لے کر نازل ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ حِکَم و مصالح لوگوں کے بدل جانے سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور مخصوص ظروف و احوال کے پیش نظر ان میں تبدیلی آ جایا کرتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شرعی احکام اور ان کے مصالح بندے اور ان کے اسرار و حِکَم نیز نواسخ اور منسوخات سب خدا کو معلوم تھے اور ان میں سے کوئی چیز بھی اس پر پوشیدہ نہ تھی۔ نئی بات صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو بات معلوم تھی اس نے بندوں پر اس کو واضح کر دیا۔ یہ بات نہیں کہ اس کا اظہار خداوند تعالیٰ پر بعد ازاں ہوا۔

نسخ کا اثبات حدیث رسولؐ یا قول صحابی سے ہوتا ہے:

مزید براں یہ کہ جس طرز و انداز سے ہم ناسخ و منسوخ کو پہچان سکتے ہیں اس کے پیش نظر نسخ اور بداء باہم مشتبہ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح نسخ و تخصیص نیز انساء اور بیان مجمل کے مابین سے کوئی اشتباہ و ابہام واقع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ نسخ کا اثبات صریح حدیث رسولؐ یا اس صحابی کے قول کے ساتھ ہوتا ہے جو یوں کہے کہ "فلاں آیت نے فلاں کو منسوخ کر دیا۔" کسی آیت کے منسوخ ہونے کا فیصلہ اس وقت صادر کیا جاتا ہے۔ جب دو آیتوں کے

لہ مناہل العرفان، ج ۲۔ ص ۷۸۔

درمیان قطعی تعارض پایا جاتا ہو، اور نہ تاریخ کے ذریعے یہ بات معلوم ہو کہ دونوں میں سے متقدم کون ہے اور متأخر کون۔ نسخ کے بارے میں نہ عام مفسرین کے قول پر اعتماد کیا جاتا ہے اور نہ مجتہدین کے اجتہاد پر۔ بلکہ اثباتِ نسخ کے لیے صریح تعارض اور نقل صحیح کا پایا جانا ضروری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ میں ایک حکم کو اٹھا کر اس کی جگہ ایک ایسے حکم کو رکھا گیا ہوتا ہے جو عہدِ رسالت میں معمول بہ رہ چکا ہوتا ہے۔ اس میں نقل اور تاریخ پر اعتماد کیا جاتا ہے رائے اور اجتہاد پر نہیں۔[1]

علماء محققین نے بصراحت تحریر کیا ہے کہ بہت سی آیات جن کو مفسرین نے منسوخ قرار دیا ہے دراصل وہ منسوخ نہیں۔ بلکہ انساء و تاخیر پر مبنی ہیں۔ یا اُن مجمل میں شامل ہیں جس کی توضیح کو وقتِ ضرورت تک ملتوی کیا گیا ہے۔ یا وہ ایک خطاب پر محمول ہیں جس کے شروع میں ایک اور خطاب حائل ہو گیا ہے۔ یا عام سے مخصوص ہیں۔ یا کسی خاص کو عام کا حکم دیا گیا یا ایک معنی کو دوسرے معنی میں داخل و شامل کر دیا گیا ہے۔ خطاب کے متعدد اقسام ہیں۔ علماء نے اس کو نسخ پر محمول کیا ہے حالانکہ اس کو نسخ نہیں کہتے۔ اس لیے کہ کتابِ خداوندی دیگر کتب مقدسہ کی حافظ و کافل اور بذاتِ خود ہر طرح محفوظ ہے۔ اس کے تحفظ و صیانت کی ذمہ داری خداوندِ کریم نے اپنے ذمہ لی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا :-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝[2]

بے شک ہم نے ہی قرآن اُتارا اور ہم ہی اسی کے محافظ ہیں۔

نسخ کے اعتبار سے قرآنی سورتوں کی تعداد :-

جب دل دادگانِ نسخ نے قرآنی سورتوں کو آیاتِ منسوخہ پر مشتمل ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے گنا تو تینتالیس[۴۳] سورتیں ایسی شمار کیں جن میں کوئی آیت ناسخ یا منسوخ نہیں ہے

---

[1] یہ ابن الحصار کا نقطۂ نگاہ ہے، جیسا کہ سیوطی نے الاتقان، ج ۲ ص ۴۰ پر اس کا ذکر کیا ہے۔

[2] سورۃ الحجر آیت ۹ بحوالہ البرہان، ج ۲ ص ۴۴۔

چھ سورتیں ایسی ہیں جن میں ناسخ آیت تو موجود ہے۔ مگر منسوخ موجود نہیں۔ چالیس[۴۰] سورتیں ایسی ہیں جن میں منسوخ آیت موجود ہے مگر ناسخ کوئی نہیں۔ اکتیس[۳۱] سورتیں ایسی ہیں جن میں ناسخ و منسوخ دونوں موجود ہیں[۱]۔

قرآن میں اصل احکام ہے نسخ نہیں:۔

اس بات سے ہمیں کوئی سروکار نہیں کہ مذکورہ صدر اقسام میں مشمولہ سورتوں کے اسماء ذکر کریں۔ اس لیے کہ ہماری رائے میں ان اقسام کی بنیاد مبالغہ آمیزی اور تکلف پر رکھی گئی ہے۔ اس ضمن میں قابل غور بات یہ ہے کہ محکم سورتوں کی تعداد جو آیات منسوخہ سے خالی ہیں صرف تینتالیس بتائی گئی ہے۔ گویا اصل چیز نسخ ہے۔ احکام (عدم نسخ) نہیں ان اعداد و شمار کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ ناسخ و منسوخ پر مشتمل سورتوں کو اصل و اساس قرار دیتے ہیں۔

سیوطی کے نزدیک آیات منسوخہ کی تعداد:

حق بات یہ ہے کہ قرآنی آیات میں اصل احکام (عدم نسخ) ہے نسخ نہیں البتہ جب صریح دلیل سے کسی آیت کا منسوخ ہونا ثابت ہو جائے تو اُسے لامحالہ منسوخ تسلیم کیا جائے گا۔ علمائے محققین شروع سے ہی ان آیات کے بارے میں تحقیق کرتے چلے آئے ہیں جن کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بحث و تمحیص کے بعد انھوں نے محدودے چند آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ ان چند آیات پر بھی بعض علماء نے گرفت کی اور ثابت کیا کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہیں۔

امام سیوطی نے آیاتِ منسوخہ کو اکیس[۲۱] تک محدود کر دیا ہے۔ تاہم ان میں سے بھی بعض آیات کے منسوخ ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے[۲]۔ مزید براں خود امام سیوطی ہی کا قول ہے کہ آیۃ الاستیذان[۳]

---

[۱] الناسخ والمنسوخ لابن سلامۃ ص ۱۴۔ نیز البرہان، ج ۲۔ ص ۳۳

[۲] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۷۔ ۳۸۔ سیوطی نے اس مقام پر ایسی تمام آیات کو جمع کر دیا ہے۔ جن کو منسوخ قرار دینا زیادہ قرین صحت و صواب ہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور آیۃ القسمۃ دونوں آیات منسوخ نہیں بلکہ بقول اصح تر محکم ہیں۔ نظر بریں امام سیوطی کے نزدیک آیات منسوخہ کی تعداد انیس[۱۹] ہوئی۔

آیات منسوخہ دس سے زائد نہیں :-

مگر ہماری رائے میں جن آیات کو منسوخ قرار دیا جا سکتا ہے ان کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر ہم امام سیوطی پر نقد و جرح کرنے کے بجائے قاری کو مشورہ دیتے ہیں کردہ ان کے ارشادات پر زحمت غور و فکر گوارا کرے۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ ہمارے مذکورہ صدر بیانات کے پیش نظر ان بہت سی آیات کو منسوخ قرار دینے کے بجائے امام سیوطی کے برعکس ان کو تخصیص و انساء یا تاخیر البیان پر محمول کرنے لگے۔ واللہ اعلم

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔

۳ آیۃ الاستیذان مندرجہ ذیل ہے :-

لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ

یہ بلا اختلاف محکم اور غیر منسوخ آیت ہے۔

آیۃ القسمۃ حسب ذیل ہے :- إِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا۔

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آیت المواریث نے اس کو منسوخ کر دیا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ اس کا حکم تا ہنوز باقی ہے۔ گویا اس میں نفل صدقات کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

فصل ہفتم

قرآنی رسم الخطّ

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں چار صحابہ پر مشتمل کمیٹی نے قرآنی نسخوں کو مرتب کرتے وقت کلمات و حروف کے لکھنے کا ایک خاص طرز و انداز اختیار کیا تھا۔ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی پسند تھا۔ علماء نے اس خاص طریقہ کا نام "رسم المصحف" رکھا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس پسندیدہ رسم الخط کو آپ کی جانب منسوب کر کے "رسم عثمان رضی اللہ عنہ" یا "خطِ عثمانی" بھی کہا جاتا ہے۔ اس خط کو عظمت و جلالت اور تقدیس کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس رسم الخط کو نافذ کرنے اور بنظر استحسان دیکھنے والی وہ عظیم شخصیت تھی، جس نے عجز و نیاز کے ساتھ تلاوت قرآن کرتے ہوئے شہادت پائی تھی[1] اسی ارادت و عقیدت کا نتیجہ ہے۔ کہ لوگ جب بھی قرآن کریم کا کوئی قدیم نسخہ دیکھتے ہیں تو اسے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ یا مصاحفِ عثمانی میں سے ایک قرار دیتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو اس کو قرآن کریم کا وہ نسخہ قرار دیتے ہیں جس پر شہید خلیفہ کے خون کے آثار پائے جاتے تھے[2]

---

[1] CASANOVA, MOHAMMED ET LA FIN DU MONDE, P.139

مشہور مستشرق کازانوفا کی رائے کا بلاشیر کے نظریہ سے موازنہ کیجیے۔

BLACHERE, CORAN, INTRODUCTION, 67.

کتاب مذکور کے حاشیہ نمبر ۸۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مورخین عرب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حال بڑے رقت انگیز اور جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ حتیٰ کہ مشہور عیسائی ابن العبری نے اپنی کتاب "تاریخ مختصر الدول" شائع کردہ بیروت ۱۸۹۰ء کے صفحہ ۱۰۹ پر بڑے اثر انگیز انداز میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

[2] CASANOVA, OP. CIT., 123.

بعض علماء نے اس میں اس حد تک مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے کہ اس رسم الخط کو توقیفی قرار دیا ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خداوند تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی طرح ڈالی تھی آپ کی جانب یہ قول منسوب ہے ——— حالانکہ آپ اُمّی تھے اور لکھنا نہیں جانتے تھے۔ کہ حضور نے کاتبِ وحی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا۔

"دوات میں سیاہی اچھی طرح گھول لیں۔ قلم ٹھیک طریقہ سے پکڑیں۔ باء کو سیدھا لکھیں۔ سین کے دندانوں میں فرق کریں۔ میم کو خراب نہ کریں، لفظ اللہ کو خوبصورت طریقہ سے لکھیں، الرحمٰن کو مد کے ساتھ لکھیں۔ الرحیم کو خوبصورت لکھیں۔ قلم اپنے بائیں کان پر رکھیں۔ اس سے بات نہیں یاد رہے گی"[1]

ابن مبارک نے اس نظریہ کی پرزور حمایت کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "الابریز" میں اپنے استادِ گرامی عبدالعزیز دباغ سے نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہے۔

"صحابہ کرام یا کسی اور کا قرآنی رسم الخط میں کوئی دخل نہیں۔ بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ایسا کیا گیا تھا۔ آپ نے صراحتہً فرمایا تھا کہ فلاں جگہ الف لکھا جائے اور فلاں جگہ نہ لکھا جائے عقلِ انسانی اس کا سِرّ معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو صرف قرآن کا خاصہ ہے۔ اور دیگر کتب مقدسہ میں نہیں پایا جاتا۔ جس طرح قرآن کریم کے الفاظ مبنی بر اعجاز ہیں۔ اسی طرح اس کا رسم الخط بھی اعجاز سے خالی نہیں۔

آخر عقلِ انسانی اس بات کی تہ تک کیسے پہنچ سکتی ہے کہ مِائَةٌ (ایک سو) میں الف لکھا جاتا ہے۔ اور فِئَةٌ (جماعت۔ گروہ) میں نہیں لکھا جاتا۔ نیز یہ کہ "سعوا" (سورۃ الحج) کے آخر میں الف لکھا جاتا ہے۔ اور یہی لفظ سورۂ سبا میں وارد ہوا ہے۔ اسی طرح "عتوا" کا لفظ جہاں بھی وارد ہوا ہے۔ اس کے آخر میں الف لکھا گیا ہے۔ مگر

[1] مناہل العرفان زرقانی۔ ج ۱۔ ص ۳۷۰۔

سورۂ فرقان میں اس لفظ کے آخر میں الف نہیں لکھا گیا۔ اٰمَنُوْا کے آخر میں الف لکھا جاتا ہے اور بَاءُوْ، جَاءُوْ، تَبَوَّءُوْ اور فَاءُوْ (سورۂ بقرہ) کے آخر میں الف تحریر نہیں کیا جاتا۔ یَعْفُوَا الَّذِیْ میں الف لکھا جاتا ہے اور "یعفو عنہم" سورۂ نساء میں نہیں لکھا جاتا۔ عقل اس بات کی مصلحت کو کیسے معلوم کر سکتی ہے کہ یکساں قسم کے کلمات میں بعض جگہ ایک حرف کو حذف کیا جاتا ہے۔ اور بعض جگہ نہیں۔ مثلاً "قُرْءٰنًا" (سورۂ یوسف و زخرف) سے الف حذف کیا گیا ہے اور دیگر مواضع میں نہیں۔ سورۂ فصلت میں "سمٰوات" واو کے بعد الف لکھا جاتا ہے اور باقی جگہوں میں نہیں لکھا جاتا "المیعاد" کے لفظ میں ہر جگہ الف لکھا جاتا ہے مگر سورۂ انفال میں جہاں یہ لفظ وارد ہوا ہے وہاں الف نہیں لکھا گیا "سِرَاجًا" میں ہر جگہ الف لکھا جاتا ہے مگر سورۂ الفرقان میں نہیں۔ اسی طرح تاء کو بعض جگہ حذف کیا جاتا ہے اور بعض جگہ باقی رکھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق ہوتا ہے۔ لوگوں سے پوشیدہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ باطنی اسرار ہیں۔ اس لیے خداوندی کشف و اظہار کے بغیر ان کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ جس طرح سورتوں کے شروع میں جو حروف مقطعات ہیں، وہ بھی عظیم اسرار کی حیثیت رکھتے ہیں اور معانی کثیرہ کے حامل ہیں۔ مگر اکثر لوگ ان اسرار سے نابلد ہیں۔ اور خداوندی معانی و مطالب سے واقف نہیں قرآنی رسم الخط کا بالکل یہی حال ہے[1]

نظر بریں زرقانی نے مناہل العرفان میں عثمانی رسم الخط کی یہ خوبی بیان کی ہے کہ وہ پوشیدہ اور دقیق معانی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً آیت قرآنی "وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ" میں "اَیْدٍ" کو جب ایک یاء کا اضافہ کر کے "بِاَیْیدٍ" لکھا جائے۔ تو اس سے خدا کی عظیم قوت و شوکت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے جس کے ساتھ اس نے آسمان بنایا۔ نیز یہ کہ وہ طاقت و قوت میں یکتا اور منفرد ہے۔ اس لیے کہ مشہور قاعدہ کے مطابق "لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی

---

[1] مناہل العرفان الزرقانی، ج ۱۔ ص ۳۷۶۔

پر دلالت کرتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مذکورہ صدر بیان عثمانی رسم الخط کی مدح و ستائش میں غلو و مبالغہ پر مبنی ہے۔ یہ ایسا تکلف ہے جس سے بڑھ کر تکلف کا مثال پیش نہیں کی جا سکتی[1] یہ بات عقل و منطق سے لگا نہیں کھاتی کہ رسم الخط کے معاملہ کو توقیفی یعنی بامر ربانی قرار دیا جائے۔ یہ بات بھی درست نہیں کہ رسم الخط انہی اسرار پر مشتمل ہے جو سورتوں کے فواتح میں مضمر ہیں۔ رسم الخط کا توقیفی ہونا کسی حدیث سے بھی ثابت نہیں ہے۔ اس کو حروفِ مقطعات کے مماثل بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ حروفِ مقطعات کا قرآن ہونا تواتر سے ثابت ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ خلافت عثمانی میں کاتبین وحی اس رسم الخط پر متفق ہو گئے تھے۔ حضرت عثمانؓ بھی اس میں ان کے ہمنوا بن گئے۔ آپ نے کاتبین قرآن کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر دیا تھا۔ آپ نے تینوں قریشی کاتبین وحی کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ:-

"جب قرآن کی کتابت کے بارے میں تمہارے اور زید بن ثابت انصاری مدنی کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو قرآن کو قریش کی زبان میں لکھو۔ اس لیے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے[2]"

عثمانی رسم الخط کی عظمت و فضیلت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اسے توقیفی قرار دیا جائے۔ اس ضمن میں علماء کے بکثرت اقوال نقل کیے گئے ہیں کہ اس رسم الخط کا التزام ضروری ہے۔

---

[1] زرکشی نے البرہان، ج ۱، ص ۳۸۰ پر ابو العباس مراکشی المعروف بابن البناء کی کتاب "عنوان الدلیل فی مرسوم خط التنزیل" سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ غلو و تکلف پر مبنی ہے۔

[2] خلافت عثمانی میں جب صحابہ قرآن کریم مرتب کر رہے تھے تو ان کے مابین لفظ "التابوت" کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا کہ اُسے کس طرح لکھا جائے۔ حضرت زیدؓ نے کہا کہ "التابوۃ" لکھا جائے۔ قریشیوں نے "التابوت" تجویز کیا۔ جب یہ معاملہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو فرمایا:- "التابوت" لکھیے۔ اس لیے کہ قرآن قریش کی زبان میں اترا ہے۔

(البرہان، ج ۱، ص ۳۷۶)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

"واؤ ہو یا الف ہو یا یا ء کسی حرف کے لکھنے میں بھی عثمانی رسم الخط کی خلاف ورزی جائز نہیں"[1]

امام مالک سے دریافت کیا گیا تھا :-

"یہ فرمائیے کہ آج کل اگر کوئی شخص قرآن کریم لکھنا چاہے تو آیا لوگوں کے ایجاد کردہ جدید حروف ہجاء کے مطابق لکھ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا" میں اس کو درست تصور نہیں کرتا۔ اسے اس طرح لکھنا چاہئیے جیسے پہلے کاتبوں نے لکھا تھا"[2]

شافعی و حنفی فقہ میں ایسے اقوال بکثرت منقول ہیں۔ مگر کسی امام نے بھی یہ نہیں کہا کہ عثمانی رسم الخط توقیفی یا سر ازلی ہے۔ علماء نے عثمانی رسم الخط کے التزام کو اس لیے ضروری قرار دیا تھا تاکہ امت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ اور پوری ملت ایک ہی شعار و اصطلاح کی پابند ہو۔ اس لیے کہ یہ رسم الخط حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وضع کردہ ہے۔ حضرت زید بن ثابت رض نے اس کو رواج دیا۔ جناب زید رض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امین اور کاتب وحی تھے۔

مذکورہ صدر بیانات کے بالکل برعکس بعض علماء نہ صرف عثمانی رسم الخط کی خلاف ورزی کو مباح قرار دیتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ ایک اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہے اور توقیفی نہیں ہے۔ ان علماء کے سرخیل قاضی ابوبکر باقلانی[3] ہیں۔

قاضی موصوف اپنی کتاب "الانتصار" میں رقم طراز ہیں :-

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۸۳ -

[2] المقنع للدانی ص ۱۰ نیز الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۸۳ - امام مالک کا قول المقنع سے نقل کیا گیا ہے نیز دیکھیے البرہان، ج ۱۔ ص ۳۷۹ -

[3] محمد بن الطیب الباقلانی مصنف "اعجاز القرآن" ۴۰۳ھ میں فوت ہوئے۔ (وفیات الاعیان ج ۱۔ ص ۴۸۱ نیز شذرات الذہب، ج ۲۔ ص ۷۵ -)

"جہاں تک قرآن کریم کی کتابت کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں اُمّت پر کچھ بھی فرض تعین کیا۔ چنانچہ اس نے قرآن کریم کے لکھنے والوں کو کسی خاص رسم الخط کا پابند نہیں کیا کہ اس کے سوا دوسرا کوئی خط جائز نہ ہو۔ اس لیے کہ وجوب کا مدار انحصار نصوص پر ہے۔ قرآن میں ایسی کوئی نص موجود نہیں کہ قرآن کریم کو ایک خاص رسم الخط ہی میں لکھا جا سکتا ہے۔ اور اس سے تجاوز کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ کسی حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس پر اُمت کا اجماع بھی منعقد نہیں ہوا۔ شرعی قیاسات بھی اس پر دلالت نہیں کرتے۔ بخلاف ازیں سنّت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو رسم الخط بھی آسان ہو اس میں لکھ لیا جائے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا حکم دیتے تھے اور یہ نہیں فرماتے تھے کہ فلاں رسم الخط میں لکھو اور فلاں میں نہ لکھو۔ یہی وجہ ہے کہ سب مصاحف ایک ہی خط میں نہیں لکھے گئے تھے۔ چنانچہ بعض کاتب لفظ کو اس کی اصلی حالت میں لکھتے تھے۔ بعض اس لیے اس میں کمی بیشی کر دیتے تھے کہ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطِ کوفی میں لکھنے کو بھی جائز قرار دیا گیا۔ اسی طرح لام کو کاف کی صورت میں بھی لکھنا درست ہے۔ الف کو ٹیڑھا کر کے بھی لکھ سکتے ہیں اور دوسری طرح بھی۔ قرآن کو قدیم خط اور قدیم حروف تہجی کے مطابق بھی تحریر کر سکتے ہیں اور جدید انداز میں بھی ان دونوں طریقوں کے بین بین بھی لکھ سکتے ہیں۔

جب قرآن کے خطوط و حروف مختلف اور باہم متغائر الشکل تھے۔ اور لوگوں نے عام اجازت دے رکھی تھی کہ ہر شخص حسب عادت جو صورت اس کے لیے آسان تر اور مفید تر ہو اس میں لکھے۔ ان میں سے کوئی صورت بھی نہ گناہ ہے نہ اجنبی اور بے گانہ۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں پر اس ضمن میں ایسی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ جس طرح قراءت، اذان اور دیگر

شرعی امور میں ان کو پابند کیا گیا تھا - اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط علامات و رسوم کی حیثیت رکھتے ہیں - اور یہ اسی طرح اشارات کا کام دیتے ہیں جیسے عقود[1] دوال و رموز وغیرہ - للذا ہر رسم الخط جو کسی کلمہ پر دلالت کرتا ہو، اور وہ کلمہ بسہولت پڑھا جاسکتا ہو تو وہ رسم الخط درست ہے - خواہ اس کی شکل و صورت کیسی بھی ہو -

خلاصۂ کلام یہ کہ جو شخص اس بات کا مدعی ہو کہ لوگوں کے لیے ایک خاص رسم الخط کی پیروی ضروری ہے - اس پر اس امر کے اثبات کے لیے دلیل پیش کرنا لازم ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دلیل پیش کرنے سے قاصر رہے گا[2] (انتہی بیانہ)

قاضی ابوبکر باقلانی کا مذکورہ صدر بیان قابل اخذ و احتجاج ہے - آپ کی بیان کردہ دلیل روشن اور نگاہ عمیق ہے - وہ ایک جانب علماء سلف کی قدر و منزلت کا خیال رکھتے ہیں - تو دوسری طرف کتاب اللہ کے رسم الخط سے متعلق امر پر دلیل و برہان کا مطالبہ بھی کرتے ہیں - بخلاف ازیں جو لوگ قرآنی رسم الخط کو ازلی اور توقیفی قرار دیتے ہیں - وہ نہ صرف جذبات سے کام لیتے بلکہ اپنے عواطف و احساسات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں - ظاہر ہے کہ کسی کا ذوق یا جذبہ شرعی امور میں فیصلہ کن ثابت نہیں ہو سکتا - اور نہ اس سے کوئی شرعی حقیقت ثابت ہوتی ہے -

ہم قرآنی رسم الخط کے بارے میں ایک قدم اور آگے بڑھتے اور کہتے ہیں کہ باقلانی کے پیش کردہ دلائل و براہین کی بناء پر اس کی مخالفت نہیں کی جاسکتی بخلاف ازیں ہم محدث العز بن عبدالسلام کے قول پر عمل کرتے ہیں - آپ فرماتے ہیں :-

---

[1] عقود یعنی ہاتھ کی گرہیں جن سے عرب خاص تعداد کی جانب اشارہ کرتے ہیں - رموز کا واحد رمز ہے - یعنی اشارات مثلاً بعض جگہ اشارہ کرنے کے لیے ہاتھ بنا دیتے ہیں، یا اشارہ کرنے کے لیے کوئی پتھر نصب کر دیتے ہیں - (غلام احمد حریری)

[2] زرقانی نے مناہل العرفان، ج ۱ ص ۳۷۳-۳۷۴ پر اس کا خلاصہ پیش کر کے اس کی تردید کی اور اس ضمن میں علماء کے متعدد اقوال پیش کیے ہیں - (مناہل العرفان، ج ۱ ص ۳۷۴-۳۸۰)

"آج کل پرانے رسم الخط کے مطابق قرآن کی کتابت درست نہیں۔ کیونکہ اس سے علم کے مٹ جانے کا خطرہ درپیش ہے۔ جو چیز قدماء کے یہاں رائج اور معروف ہو۔ اس کو جہلاء کے کہنے پر ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اور خدا کی زمین اس کے نیک بندوں سے خالی نہیں ہے[1]"

آخری رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ عوام الناس قرآن کریم کو اس کے قدیم رسم الخط میں پڑھ نہیں سکتے۔ اس لیے مستحسن بلکہ ضروری ہے کہ ان کے لیے قرآن کریم کو جدید رسم الخط میں شائع کیا جائے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عثمانی رسم الخط کو گلدستۂ طاقِ نسیان بنا دیا جائے۔ کیونکہ اس کے مٹانے سے ایک ایسے دینی شعار کا محو ہو جانا لازم آتا ہے جس پر اُمت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اور جس کی وجہ سے امت افتراق و انشقاق کی نذر ہونے سے بچ گئی۔ ملتِ اسلامیہ میں ہر وقت ایسے علماء موجود رہے ہیں۔ جو عثمانی رسم الخط میں اس دقیق فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ مجلۃ الازہر میں لکھا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے جو نسخے شائع کیے جائیں ان کے ہر صفحہ پر جن الفاظ کا اندازِ تحریر عصر حاضر کے رسم الخط اور طرز املاء سے مختلف ہو حاشیہ پر اس کی وضاحت کر دی جائے[2]

---

[1] البرھان، ج ۱۔ ص ۳۷۹۔

[2] امام سیوطی نے قرآنی رسم الخط کو چھ[6] قواعد میں محدود و محصور قرار دیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:۔
حذف[1]۔ زیادت[2]۔ الہمز[3]۔ البدل[4]۔ الفصل[5]۔ الوصل[6]۔
جس لفظ کے بارے میں دو قراءتیں منقول ہوں اس کو دونوں میں سے ایک قراءت کے مطابق لکھا جائے (الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۸۳۔ ۲۸۹) زرقانی نے یہ مکمل بحث اپنی کتاب مناہل العرفان، ج ۱۔ ص ۳۶۲۔ ۳۶۶ پر نقل کی ہے۔ ان قواعد سے باخبر ہونا نہایت ضروری ہے۔

فصل ہشتم

محکمات ومتشابہات

محکمات ومتشابہات سورۂ آل عمران کی روشنی میں :-

اگر قرآن کے محکم ہونے سے یہ مراد لیا جائے کہ اس کی آیات میں اس حد تک ضبط و اتقان اور اس کے نظم میں اس قدر حسن وجمال پایا جاتا ہے کہ اس کے الفاظ ومعانی میں ضعف کے پیدا ہونے کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔ تو اس کی تائید مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے۔ قرآن میں فرمایا :-

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ[1] — یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکمات ہیں۔

اس اعتبار سے سارا قرآن محکم ہے۔

اور اگر متشابہات سے مراد یہ ہو کہ آیات قرآنیہ اعجاز وبلاغت میں باہم ملتی جلتی ہیں اور اس کے اجزاء میں تقابل نہیں کیا جاسکتا۔ تو سارا قرآن متشابہ ٹھہرے گا۔ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل آیت میں ملتا ہے قرآن میں فرمایا :-

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا[2] — اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام کو ملتی جلتی کتاب کی صورت میں اتارا۔

نظریں مذکورہ صدر دونوں آیتوں میں جس محکم ومتشابہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر سورۂ آل عمران کی مندرجہ ذیل

1۔ سورۂ ہود، آیت نمبر ۱۔

2۔ سورۃ الزمر، آیت نمبر ۲۳۔

آیت پر اظہار خیال کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :۔

هُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ	وہ اسی کی ذات ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری
مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ	اس میں آیات محکمات ہیں۔ وہ اصل کتاب
الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا	ہیں اور کچھ متشابہات بھی ہیں۔ جن لوگوں کے
الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ	دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے
مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ	چلتے ہیں فتنہ اور تاویل کی تلاش کے لیے
ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ	حالانکہ اس کی تاویل کو خدا کے سوا کوئی نہیں
اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ	جانتا۔ جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں
يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ	سب آیتیں خدا کی طرف سے ہیں اور صرف
رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ [1]	عقلمند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ محکم اور متشابہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح راسخین فی العلم ان لوگوں کے حریف مقابل ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے۔ محکم اور متشابہ کے اسی تقابل نے علماء کو ان کی تعریف کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے مختلف اور متعدد نظریات و افکار کا اظہار کیا ہے [2] مگر سب نظریات کا لب لباب اور خلاصہ ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ

محکم :۔ وہ ہے جو اپنے معنی و مفہوم پر دلالت کرنے میں واضح ہو اور اس میں کوئی خفاء و اشتباہ نہ ہو۔ نص اور ظاہر بھی اس میں شامل ہیں۔ کیونکہ نص وہ ہے جس کو راجح اور منیادر معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ اس لیے نص کا مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے۔

---

[1] سورۂ آل عمران۔ آیت نمبر ۷۔

[2] الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۔ ۳۔

متشابہ :- وہ ہے جو اپنا معنی و مفہوم ظاہر کرنے میں واضح نہ ہو۔

مُجمل، مُؤوّل اور مُشکل سب متشابہات میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ مجمل کے لیے تفصیل درکار ہوتی ہے۔ مُؤوّل تاویل کے بعد اپنے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ مشکل اپنے معنی پر دلالت کرنے میں واضح نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں التباس و ابہام پایا جاتا ہے[1]۔

چونکہ محکم اپنا مطلب بیان کرنے میں واضح ہوتا ہے اس لیے اس پر بحث و تمحیص کی حاجت نہیں ہے۔ بخلاف ازیں متشابہات پر بحث کرنے کی ضرورت اس لیے لاحق ہوتی ہے کہ ان کا مفہوم واضح نہیں ہوتا لہٰذا متشابہات سے اجتناب کرنے کے لیے ان سے قارئین کو روشناس کرانا ضروری ہے۔

اکثر علماء کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اس نظریہ کے حامل علماء لفظ "اللہ" پر وقف کرتے ہیں۔ راسخین فی العلم قرآن کی تاویل پر ایمان رکھتے اور کہتے ہیں کہ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔

مگر ابوالحسن اشعری مذکورہ صدر آیت میں "والراسخون فی العلم" پر وقف کرتے تھے۔ جس سے آیت کے معنی یہ ٹھہرتے ہیں کہ راسخین فی العلم بھی متشابہات کی تاویل سے آگاہ ہیں۔ ابواسحاق شیرازی[2] اس کی توضیح و تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"کوئی چیز ایسی نہیں جس کے علم کو خدا نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص کر لیا ہو۔ بلکہ علماء کو ہر چیز کے علم سے آگاہ کر دیا ہے۔ یہ آیت علماء کی مدح و ستائش میں وارد ہوئی ہے۔ اگر وہ متشابہات کی تاویل سے آشنا ہوتے تو ان میں اور عوام میں کوئی فرق و امتیاز ہی نہ ہوتا"۔

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۵۔

[2] ابواسحاق شیرازی کا نام محمد بن علی بن یوسف تھا۔ مناظرہ میں شہرت رکھتے تھے آپ کی مشہور ترین تصنیف اصول الفقہ میں "التبصرہ" ہے ۴۷۶ھ میں فوت ہوئے (طبقات السبکی، ج ۳۔ ص ۸۸۔

متشابہات کی تین اقسام :-

امام راغب اصفہانی نے ایک معتدل راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ متشابہات کو تین قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔

۱۔ ایک قسم کی متشابہات وہ ہیں جن کا جاننا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مثلاً قیامت کا وقت دابۃ الارض کا نکلنا۔

۲۔ ایک قسم وہ ہے جس سے آگاہ ہونے کے لیے انسان کے پاس وسائل موجود ہیں۔ مثلاً الفاظِ غریبہ اور احکام مغلقہ وغیرہ۔

۳۔ تیسری قسم وہ ہے جو دونوں کے درمیان ہے۔ اس سے بعض علماء راسخین واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل ارشاد میں اسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آپ نے حضرت ابن عباس کے حق میں دعا کی۔

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ۔[1] — اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا کر اور اس کو تاویل سکھا دے۔

اس میں شبہ نہیں کہ امام راغب کا نقطۂ نگاہ اعتدال سے قریب تر ہے۔ جہاں تک خدا کی ذات وصفات کا تعلق ہے اس کے سوا ان سے کوئی بھی آگاہ و آشنا نہیں ہے۔ اسی لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے وقت فرمایا کرتے تھے۔

"اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ۔" — تو ایسا ہی ہے جیسے تو نے خود اپنی مدح وثنا بیان کی ہے۔ میں تیری تعریف کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

مندرجہ ذیل آیت کے پیش نظر علم غیب خاصۂ خداوندی ہے۔

---

[1] الاتقان ج ۲ ص ۷۔ راغب اصفہانی کا نام حسین بن مفضل ابوالقاسم تھا۔ آپ عظیم ادیب تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف "مفردات القرآن" ہے۔ آپ ۵۰۲ھ میں فوت ہوئے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ	قیامت کا علم خدا کے پاس ہے ۔ وہ بارش اتارتا ہے
وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي	رحم میں جو کچھ ہو وہ اس سے بھی آگاہ ہے ۔ کوئی
الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا	شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کرے گا ۔ اور
تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ	کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی
بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ	بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے
خَبِيْرٌ ۔[1]	والا ہے ۔

سورتوں کے ابتدائی الفاظ (فواتح السّوَر) کی بحث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کی تاویل و تفسیر سے کس طرح دامن بچایا جاتا ہے ۔ اور ان پر ستر و حجاب کی ایک فضا چھائی رہتی ہے ۔ ہم یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ علماء نے ان کے بارے میں جو بحث کی ہے وہ ان کی حکمتِ وجود سے متعلق ہے ۔ ان کی کنہ و حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ ان کے مطالب و معانی کی پوشیدگی میں یہ مصلحت پائی جاتی ہے کہ انسان ان کے سامنے اپنے آپ کو بے کس و بے بس پا کر اپنی گردنِ تسلیم جھکا دے گا ۔ اور اس کے کبر و غرور میں کمی آئے گی ۔ اور وہ پکار اُٹھے گا کہ :۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا	تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر جو تو سکھا دے
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۔[2]	بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے ۔

صفاتِ باری میں علماء کے مذاہب :

وہ پیچیدہ آیات جو صفاتِ باری کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں ۔ متشابہات کی اس قسم سے تعلق رکھتی ہیں جن کے معنی و مفہوم سے کوئی بشر آگاہ نہیں ہے ۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ اس قسم کی نہایت اہم شاخ ہے ۔ مشہور عالم ابن اللبان نے ان کے ذکر و بیان میں ایک کتاب "ردّ المتشابہات

---

[1] سورۂ لقمان، آیت نمبر ۳۴ ۔

[2] سورۃ البقرۃ، آیت نمبر ۳۲ ۔

الی الآیات المحکمات[1]" نامی تصنیف کی ہے۔ مثلاً یہ آیت:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى — رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا۔

امام رازی متشابہ صفات کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قرآن خواص ہوں یا عوام سب کو دعوت دیتا ہے۔ عوام حقائق کی تہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جب عوام میں سے کوئی شخص پہلی مرتبہ ایک ایسی ذات (ذاتِ باری) کا حال سنتا ہے۔ جو نہ تو جسم رکھتی ہے۔ نہ متحیز ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ تو عدم اور نفی محض کی دلیل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کو صفات سے عاری (تعطیل) خیال کرنے لگتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ خدا کو ایسے الفاظ سے پکارا جائے جو لوگوں کے وہم و خیال کے مطابق ہوں۔ اور ایسی چیز سے مخلوط ہوں جو حقِ صریح پر دلالت کرتی ہو۔ پہلی قسم یعنی جس کے ساتھ باری تعالیٰ کو آغازِ کار میں پکارا جاتا ہے۔ متشابہ کہلاتی ہے۔ دوسری قسم جو حقِ صریح کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کو محکم کہتے ہیں[2]"

متشابہ صفات کے بارے میں علماء کے چند مذاہب ہیں۔

۱۔ طریق سلف:-

علمائے سلف کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ متشابہات پر ایمان لا کر ان کی حقیقت کا علم خدا کو سونپ دیا جائے۔

امام مالک رحمہ اللہ سے جب استواء علی العرش کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ — استواء معلوم ہے مگر اس کی کیفیت معلوم نہیں اس کے بارے میں پوچھنا بدعت ہے۔ میں

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۸۔ ابن اللبان کا نام نامی محمد بن احمد بن عبدالمؤمن اسعردی شمس الدین ہے آپ دمشق کے رہنے والے عظیم مفسر تھے ۷۴۹ھ میں وفات پائی۔ ان کی تفسیر کا قلمی نسخہ محفوظ ہے (الاعلام، ج ۳ ص ۸۵۳)

[2] مناہل العرفان زرقانی، ج ۲۔ ص ۱۷۹۔

اَظُنُّكَ رَجُلَ سُوءٍ اَخرجوه عنّی[1] تجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔ اس کو یہاں سے نکال دو۔

۲۔ مذہبِ خلف :۔

صفات کے بارے میں متاخرین کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ جس لفظ کا ظاہری اطلاق ذاتِ ربانی پر محال ہو اس کی مناسب تاویل کی جائے۔ یہ مذہب امام الحرمین[2] اور علماء متاخرین کی ایک جماعت کی جانب منسوب ہے۔

مذکورہ صدر دونوں نقطہ ہائے نظر کی توضیح کے لیے ہم چند قرآنی آیات پیش کرتے ہیں :۔

۱۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى[3] رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا۔

۲۔ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا[4] تیرا رب اور فرشتے قطار اندر قطار آئیں گے۔

۳۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ[5] وہ اپنے بندوں پر زبردست ہے۔

۴۔ يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ[6] افسوس ہے اس تقصیر پر جو خدا کی ذات کے بارے میں مجھ سے سرزد ہوئی۔

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۸ محدث دارمی نے سلیمان بن یسار سے روایت کیا ہے کہ ابن صبیغ نامی ایک شخص مدینہ آیا اور متشابہات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے اس کو سزا دینے کے لیے کھجور کی چھڑیاں منگوائیں۔ اس کو بلا کر پوچھا تم کون ہو؟ کہا میرا نام عبداللہ بن صبیغ ہے آپ نے چھڑی سے اسے اتنا مارا کہ سر سے خون بہنے لگا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ کوئی شخص اس کی صحبت میں نہ رہے (الاتقان، ج ۲۔ ص ۵۔)

[2] امام الحرمین کا نام و نسب عبدالملک بن ابی عبداللہ بن یوسف بن محمد جوینی شافعی عراقی اور کنیت ابوالمعالی ہے آپ امام غزالی کے استاد اور اصحاب شافعی میں جلیل القدر عالم تھے ۴۷۸ھ میں فوت ہوئے۔ (وفیات الاعیان، ج ۱۔ ص ۲۸۷)۔

[3] سورۂ طٰہٰ۔ ۵

[4] سورۃ الفجر۔ ۲۲

[5] سورۃ الانعام۔ ۶۱

[6] سورۃ الزمر۔ ۵۶۔

۵۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ[1] ۔ اور تیرے خدا کی ذات باقی رہے گی ۔

۶۔ وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي[2] تاکہ میرے سامنے تجھے پالا جائے ۔

۷۔ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ[3] خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے ۔

۸۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ[4] اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے ۔

ان آیات کے بارے میں علمائے سلف کا نقطۂ خیال یہ ہے کہ وہ ان ظواہر کی نسبت ذاتِ خداوندی کی طرح محال سمجھتے ہیں ۔ان کی رائے ہے کہ ان پر ایمان لا کر ان کی حقیقت و اصلیت کے علم کو خدا کی طرف سونپ دیا جائے ۔

بخلاف ازیں متاخرین تاویل سے کام لیتے ہیں ۔ان کی تاویلات کا حاصل یہ ہے :۔

۱۔ استواء سے معنوی بلندی[5] مراد ہے ۔

۲۔ خدا کے آنے سے اس کے حکم کا نزول مقصود ہے[6]

۳۔ فوقیت سے مرتبہ کی بلندی مراد ہے[7]

۴۔ جنب اللہ سے خدا کا حق مقصود ہے[8]

۵۔ وجہ اللہ سے خدا کی ذات مراد ہے[9]

۶۔ عین سے عنایت ربانی مراد ہے[10]

---

[1] سورۃ الرحمٰن ۔ ۲۷ [2] سورۃ طٰہٰ ۔ ۳۹

[3] سورۃ الفتح ۔ ۱۰ [4] سورۂ آل عمران ۔ ۲۸

[5] اکثر مفسرین خلف نے استواء سے یہی معنی مراد لیے ہیں ۔(الاتقان ،ج ۲ ۔ص ۱۰۹ ،نیز البرھان ،ج ۲ ۔ص ،۸۰ ۔۸۲) ۔

[6] البرھان ،ج ۲ ۔ص ۸۳ ۔ابن الجوزی نے قاضی ابو یعلیٰ سے نقل کیا ہے کہ امام احمد نے خدا کے آنے سے اس کے حکم کا آنا مراد لیا ہے ۔اس کی دلیل یہ آیت ہے ۔ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ (سورۃ النحل ۔ ۳۳) دیکھیے البرھان ،ج ۲ ۔ص ۷۹ ۔

[7] الاتقان ،ج ۲ ۔ص ۱۲ ۔ [8] حوالہ مذکور ۔

[9] البرھان ،ج ۲ ۔ص ۸۶ ۔ [10] الاتقان ،ج ۲ ۔ص ۱۱ ۔

۷۔ ید (خدا کا ہاتھ) سے خدا کی قدرت مراد لی گئی ہے[1]

۸۔ نفسِ خداوندی سے سزا مراد ہے[2]

۹۔ قرآن میں جہاں کہیں خدا کی محبت وحیا یا اس کے قہر وغضب کا ذکر ہے متاخرین اس کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان افعال کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی جاسکتی اس لیے قرآن میں ان کے مجازی معنی یعنی لوازم مراد ہوں گے[3]

ابن اللبان اپنی کتاب "ردّ الآیاتِ المتشابہات" میں ان آیات کے نازل ہونے کی حکمت ومصلحت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"ظاہر ہے کہ بندوں کے افعال اگرچہ ذاتِ خداوندی کی جانب منسوب ہوں تاہم ان میں اعضاء کی وساطت ضروری ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صفاتِ الٰہی کے دو مظہر ہیں:۔

۱۔ ایک وہ مظہر ہے جو بندوں کی طرف منسوب ہے۔ اور وہ صُوَر اور جسمانی اعضاء ہیں۔

۲۔ دوسرا وہ حقیقی مظہر ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ دراصل جو مظاہر بندوں کی جانب منسوب ہیں ان کا اطلاق باری تعالیٰ پر کیا گیا ہے۔ تاکہ بندوں کی سمجھ میں آجائے۔ اور وہ ان سے مانوس ہوں"

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان دونوں قسموں سے آگاہ کیا اور بتایا ہے کہ وہ دونوں حالتوں میں اعضاء سے منزہ ہے۔ پہلی قسم کے بارے میں فرمایا:۔

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ۔	ان سے لڑائی کیجیے اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے انہیں سزا دے گا۔

---

[1] حوالہ مذکور۔ [2] البرہان، ج ۲۔ ص ۸۲۔

[3] الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۲۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ بندوں کے ہاتھوں سے جو کام بھی انجام پاتا ہے وہ خدا کی طرف منسوب ہے۔ دوسری قسم کے بارے میں صحیح مسلم کی حدیث میں ارشاد فرمایا :-

"کثرتِ نوافل سے بندہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے چاہنے لگتا ہوں۔ میں جب اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے"

(آخر تک)

قرآن کریم میں فرمایا :-

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ۔	جو آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں۔

نیز فرمایا :-

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔	جب آپ نے تیر چلایا تو وہ دراصل آپ نے نہیں بلکہ خدا نے چلایا۔

(ابن اللبان کا بیان ختم ہوا)

ابن اللبان نے اپنے بلند پایہ ادبی ذوق سے یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی سعی کی ہے کہ دینی حقائق کو اگر کنایہ کے انداز میں بیان کیا جائے تو ان کا حسن و جمال دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معنوی اور غیر مادی افکار و معتقدات انسان کے ذہن پر محسوس و مبصر صورت میں مرتسم ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح آنے والے ازمنہ و اقوام تک یہ بلند پایہ حقائق منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

غالباً قرآن حکیم میں متشابہات کو شامل کرنے اور محکمات تک محدود نہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام اپنی توجہات کو ایسے علوم و فنون کی جانب مبذول کریں۔ جن سے

ؔ مناہل العرفان زرقانی، ج ۲ - ص ۱۹۳ - ۱۹۴ -

ان میں متشابہات کے فہم وادراک کی اہلیت وصلاحیت ابھا گر ہو۔ وہ تقلید کی تاریکی سے چھٹکارا حاصل کرسکیں۔ اور عجز و نیاز اور غور وفکر کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کریں[1]

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۵۔

بَابُ چہَارم

تفسیر و اعجاز

فصل اوّل

علمِ تفسیر

تفسیر کا نشو و ارتقاء :

اس میں شبہ نہیں کہ فنِ تفسیر کو موجودہ حالت تک پہنچنے میں مختلف و متعدد مراحل و ادوار سے گزرنا پڑا۔ عصرِ حاضر میں کتب تفسیر زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ اور بہت سی تاہنوز غیر مطبوعہ پڑی ہیں۔

تفسیر کا آغاز پہلے پہل عہدِ رسالت میں ہوا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے اوّلین شارح و ترجمان تھے۔ قرآن کا جو حصہ نازل ہوتا آپ اس کی ترجمانی فرماتے۔ عہدِ رسالت میں آنحضور کے حینِ حیات صحابۂ کرام تفسیر قرآن کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اس عظیم بار کے کفیل تھے۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ آخرت کو تشریف لے گئے۔ تو قرآنی اسرار و رموز سے آگاہ و آشنا صحابہ کے لیے اپنے علم کے اظہار اور آنحضور سے حاصل کردہ معلومات کے کشف و توضیح کے سوا چارہ نہ تھا۔

یوں تو ماہرِ تفسیر صحابہ کثیر التعداد تھے۔ مگر اس ضمن میں دس صحابہ کو خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے اسماءِ گرامی حسبِ ذیل ہیں :۔

حضرت ابوبکر صدیق۔ حضرت عمر فاروق۔ حضرت عثمان غنی۔ حضرت علی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود۔ حضرت عبداللہ بن عباس۔ حضرت ابی بن کعب۔ حضرت زید بن ثابت۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین۔

تفسیری روایات سب سے زیادہ حضرت علیؓ سے منقول ہیں۔ خلفاء ثلاثہؓ سے بہت کم روایات منقول ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تینوں حضرات نے حضرت علیؓ سے پہلے وفات پائی تھی[1]

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ :

عشرہ صحابہ میں سے مفسر کہلانے کے سب سے زیادہ اہل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھے۔ ان کے حق میں حضورؐ نے دعا فرمائی تھی کہ:

"اے اللہ! اس کو دین کا فہم اور تفسیر قرآن کا علم عطا کر"[2]

حضورؐ نے ان کو ترجمان القرآن کا لقب عطا کیا تھا[3]۔ مگر لوگوں نے ابن عباس سے روایت کرنے میں بڑی زیادتی کی۔ اور بعض نے کچھ باتیں گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

"حضرت ابن عباسؓ سے صرف ایک صد تفسیری اقوال ثابت ہیں"[4]

مذکورہ صدر دسؓ صحابہ کے علاوہ درج ذیل صحابہ سے بھی تفسیری اقوال منقول ہیں۔ اگرچہ وہ اقوال اتنے زیادہ نہیں ہیں:۔

ابوہریرہ۔ انس بن مالک۔ عبداللہ بن عمر۔ جابر بن عبداللہ۔ اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

عہدِ تابعین میں مفسرین :

اسلامی بلاد و دیار میں تابعین میں ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے صحابہ کرام سے اخذ استفادہ کیا۔ چنانچہ ایسے مفسرین مکہ مدینہ اور عراق میں موجود تھے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

"اہل مکہ سب سے بڑے تفسیر دان تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ

---

[1] الاتقان، ج ۱۔ ص ۳۱۸ [2] البرھان، ج ۲۔ ۳۴ ،۱۶۱
[3] الاتقان ج ۱ ص ۲۱۱۔ [4] الاتقان۔ ج ۲ ص ۳۲۲۔

کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ مثلاً مجاہد[۱]۔ عطاء بن ابی رباح[۲]۔ عکرمہ[۳] مولیٰ ابن عباس۔ سعید بن جبیر[۴] اور طاؤس[۵] وغیرہم۔ اسی طرح کوفہ میں المسوب ابن مسعودؓ اقامت گزین تھے۔ مفسرین کی ایک جماعت مدینہ میں بودوباش رکھتی تھی۔ مثلاً زید بن اسلم جن سے ان کے فرزند عبدالرحمٰن بن زید اور امام مالک بن انسؒ نے استفادہ کیا ہے[۱]

اتباعِ تابعین اور علمِ تفسیر:

تابعین سے یہ فیض اتباعِ تابعین نے حاصل کیا۔ چنانچہ انہوں نے متقدمین کے تفسیری اقوال جمع کر کے کتب تفسیر تصنیف کیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اصحاب کے اسماء قابلِ ذکر ہیں:
سفیان بن عیینہ[۱]۔ وکیع بن الجراح[۲]۔ شعبہ بن حجاج[۳]۔ یزید بن ھارون[۴]۔ عبد بن حُمید[۵][۲]
گویا یہ لوگ ابن جریر[۶] طبری کے پیش رَو تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو مفسرین ابن جریر کے بعد آئے وہ ان کی مساعی جمیلہ کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کے بعد تفسیر نویسی میں مختلف اور متبائن قسم کے رجحانات پیدا ہوئے۔

تفسیر بالماثور = چنانچہ تفسیر نویسی کا ایک انداز وہ ہے جس کو "تفسیر بالماثور" کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ تابعین اور ان کے اتباع کے اقوال نقل کر دیے جائیں۔

تفسیر بالرأی :-

ایک طرز تفسیر کا نام "تفسیر بالرأی" تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس کی بعض قسمیں ممدوح اور بعض مذموم ہیں۔ اگر یہ تفسیر قرآنی ہدایت کے

---

[۱] امام سیوطی نے یہ عبارت شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۲۳ پر نقل کی ہے۔

[۲] البرہان، ج ۱۔ ص ۱۵۹۔

[۳] طبقات المفسرین سیوطی ۳۰۔۳۱ و شذرات الذہب، ج ۲، ص ۲۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۰۱ ... بغداد ج

قریب ہو تو مدرج ہے اور اگر بعید ہو تو مدرم ہے۔

تفسیر ابن جریر طبری:

روایات و آثار کی مدد سے جو تفسیریں لکھی گئی ہیں ان میں سب سے بہتر ابن جریر طبری کی تفسیر ہے جس کا نام "جامع البیان فی تفسیر القرآن" ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صحابہ و تابعین کے اقوال مع اسانید تحریر کیے گئے ہیں۔ بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی گئی اور آیات سے بہت سے احکام بھی استنباط کیے گئے ہیں۔ اسی طرح وجوہِ اعراب سے بھی بحث کی گئی ہے۔ جس سے معانی کے فہم و ادراک میں مدد ملتی ہے۔ البتہ اسانید کے ذکر کرنے میں لوگوں پہ اعتماد کی وجہ سے بعض اوقات طبری سے غلطی بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بہت سے غیر صحیح اقوال نقل کر کے ان کے ضُعف سے آگاہ نہیں کیا۔

تفسیر ابن کثیر:

عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر قرشی دمشقی متوفی ۷۷۴ھ کی تفسیر ابن کثیر بھی ابن جریر طبری کے لگ بھگ بلکہ بعض وجوہ سے اس سے بھی بڑھ کر ہے اس کی خصوصیت سند میں دقتِ نظر عبارت کی سادگی اور وضاحت و صراحت ہے۔

الدر المنثور للسیوطی:

تفسیر بالروایۃ کے طرز و منہاج پر امام سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اپنی بیش قیمت تفسیر "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" مرتب کی تھی۔ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہوتا ہے۔ جناب امام نے اس کی تالیف میں احادیث صحیحہ پر اعتماد کیا تھا جو انسانی شرح و تفسیر کی نسبت کہیں بہتر ہیں۔

روایات کی مدد سے جو کتب تفسیر مرتب کی گئی ہیں ان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس لیے کہ ان میں روایاتِ صحیحہ و غیر صحیحہ کو بلا فرق و امتیاز یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہود اور فارس کے زنادقہ اسلامی تعلیمات ——————

کو بگاڑنے اور ان میں غیر اسلامی تعلیمات کو گھسیڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ گمراہ فرقے قرآن کے معانی و مطالب کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کے خواہاں رہتے تھے۔ لہٰذا تفسیری روایات ذکر کرنے والے مفسر پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ تعبیر و بیان اور روایات کے نقل و اخذ میں حد درجہ احتیاط سے کام لے۔

تفسیر بالرأی :

تفسیر بالرأی کے بارے میں علماء نے مختلف افکار و آراء کا اظہار کیا ہے۔ بعض اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور بعض جائز۔ مگر ان کے اختلاف کا حاصل یہ ہے کہ تفسیر بالرأی کی وہ قسم حرام ہے جس میں بلا دلیل و برہان وثوق کے ساتھ کہا جائے کہ خدا کی مراد یہ ہے یا یہ کہ مفسر قواعد لغت اور اصول شرع سے بے گانہ ہونے کے باوجود تفسیر قرآن کی جسارت کرے یا بدعات و اھواء کی تائید میں توڑ مروڑ کر قرآنی آیات کو پیش کرے۔

جب مفسر میں شروط مطلوبہ موجود ہوں تو تفسیر بالرأی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن بذاتِ خود تدبر آیات اور تعلیمات کے فہم و ادراک میں اجتہاد کی دعوت دیتا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا :-

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۔	آیا قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

نیز فرمایا :-

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ ۔	یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف اتارا تاکہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔

لہ سورۂ محمد - ۲۴ -

لہ سورۂ ص - ۲۹ -

امام سیوطی نے علامہ زرکشی کی کتاب البرھان سے وہ شروط نقل کی ہیں جن کا پایا جانا تفسیر بالرأی کی اباحت کے لیے ضروری ہے[1]۔ وہ حسب ذیل چار شرطیں ہیں :-

۱- پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، مگر ضعیف اور موضوع روایت نہ ہو۔

۲- صحابہؓ سے منقول ہو۔ اس لیے کہ قولِ صحابی کو بھی مرفوع کا درجہ حاصل ہے۔ بعض علماء کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اقوالِ صحابہ جو اسبابِ نزول کے بارے میں منقول ہوں۔ ان کو حدیث مرفوع کا درجہ حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس میں انسانی رائے کا کچھ دخل نہیں ہے۔

۳- لغت پر اعتماد کیا جائے، مگر آیات سے وہ معنی مراد نہ لیا جائے جو عرب میں کثیر الاستعمال نہ ہو۔

۴- مقتضیاتِ کلام سے استدلال کیا جائے۔ بشرطیکہ شرعی قانون اس پر دلالت کرتا ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کے لیے یہی دعا فرمائی تھی کہ "اے اللہ اس کو دین کا فہم عطا کر اور قرآن کی تاویل سکھا دے"۔

مشہور ترین تفاسیر:

مشہور ترین تفاسیر جن میں یہ شروط پائے جاتے ہیں حسب ذیل ہیں :-

۱- امام رازی[2] کی تفسیر جس کا نام "مفاتیح الغیب" ہے۔

۲- تفسیر بیضاوی المسمٰی "انوار التنزیل واسرار التاویل"۔

۳- تفسیر ابی السعود[3] اس کا نام "ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم" ہے۔

۴- تفسیر النسفی[4] اس کا نام "مدارک التنزیل وحقائق التاویل" ہے۔

---

[1] الاتقان، ج ۲- ص ۳۰۴ نیز البرھان، ج ۲- ص ۱۵۶-۱۶۱-

[2] امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ وفیات الاعیان ج ۱- ص ۴۷۴-

[3] محمد بن محمد بن مصطفیٰ بن احمد الطحاوی متوفی ۹۸۲ھ-

[4] ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود النسفی متوفی ۷۰۱ھ-

۵۔ تفسیر خازن[۱] اس کا نام "لباب التاویل فی معانی التنزیل" ہے۔

مذکورہ صدر تفاسیر کی خصوصیات

۱۔ تفسیر کبیر امام رازی :-

امام رازی نے اپنی تفسیر میں حکماء کا طرز و انداز اختیار کیا اور ان ہی کی طرح کلامی اور منطقی دلائل و براہین کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں۔ کونیات کی بحث میں انہوں نے خصوصی دلچسپی لی ہے وہ آیات کی تفسیر کرتے وقت ان کو چند مسائل میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ پھر ان کی تاویل و تفسیر کرتے ہوئے اہل السنت کے عقیدہ کی حمایت کرتے چلے جاتے ہیں۔

۲۔ تفسیر بیضاوی :

بیضاوی اہل السنت کے طریقہ پر دلائل و براہین پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ لغت کے قواعد و ضوابط بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ البتہ سورتوں کے اختتام پر ان کی فضیلت میں وہ جو احادیث پیش کرتے ہیں وہ اکثر ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ تفسیر بیضاوی کے متعدد حواشی لکھے گئے ہیں۔ ان میں شہاب خفاجی کا حاشیہ مشہور اور متداول ہے۔

۳۔ ابو السعود :

ابو السعود اپنی تفسیر میں اہل السنت کی تائید میں دلائل دیتے ہیں۔ اعجاز القرآن کے موضوع سے وہ خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب و انداز بڑا روشن اور ان کا ذوقِ بلاغت بڑا بلند ہے۔

۴۔ تفسیر نسفی :

تفسیر نسفی کا خاص موضوع اہل السنتہ والجماعتہ کی تائید اور اہل البدعتہ والاھواء کی تردید ہے۔ یہ تفسیر وجوہ اعراب و قرأت کی جامع ہے۔ نہایت مختصر عبارت میں اس

---

[۱] خازن کا نام علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی ہے آپ نے ۷۴۱ھ میں وفات پائی۔

میں قرآنی بلاغت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

د۔ تفسیر خازن:

یہ بڑی حد تک منقول دلائل پر مشتمل ہے۔ مگر اس میں اسانید مذکور نہیں۔ چونکہ یہ قصص و اسرائیلیات پر مشتمل ہے۔ اس لیے عوام اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔

تفسیر بالرائی جب جملہ شروط کی جامع ہونے کی بناء پر قابل ستائش ہو۔ مگر ایسی تفسیر بالماثور سے ٹکراتی ہو جو نص قطعی سے ثابت ہو۔ تو وہ تفسیر بالرأی ہرگز لائق تسلیم نہ ہوگی۔ اس لیے کہ رائے اجتہاد پر مبنی ہے۔ اور جہاں نص موجود ہو وہاں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ جب دونوں قسم کی تفسیر میں کسی قسم کا تعارض و تصادم نہ ہو تو دونوں ایک دوسری کی مؤید ہوں گی۔ کتب تفسیر میں اکثر یونہی ہوتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال نقل کیے گئے ہیں:۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ۔[1]

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ:۔

سابق وہ ہے جس کی نیکیاں بدیوں پر غالب ہوں۔ مقتصد وہ ہے جس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں۔ ظالم وہ ہے جو محرمات کا ارتکاب کرتا ہو۔

۲۔ دوسرے قول کے مطابق:۔

سابق مخلص کو مقتصد ریاکار کو اور ظالم ناشکری کرنے والے کو کہتے ہیں۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ:۔

سابق اس شخص کو کہتے ہیں جو صرف اعمال صالحہ انجام دیتا ہو۔ مقتصد وہ ہے جو اعمال صالحہ و قبیحہ دونوں کا فاعل ہو۔ ظالم وہ ہے جس کا معاملہ خدا کو سپرد کر دیا جائے۔ و دیگر اقوال[2]

[1] سورۂ فاطر۔ ۳۲ [2] دیگر اقوال کے لیے دیکھیے الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۰۶ نیز تفسیر ابن کثیر، ج ۳ ص ۲۵۴

یہ سب اقوال ایسے ہیں کہ ان میں باہم کوئی تعارض نہیں پایا جاتا۔

مختلف فرقوں کی تفاسیر:

مختلف اسلامی فرقوں کی تحریر کردہ تفاسیر بھی دراصل تفسیر بالرائی کی آئینہ دار ہیں۔ بلکہ وہ تفسیر بالرائی کی اس قسم میں شامل ہیں جو مذموم ہے۔ اس لیے کہ وہ تفسیریں دراصل انہوں نے بدعات و اھواء اور اپنے ذوق و وجدان کی تائید و حمایت کے لیے تحریر کی تھیں۔ چنانچہ فرقہ ہائے معتزلہ صوفیہ اور باطنیہ کی تفاسیر سب اسی زمرہ میں شامل ہیں۔

فرقہ معتزلہ کی تحریر کردہ تفاسیر پر عقلی اور کلامی چھاپ نمایاں ہے۔ معتزلہ کا مشہور ضابطہ ہے کہ:۔

"اچھی چیز وہ ہے جس کو عقل پسند کرے اور قبیح وہ ہے جو عقل کے نزدیک ناپسندیدہ ہو[1]"

کشاف:

معتزلہ کی تفاسیر میں احادیث نبویہ کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ وہ آیات کی تفسیر میں احادیث سے شاذ و نادر ہی احتجاج و استدلال کرتے ہیں۔ عقلی انداز پر تحریر کردہ تفاسیر کا بہترین نمونہ محمود بن عمر جاراللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ کی تفسیر کشاف ہے۔ یہ تفسیر بلاغی نکات اور بطریق سوال و جواب وجوہ اعجاز کے بیان کرنے میں منفرد حیثیت کی حامل ہے منقولات پر مشتمل تفاسیر میں اسرائیلیات کی جو بھرمار ہوتی ہے کشاف کا دامن اس سے پاک ہے۔ اس کی عبارت تصنع اور حشو و تطویل سے عاری ہے۔

کشاف کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ[2] کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

"یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ختم (مہر لگانے) کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب

---

[1] معتزلہ کے بارے میں دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بحث معتزلہ تیسرا ایڈیشن ج ۷، ص ۲؟

[2] سورۃ البقرہ - ۷

کیوں منسوب کیا؟ مہر لگانے کا فعل قبیح ہے۔ اور جب اس کو خداوند تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ افعالِ قبیحہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن میں وارد ہوا ہے کہ "میں بندوں پر ظلم نہیں کرتا"، نیز فرمایا کہ "ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنی ذات پر وہ خود ظلم کرتے تھے" ایک جگہ یوں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ فواحش و منکرات کا حکم نہیں دیتا"[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ ختم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بطور مجاز اور استعارہ کے کی گئی ہے۔ دراصل مہر لگانے والا کافر یا شیطان ہے۔ اس فعل کو ذاتِ خداوندی کی جانب منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ قدرت اس کو اسی نے دی۔ ورنہ بذات خود وہ یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔[2]

صوفیاء کی تفاسیر:

صوفیاء کی تفاسیر اکثر دُور از کار باتوں پر مشتمل ہیں جن کا قرآن سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اندازِ تحریر نہایت دقیق و عریض ہے۔ ان کے کلام کے فہم و ادراک پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے۔ جو بحرِ تصوف کا شناور ہو۔ ورنہ ان کا مطلب سمجھنا آسان نہیں۔

اس نوع کی مشہور ترین تفسیر وہ ہے جس کی نسبت شیخ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ کی طرف کی جاتی ہے۔ اگرچہ اکثر علماء اس نسبت کو درست قرار نہیں دیتے۔ ان کے خیال میں یہ تفسیر کسی اور نے تحریر کرکے ابن عربی کی جانب منسوب کر دی ہے۔ اس تفسیر کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے قرآن کریم میں فرمایا:۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ	بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار
نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ	کیا ہم ان کو آگ میں داخل کریں گے جب

[1] تفسیر کشاف، ج ۱۔ ص ۲۶-۲۷۔ [2] کشاف، ج ۱۔ ص ۲۸۔
[3] سورۃ النساء۔ ۵۵۔

بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا — ان کے چمڑے بدل جائیں گے تو ہم اور تبدیل
الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا — کر دیں گے تاکہ عذاب کا مزہ چکھیں بے شک
حَكِيْمًا ۔ — اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے ۔

محی الدین ابن عربی مذکورہ صدر آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :-

"كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا" سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے افعال و صفات کی تجلیات سے مستور و محجوب رہے ۔ اس لیے کہ آیت کے شروع میں آلِ ابراہیم کی صفاتِ علم و حکمت سے موصوف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے "

"سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ" آتش شوق مراد ہے ۔ اس لیے کہ ان کی طبیعتیں استحکام حجاب کے باوجود اپنی استعداد کی حد تک اس کو چاہتی تھیں ۔ یا ذات باری کی صفاتِ قہر کی آتشِ غضب مراد ہے ۔ یا نفوس کی حرص و ہوس اور طلب و شوق کی حدت و شدت کی آگ مراد ہے ۔ "كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ" یعنی جسمانی حجابات اٹھ جائیں گے "بَدَّلْنٰهُمْ" نئے حجابات عطا کریں گے "لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ" یعنی محرومی کی آگ کا مزہ چکھیں "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا" یعنی وہ ان کو مقہور و مغلوب کرے گا اور اپنے غضب کی آگ میں جلا کر ہمیشہ حصولِ سعادت سے محروم رکھے گا "حَكِيْمًا" چونکہ وہ حکیم ہے اس لیے ان کو ان کے حسبِ حال سزا دے گا ۔ جس طرح وہ شہوانی اور جسمانی لذات میں گرفتار تھے ۔ ان کو عذاب بھی اسی قسم کا دیا جائے گا "[1]

خلاصہ یہ کہ اس تفسیر پر ایسے وجدانی ذوق کا رنگ غالب ہے جس کی بنیاد حدیثِ نفسی پر رکھی گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اکثر عبارتیں گہرائی میں ڈوبی ہوئی ، مگر معنویت سے عاری ہیں ۔ اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ دینِ اسلام نہ اصحاب ذوق کا مرہونِ منت ہے اور نہ ارباب

[1] تفسیر الشیخ الاکبر ج ۱ ص ۱۵۲ ، یہ کتاب مطبع بولاق سے ۱۲۸۳ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی ۔

تفسیر روح المعانی :

تفسیر کی ایک قسم وہ بھی ہے جو تصوف کے نقطۂ خیال سے لکھی گئی تفاسیر سے ملتی جلتی ہے اس کو تفسیر اشاری کہتے ہیں۔ ایسی تفاسیر میں ظاہر معانی کی تاویل کر کے ان کو باطنی معانی سے ہم رنگ و ہم آہنگ بنایا جاتا ہے۔ علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ کی تفسیر روح المعانی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ پہلے آیات کا ظاہری مفہوم بتا کر ان کے پوشیدہ معانی پر روشنی ڈالتے ہیں جو بطریق رمز و اشارہ ان سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً آیت کریمہ :-

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ[1] ۝

کی تفسیر میں مفسر آلوسی نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے[2]۔

باطنیہ کی تفاسیر :

باطنیہ فرقہ کی تفاسیر میں قرآن کے باطنی پہلو کو اجاگر کر کے ظاہری معنی و مفہوم کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ درج ذیل آیت کریمہ سے استخراج کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں فرمایا :-

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَّهُ	ان کے درمیان ایک فصیل بنا دی گئی تھی جس کا
بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَ	ایک دروازہ بھی تھا۔ اس کی اندرونی جانب
ظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ[3]	رحمت اور ظاہری طرف عذاب تھا۔

باطنیہ کی تفاسیر ایسی تاویلات فاسدہ پر مشتمل ہیں جو شرعی اصول اور قواعد لغت دونوں کے خلاف ہیں۔ یہ تفاسیر اشاری اور صوفیاء دونوں قسم کی تفاسیر کی نسبت نسق قرآنی سے بعید تر ہیں۔ ویسے ظواہر قرآن کی مخالفت کے اعتبار سے تینوں قسم کی تفاسیر میں چنداں فرق

---

[1] سورۃ البقرۃ۔ ۶۳

[2] دیکھیے تفسیر روح المعانی ج۱۔ ص ۲۸۲

[3] سورۃ الحدید۔ ۱۳

امتیاز نہیں پایا جاتا۔ یہ تفاسیر ایسے معانی پر مشتمل ہیں جن کی کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی۔

یہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات خاص قسم کی تفاسیر کی جانب رجوع کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم کے بلاغی نکات سے بحث کرتے وقت ہم زمخشری کی کشاف مطالعہ کرتے ہیں۔ کلامی مباحث کے لیے امام رازی کی تفسیر کبیر دیکھتے ہیں۔ اعراب سے متعلق مباحث کے لیے ابو حیّان اندلسی متوفی ۷۴۵ھ کی تفسیر البحر المحیط کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ تفسیر نحو و تجوید سے متعلق مباحث کا گنجینہ ہے۔ اس میں تفسیر بالرائی سے احتراز کیا گیا ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس میں احادیث نبویہ بہت کم روایت کی گئی ہیں۔ اس لیے اس کو تفسیر بالماثور کے زمرہ میں شمار نہیں کر سکتے۔

موجودہ تفاسیر:

دورِ حاضر میں ہمارے بعض معاصر علماء نے قرآن کریم کی تفسیریں رقم کی ہیں جو جدت طرازی کی آئینہ دار ہے۔ ان میں ناکام ترین تفسیر طنطاوی جوہری کی "الجواہر فی تفسیر القرآن" ہے۔ اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ موجود ہے۔ علامہ سید محمد رشید رضا کی تفسیر المنار ایک خاص طرز و انداز کی حامل ہے اس میں آثار سلف کو پیش کرکے ان کو دورِ حاضر کے مقتضیات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ علامہ موصوف اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ مگر بعض اوقات وہ ضعیف اقوال کو لے کر ان کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ تاہم بحیثیت مجموعی وہ قرآنی ہدایت و اعجاز کی ترجمانی کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

سید قطب شہید رحمہ اللہ وغفرلہ، کی تفسیر ظلال القرآن قرآنی تعبیر و تصویر کے فہم و ادراک میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوتی ہے۔ مگر ان کا بڑا مقصد قرآنی مبادی و مقاصد کا کشف و اظہار ہے۔ اس لیے وہ تعلیم کی نسبت توجیہ سے قریب تر ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جب تفسیر بالروایات (تفسیر بالماثور)، کے ساتھ حسن استنباط اور قدرت ترجیح بھی شامل ہو۔ تو ایسی تفسیر سب تفاسیر کی نسبت زیادہ قابل اعتماد ہوگی۔ مگر

بایں ہمہ ہم صرف اسی تک محدود رہنے کا مشورہ نہیں دیتے۔ کسی آیت یا چند آیات کی تاویل و تفسیر کے لیے مختلف تفاسیر کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ مختلف تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم بڑی آسانی سے جانچ پرکھ سکتے ہیں کہ ان میں صحیح ترین رائے کون سی ہے۔ جب ہمیں موضوع زیر بحث کے بارے میں قطعی طور پر کوئی صحیح حدیث یا قول مل جائے گا تو ہم اس سے احتجاج کریں گے اور باقی آراء کو نظر انداز کر دیں گے۔ اس لیے کہ نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد کا سرے سے کوئی جواز ہی نہیں۔

فصل دوم

قرآن اپنی تفسیر آپ ہے

قرآن کا منطوق و مفہوم :-

جب مفسرین کوئی ایسی آیت دیکھتے جس کے معنی و مفہوم کے فہم و ادراک میں دوسری آیت سے مدد ملتی ہو تو وہ اکثر یہ قول دہراتے کہ "قرآن اپنی تفسیر آپ" ہے۔ تفسیر قرآن کا موزوں ترین طریق یہی ہے کہ امکانی حد تک قرآن کی تفسیر خود قرآن ہی سے کی جائے[1] اس لیے کہ باریک بینی جامعیت اور ہمہ گیری قرآنی دلالت کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ ہمیں قرآن میں جب کہیں عام مطلق یا مجمل آیت ملتی ہے تو دوسری جگہ اس کی تخصیص تقیید یا تفصیل مذکور ہوتی ہے[2]۔

قرآن کریم کی اس عمومی دلالت کا تقاضا یہ تھا کہ علماء ایسی مخصوص اصطلاحات وضع کرتے جن سے اس علامت کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہوتا جو ہر ایسے نظریہ میں نمایاں ہوتی جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم اسلامیہ میں قرآن کے منطوق و مفہوم عام و خاص مطلق و مقید مجمل و مفصل اور اس قسم کی دیگر اصطلاحات کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ پھر ان اصطلاحات کی تعریف کی گئی اور ان پر دلالت کرنے والے شواہد و نظائر پیش کیے گئے۔ مزید براں

---

[1] ارباب علم و فضل اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ امام المتکلمین سید المناظرین حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ دہلوی نے "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" کے قاعدہ کے مطابق پورے قرآن کریم کی ایک تفسیر "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" نامی عربی زبان میں تحریر کی تھی۔ یہ تفسیر زیور طبع سے آراستہ ہو گئی تھی۔ مگر اب نایاب ہے۔ یہ تفسیر حضرت مولانا مرحوم کا شاہکار ہے۔ اور اس کی دوبارہ اشاعت عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے۔ (غلام احمد حریری)

[2] البرہان، ج ۲۔ ص ۱۷۵۔

ان کے درس و مطالعہ میں علماء نے مختلف طور طریقے اختیار کیے۔ چنانچہ علماء اصول نے شرعی اساس پر ان کو جانچا پرکھا۔ متکلمین نے ان کو منطقیانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا بہت سے علماء نے ——— اور سر دست ہم بھی ان میں شامل ہیں ——— ان کو لغوی و ادبی پہلو سے ملاحظہ کیا۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کے طرزِ ادا و تعبیر کے ذوق آشنا ہو سکیں۔

مذکورہ صدر اصطلاحات میں سے قرآن کے منطوق و مفہوم سے آگاہی و آشنائی سب سے پہلے ضروری ہے۔ اس لیے کہ منطوق و مفہوم ہی سے قرآنی دلالت کے انواع و اقسام معلوم ہوتے ہیں۔ اور دلالت الفاظ و معانی سے مستفاد و مستنبط ہوتی ہے بنا بریں منطوق و مفہوم نص ظاہر مؤوّل موضوع خطاب معانی الوصف اور شرط و حصر سب کو شامل ہے۔ قرآنی نظائر و امثال کو یکجا کر کے ہم اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

منطوق کی تعریف :-

منطوق کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "لفظ محل نُطق میں جس بات پر دلالت کرتا ہے اس کو منطوق کہتے ہیں[1]"

منطوق کی تعریف میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کسی آیت کا تلفظ ہی تنہا اس کی دلالت کا ذریعہ و وسیلہ ہے اس تعریف کی صحت نص سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے کیونکہ لفظ نص کے سوا کسی اور معنی و مفہوم کا متحمل ہی نہیں ہوتا۔

مثلاً یہ آیت کریمہ :-

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ[2] — تین دن کے روزے حج میں اور سات روزے واپس آتے وقت یہ پورے دس ہوئے۔

اس آیت کے الفاظ دس روزوں کی تکمیل کے سوا اور کسی معنی و مفہوم کے متحمل ہی نہیں۔ اس

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۵۲ [2] سورۃ البقرۃ، ۱۹۶۔

لیے کہ آیت اسی معنی میں ناطق ہوتی ہے اور اس میں نص کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کی حد یہ ہے کہ اس میں "ظاہر" کی بھی گنجائش نہیں۔ ظاہر وہ ہوتا ہے جو متبادر معنی و مفہوم کا فائدہ دیتا ہے اور اس میں دوسرے معنی کا ضعیف سا احتمال بھی موجود ہوتا ہے۔ظاہر بھی منطوق ہی کی ایک قسم ہے۔اس لیے کہ ظاہر کی متبادر اور راجح معنی پر دلالت محلِ نطق ہی میں کامل ہو جاتی ہے۔کیونکہ راجح معنی و مفہوم مرجوح کے مقابلہ میں مقدم ہوتا ہے۔

اس کی توضیح مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

ارشاد فرمایا :۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ [۱]	جو شخص لاچار ہو جائے گروہ باغی اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

باغی کا لفظ دو معنوں پر بولا جاتا ہے :۔

۱۔ اس کے ایک معنی ہیں جاہل۔ان پڑھ۔یہ معنی مرجوح (قلیل الاستعمال) ہے۔

۲۔ دوسرے معنی ہیں ظالم۔یہ معنی راجح ہے اور آیت کے سیاق سے صاف سمجھ میں آتا ہے [۲]۔

مُؤَوَّل :۔

مُؤَوَّل اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے ظاہری مفہوم مراد نہ لیا جا سکتا ہو۔اس لیے سیاق کلام کے پیش نظر اس کو دوسرے معنی پر محمول کیا جاتا ہے۔یہ بھی منطوق کی ایک قسم ہے۔اس لیے کہ اس کا ظاہری مفہوم مرجوح ہوتا ہے۔اور سیاقِ کلام سے جس معنی کی تائید ہوتی ہے وہ راجح ہوتا ہے۔گویا وہ لفظ بذاتِ خود اس معنی کی شہادت دیتا ہے۔اس کی مثال مندرجہ ذیل آیت ہے :۔

---

[۱] سورۃ الانعام۔۱۴۵

[۲] البرہان، ج ۲۔ص ۲۰۶۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ[1] وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو۔

اس آیت میں خدا کی معیت (ساتھ ہونے) کو اس کے قربِ حقیقی پر محمول نہیں کیا جا سکتا[2]۔ اگر معیت سے خدا کی قدرت و حفاظت اور اس کا علم مراد لیا جائے تو یہ مفہوم درست ہے اور بلا تکلف اس لفظ سے سمجھ میں آجاتا ہے[3]۔

مفہوم :

مفہوم کی تعریف یہ کی گئی ہے :-

"مفہوم اس معنی و مطلب کو کہتے ہیں۔ جس پر لفظ بغیر محلِ نطق میں دلالت کرتا ہے[4]"

مفہوم کی تعریف میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ ذہن میں لفظ کے جو معنی محفوظ ہوتے ہیں وہ دلالت علی المعنیٰ کا واحد ذریعہ ہیں۔ مفہوم کی دو قسمیں ہیں :

۱۔ جب منطوق اس کے مطابق و موافق ہو تو اس کو "مفہوم موافق" کہتے ہیں۔

۲۔ جب منطوق اس کے خلاف ہو تو اس کو "مفہوم مخالف" کہتے ہیں[5]

فحوی الخطاب :-

مفہوم کی ان دو قسموں کے الگ الگ فردعات ہیں جو ان سے وابستہ ہیں۔ بنا بریں جب مفہوم موافق کسی قابلِ اخذ و اعتبار معنی سے دلالت کرتا ہو تو اس کو "فحوی الخطاب" کہتے ہیں مثلاً آیت قرآنی "فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ" سے جب والدین کو پیٹنے کی حرمت مراد لی جائے تو یہ "فحوی الخطاب" ہے۔ اس لیے کہ مار پیٹ کو حرام قرار دینا والدین کو اُف کہنے کی حرمت سے زیادہ

---

[1] سورۃ الحدید۔ ۴ [2] البرھان، ج ۲۔ ص ۲۰۶۔

[3] مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اکثر علمائے سلف اس کو ظاہر پر محمول کرتے اور اس کی کیفیت کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ امام مالک کا ارشاد عام طور سے مشہور ہے کہ "استواء علی العرش کا مفہوم معلوم ہے مگر اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ اور اس کے بارے میں تحقیق و تلاش بدعت ہے۔" (منہاج السنۃ امام ابن تیمیہ) صفات الٰہی کی تفصیلات یہاں بیان نہیں کی جا سکتیں (غلام احمد حریری۔)

[4] الاتقان، ج ۲ ص ۵۲ [5] الاتقان، ج ۲ ص ۵۳ [6] سورۃ الاسراء، ۲۲ [7] الاتقان، ج ۲۔ ص ۵۳

ضروری ہے۔

لحن الخطاب :-

جب کوئی لفظ مساوی معنی پر دلالت کرتا ہو تو اس کو "لحن الخطاب" کہتے ہیں

مثلاً آیتِ کریمہ :

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۔[1]

جو لوگ از روئے ظلم یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور وہ دوزخ میں جائیں گے۔

اس آیت سے یتیموں کے مال کو جلانے کی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ تحریم کا مقصد یہ ہے کہ یتیموں کے مال کو تلف نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یتیموں کا مال کھانے سے بھی تلف ہو جاتا ہے اور جلانے سے بھی یہ دونوں باتیں باہم مساوی ہیں[2]

مفہوم مخالف کی کئی قسمیں ہیں مگر ان میں سے تین اہم ہیں[3] :-

(۱) مفہوم وصفی۔ (۲) مفہوم شرطی۔ (۳) مفہوم حصری۔

مفہوم وصفی میں وسعت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں صرف صفت ہی شامل نہیں بلکہ ہر وہ اسم داخل ہے، جس میں وصفیت کا مفہوم پایا جاتا ہو۔ مثلاً حال ظرف اور عدد وغیرہ[4]

وصف کی مثال :-

مفہوم وصف کی مثال یہ آیت ہے :-

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ۔[5] اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق

---

[1] سورۃ النساء - ۱۰

[2] محاضرات فی اصول الفقہ ، ج ۱ ، ص ۱۸۱ ۔ از بدر المتولی عبد الباسط ۔

[3] مفہوم مخالف کی پانچ قسمیں مشہور ہیں ، مگر ہم نے تین اہم اقسام کا ذکر کیا ہے ۔ وہ پانچ یہ ہیں

(۱) صفت (۲) شرط (۳) غایت (۴) عدد (۵) لقب ۔

[4] الاتقان ، ج ۲ ، ص ۵۳ ۔ [5] سورۃ الحجرات ۔ ۶ ۔

اس آیت کا مفہوم وصفی یہ ہے کہ جب غیر فاسق (عادل وصالح) کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق ضروری نہیں ہے۔ بخلاف ازیں حسن ظن کی بنا پر ہم اس کو تسلیم کر لیں گے۔ علماء نے اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ امانت و دیانت سے موصوف شخص جب کوئی حدیث روایت کرے تو اس کا قبول کرنا واجب ہے[1]

حال کی مثال :۔

حال کی مثال مندرجہ ذیل آیت ہے :۔

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا	اے ایمان والو جب تم پر نشہ کی کیفیت
الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی	طاری ہو تو نماز کے نزدیک نہ جاؤ، یہاں
تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔	تک کہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کر رہے ہو۔[2]

اس آیت کا مقصد دراصل یہ تھا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں پر نشہ آور اشیاء کو حرام قرار دیا جائے اس لیے یہ حکم دیا کہ نماز اس حالت میں پڑھی جائے، جب نشہ کی کیفیت طاری نہ ہو۔ اور نمازی اس بات سے آگاہ ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ چونکہ نشہ کی حالت میں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے یا کیا پڑھ رہا ہے۔ اس لیے نشہ کی حالت میں نماز کو ممنوع ٹھہرایا۔

ظرف کی مثال :۔

ظرف کی مثال یہ آیت ہے :

فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ مشعر الحرام کے نزدیک اللہ کو یاد کرو۔[3]

اس آیت میں ذکر خداوندی کے لیے ایک خاص جگہ کا تعین کیا گیا ہے۔ اگر یہی ذکر کسی اور جگہ کیا جائے تو جو حکم مقصود ہے وہ حاصل نہ ہو گا۔[4] جو شرعی حکم عبادت کے طور پر مشروع ہوا ہو اس کی علت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ اس کو شارع کے حکم کے مطابق بجا لانا اطاعت

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۵۲
[2] سورۃ النساء۔ ۴۳
[3] سورۃ البقرۃ۔ ۱۹۸
[4] الاتقان، ج ۲۔ ص ۵۲

خداوندی کی دلیل ہے۔ اس حکم پر کوئی اضافہ کرنا اسی طرح گناہ ہے جس طرح اس میں کمی کرنا ایک غیر شرعی فعل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کی اصلی جگہ سے اٹھا کر کسی اور جگہ رکھ دیا جائے۔

مندرجہ ذیل آیت بھی ظرف کی مثال بن سکتی ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ [۱] حج کے لیے چند مہینے متعین ہیں۔

اس آیت میں حج کے لیے احرام باندھنے کو خاص مہینوں کے اندر محدود کر دیا گیا ہے اگر کوئی شخص دوسرے مہینوں میں احرام باندھے گا تو اس کا احرام صحیح نہ ہوگا [۲]

عدد کی مثال

عدد کی مثال یہ آیت ہے :-

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً [۳]

جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بہتان لگائیں اور چار گواہ نہ لائیں، تو ان کو اسی درّے مارو۔

مذکورہ صدر آیت سے واضح ہوا کہ حدِ قذف (بہتان لگانے کی سزا) اسّی درّے ہے نہ کم اور نہ زیادہ [۴]

مذکورہ صدر چاروں مثالیں مفہوم وصفی اور اس میں وسعت و کشادگی کی دلیل ہیں۔

مفہوم شرطی کی مثال :

مفہوم شرطی کی مثال یہ آیت ہے :-

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ اگر عورتیں حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کیجیے

آیت ہذا میں حمل کی شرط عائد کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ غیر حاملہ کو نان و نفقہ دینا

---

[۱] سورۃ البقرہ ۔ ۱۹۷ [۲] الاتقان، ج ۲ ۔ ص ۵۳

[۳] سورۃ النور ۔ ۴ [۴] الاتقان، ج ۲ ۔ ص ۵۳ (باقی برصفحہ آئندہ)

ضروری نہیں ہے۔[1]

مفہوم حصری کی مثال:

مفہوم حصری کی مثال یہ آیت ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔[2]	یعنی تیرے سوا نہ کسی کی عبادت کرتے ہیں اور نہ کسی سے مدد مانگتے ہیں۔

علماء نے صراحتہً کہا ہے کہ آیتِ قرآنی:۔

وَرَبَآئِبُکُمُ اللّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِنْ نِّسَآئِکُمْ۔	اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں (بھی حرام) ہیں، جو تمہاری گود میں پل ہوں۔

میں موصول اور صلہ کا مفہوم معتبر نہیں ہے (یعنی منکوحہ بیوی کی لڑکی کے حرام ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس نے خاوند کے گھر میں تربیت پائی ہو)، چونکہ منکوحہ بیویوں کی لڑکیاں اکثر خاوند کے گھر میں تربیت پاتی ہیں اس لیے اس وصف کا ذکر کیا گیا ہے۔[3]

اسی طرح مذکورہ ذیل آیت میں شرط کا مفہوم معتبر نہیں:۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) [5] سورۃ الطلاق۔۶ (اصول الفقہ از عبدالوہاب خلاف ص ۱۷۹)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ اس صورت میں ہے جب غیر حاملہ بیوی دولت و ثروت کی بناء پر بے نیاز ہو۔ اس کے محتاج ہونے کی صورت میں خاوند اس کا کفیل ہوگا۔ دین اسلام میں جس طرح مرد اپنی کمائی ہوئی دولت کا مالک ہوتا ہے اسی طرح عورت بھی ہوتی ہے ۔۔۔ قرآن میں فرمایا:۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ۔	مردوں کو ان کی کمائی سے حصہ ملے گا اور عورتوں کو ان کی کمائی سے۔ (سورۃ النساء۔۳۲)

جب عورت تنگدست ہو تو مرد اس پر خرچ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ خواہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (نساء۔۳۴)	مرد عورتوں کے نگران ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض مردوں کو بعض پر فضیلت دی ہے نیز اس لیے کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

[2] سورۃ الفاتحہ۔۵ [3] سورۃ النساء۔۲۳ [4] الاتقان، ج ۲ ص ۵۴ نیز البرھان، ج ۲۔ ص ۲۳۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ اور اپنی باندیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر
إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا[1]۔ وہ بچنا چاہیں۔

اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر وہ بدکاری پر رضامند ہوں تو انہیں اس بات پر مجبور کیا جائے۔ بخلاف ازیں یہ شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ فی الواقع وہ لونڈیاں بدکاری سے بچنا چاہتی تھیں۔ اس لیے کثرتِ وقوع کی بناء پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن میں عام و خاص

عام :- عام قرآن میں وارد شدہ اس لفظ کو کہتے ہیں جو اپنے اصلی لغوی مفہوم کے اعتبار سے بلا حصر و عدد اپنے تمام افراد کو شامل ہو[2]۔

قرآن کریم میں فرمایا :-

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ اور شہر کے کنارہ سے ایک شخص بھاگتا
رَجُلٌ يَسْعَىٰ[3] ہوا آیا۔

اس آیت میں "رَجُلٌ" کا لفظ اس لیے عام نہیں کہ وہ ایک خاص شخص پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ :-

فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ[4]۔ اس (شہر) میں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا

میں "رَجُلَيْنِ" کا لفظ عام نہیں۔ کیونکہ وہ خاص دو آدمیوں پر دلالت کرتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا :-

---

[1] سورۃ النور - ۳۳ والاتقان، ج ۲ - ص ۵۴۔
[2] اصول الفقہ از خلاف - ص ۲۱۳
[3] سورۂ یٰسین - ۲۰ [4] سورۃ القصص - ۱۵

وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ [1]
اور اعراف پر کچھ آدمی ہوں گے جو ہر شخص کو اس کی علامت سے پہچان لیں گے۔

مذکورہ صدر آیت میں بھی "رِجَالٌ" کا لفظ عام نہیں ہے۔

نیز فرمایا :-

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ [2]
اہل کتاب میں ایک ایسی جماعت بھی ہے جو خدا کے حضور میں کھڑی رہتی ہے۔

یہاں بھی "اُمَّةٌ" کا لفظ عام نہیں کیونکہ اس سے ایک خاص گروہ مراد ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ :-

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ [3]
اس نے تمہیں جواب دیا کہ میں ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کروں گا، جو یکے بعد دیگرے آئیں گے۔

میں "الف" (ایک ہزار) کا لفظ اس لیے عام نہیں کہ وہ ایک عددِ معیّن پر دلالت کرتا ہے مذکورہ صدر الفاظ ایک خاص عدد کو ظاہر کرتے ہیں اور اپنے تمام افراد کو شامل نہیں ہیں۔ اس لیے ان میں عموم کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔

قرآن کریم واضح اور غیر مبہم عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس لیے عموم کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو عربوں نے اِحاطۂ افراد اور ہمہ گیری کے لیے وضع کر رکھے تھے۔ اِستقراء و تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ عموم کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل الفاظ وضع کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اب ہم وہ الفاظ مع قرآنی امثلہ کے ذکر کرتے ہیں [4]

[1] سورۃ الاعراف۔ ۴۶
[2] سورۃ آل عمران۔ ۱۱۳
[3] سورۃ الانفال۔ ۹
[4] الاتقان، ج ۲۔ ص ۲۶

الفاظِ عموم :

۱ = مندرجہ ذیل الفاظ عموم کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں :-

كُلٌّ - جَمِيْع - كَآفَّة اور ان کے ہم معنی دیگر الفاظ

قرآن میں فرمایا :-

(۱) كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ[۱] ۔ زمین پر جو بھی ہے فنا پذیر ہے۔

(۲) وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا[۲] ۔ وہی ہے جس نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے لیے پیدا کیا۔

(۳) اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً[۳] ۔ اسلام میں پورے پورے آؤ۔

۲ = اسماء الموصول بحالت افراد تثنیہ جمع و تذکیر و تانیث۔

اب ترتیب وار ان کی امثلہ ملاحظہ فرمائیں :-

(۱) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ[۴]

(۲) وَاللَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا مِنكُمْ فَآذُوهُمَا[۵] ۔

(۳) لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ[۶] ۔

(۴) وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ[۷] ۔

۳ = وہ لفظ جس پہ الف لام جنس داخل ہوا ہو۔ خواہ وہ مفرد ہو۔ مثلاً :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا[۸]

یا جمع ہو۔ مثلاً : قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ[۹] ۔

---

۱ سورۃ الرحمٰن - ۲۶
۲ سورۃ البقرۃ - ۲۹
۳ سورۃ البقرۃ - ۲۰۸
۴ سورۃ البقرہ - ۱۷
۵ سورۃ النساء - ۱۶
۶ سورۃ یونس - ۲۶
۷ سورۃ النساء - ۱۵
۸ سورۃ المائدۃ - ۳۸
۹ سورۃ المؤمنون - ۱

۴ = وہ جمع جس کو اضافت کی بناء پر معرفہ قرار دیا گیا ہو۔ مثلاً :۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ[1]

نیز یہ آیت کریمہ :۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً[2]۔

۵ = اسماء شرط، مثلاً :۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا[3]۔

۶ = نکرہ جب سیاقِ نفی میں واقع ہو، مثلاً :۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ[4]۔

مذکورہ صدر الفاظ وضع لغوی کے اعتبار سے حقیقی طور پر عموم کو متعین کر دیتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی مخصص وارد نہ ہوا ہو۔ قرآن کریم میں تخصیص کے موارد کی کمی نہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ بعض علماء کی رائے میں کوئی عام ایسا نہیں ہے جو اپنے عموم پر باقی ہو اور اس میں تخصیص کا احتمال باقی نہ ہو[5]۔

امام سیوطی نے تلاش بسیار کے بعد اس کی نظیر میں یہ آیت پیش کی ہے جو اپنے عموم پر باقی ہے ——— قرآن میں فرمایا :۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں

---

۱ سورۃ النساء - ۱۱ ۲ سورۃ التوبۃ - ۱۰۳

۳ سورۃ الفرقان - ۶۸ ۴ سورۃ الحجر - ۲۱

۵ قاضی جلال الدین بلقینی فرماتے ہیں :۔ "ایسے عام کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی جو اپنے عموم پر باقی ہو۔ اس لیے کہ ہر عام میں تخصیص کا احتمال ہوتا ہے۔ مثلاً آیت کریمہ "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ" سے غیر مکلف کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ" سے اضطراری حالت نیز مچھلی اور ٹڈی مستثنیٰ ہے۔

(الاتقان، ج ۱، ص ۲۶)

وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ[1] اور خالائیں تم پر حرام کی گئی ہیں۔

مذکورہ صدر آیت میں جن حرام رشتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں عموم مقصود ہے۔ مگر امام سیوطی نے جس کدوکاوش کا ذکر کیا ہے اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ قرآن میں ایسے عمومی احکام بکثرت موجود ہیں جن کا عموم علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایسے احکام عام مخصوص منہ البعض کی نسبت کم ہیں۔

احکام عام جو اپنے عموم پر قائم ہیں ان کی بہترین مثال قوانین قدرت ہیں جن میں کسی تخصیص و تبدیل کا احتمال باقی نہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں فرمایا:-

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ[2] ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔

نیز فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا[3]۔ زمین پر چلنے والی کوئی چیز ایسی نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:-

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ[4] ہر قوم کے لیے ایک وقت معین ہوتا ہے جب وہ وقت آجاتا ہے، تو نہ آگے ہوتا ہے نہ پیچھے

قرین تحقیق بات یہ ہے کہ اکثر دفعہ عام ایک ایسے قرینہ پر مشتمل ہوتا ہے، جو اس کے عموم کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ مثلاً مندرجہ ذیل آیت کریمہ:-

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ[5] اہل مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے والے خانہ بدوش لوگوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ رسول کریمؐ سے پیچھے رہیں۔

---

[1] سورۃ النساء - ۲۳ [2] سورۃ الانبیاء - ۳۰ [3] سورۃ الانعام - ۳۸
[4] سورۃ یونس - ۴۹ [5] سورۃ التوبۃ - ۱۲۱

مذکورہ صدر آیت میں اہل مدینہ اور اعراب (خانہ بدوش) سے وہ لوگ مراد ہیں جو جہاد کی قدرت سے بہرہ ور ہیں۔ جہاد کی قدرت سے قاصر لوگ اس آیت میں شامل نہیں ہیں کیونکہ عقل ان کے خارج ہونے کا فتویٰ دیتی ہے ـــــ نیز فرمایا:۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ[1] اور اللہ کے لیے لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے

اس آیت میں "النَّاس" سے وہ لوگ مراد ہیں جن پر حج کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ بچے اور کم عقل لوگ بتقاضائے عقل اس سے خارج ہیں۔

عام مخصوص البعض کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں کسی بلاغی غرض و غایت کے پیش نظر عموم کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس سے تعبیر و بیان کا حسن و جمال دوبالا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:۔

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ[2] خدا کے عطا کردہ فضل کی بناء پر لوگوں پر حسد کرتے ہیں۔

اس آیت میں "النَّاس" سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ چونکہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے اس لیے واحد ہونے کے باوجود آپ پر جمع کے لفظ کا اطلاق کیا گیا۔

جب کسی آیت قرآنی میں براہِ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہو۔ مثلاً:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ[3] اے نبی اللہ سے ڈر

تو وضعی دلالت کے اعتبار سے اس خطاب میں امتِ محمدی شامل نہیں ہوگی البتہ امت اس لحاظ سے اس حکم کی مخاطب ہوگی کہ آنحضور کی پیروی اس پر فرض ہے۔ اگر کسی خارجی دلیل سے ثابت ہو جائے کہ یہ حکم آنحضور کی ذاتِ گرامی کے ساتھ مختص ہے تو یہ حکم امت کے لیے نہیں

---

[1] سورۃ آل عمران ۹۷ [2] سورۃ النساء - ۵۴

[3] سورۃ الاحزاب ۱۔

ہوگا۔

مدح وذم کے باوجود ایک عام حکم اپنے عموم پر باقی رہے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور ان کو

وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1] خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

نیز فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے جنت

كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا[2] فردوس میں ان کی مہمانی کی جائے گی۔

خاص القرآن:

خاص اس لفظ کو کہتے ہیں، جس کو فردِ واحد پر دلالت کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ مثلاً محمد کا لفظ۔ یا ایک خاص نوع مراد ہو، جیسے رَجُلٌ (مرد)، یا معین ومعدود افراد مراد ہوں جیسے دو۔ دس۔ ہزار۔ قوم، جماعت، اُمّت، طائفہ اور فریق وغیرہ[3]

خاص القرآن کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) مطلق۔ (۲) مقید۔

(۳) امر۔ (۴) نہی۔

خاص مقید کی مثال آیت کریمہ "اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا[4]" میں "مَسْفُوْحًا" کا لفظ ہے۔ اس لیے کہ آیت میں "الدّم" (خون) کا لفظ مطلق وارد ہوا تھا "مسفوحا" نے اس کو مقید کردیا[5] گویا یہاں خاص مطلق کو خاص مقید پر محمول کیا گیا ہے[6]

قرآن میں جب امر کا صیغہ کسی خاص ضمن میں وارد ہوا ہو تو وہ وجوب ولزوم کا فائدہ دیتا[7]

---

[1] سورۃ التوبۃ۔ ۳۴ [2] سورۃ الکہف ۱۰۸ [3] علم اصول الفقہ از خلاف ص ۱۹۷
[4] سورۃ الانعام۔ ۱۴۵ [5] سورۃ المآئدۃ۔ ۴
[6] علم اصول الفقہ از خلاف ص ۲۲۷۔ [7] حوالہ مذکور۔ ص ۲۲۸۔

قرآن میں فرمایا :-

فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا[1] ان دونوں کا ہاتھ کاٹ دو۔

اگر قرینہ موجود ہو تو امر سے اباحت کا مفہوم بھی مراد لیا جاتا ہے۔

مثلاً یہ آیت :- كُلُوْا وَاشْرَبُوْا۔[2] (کھاؤ اور پیو)

اسی طرح کسی کا عجز ثابت کرنے کے لیے بھی امر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

قرآن میں فرمایا :-

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ[3]۔ اس جیسی کوئی سورت لے آؤ۔

امر کا صیغہ بعض اوقات زجر و عتاب اور تہدید کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ[4] تم جو چاہو کرو۔

کسی حکم کے مکرر مطالبہ کے لیے بھی امر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً :-

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ[5]

مطلب یہ کہ جب بھی کسی کی زندگی میں ماہِ رمضان آجائے وہ اس کے روزے رکھے۔

نہی کا صیغہ قرآن میں جب کسی خاص موقع پر وارد ہو تو وہ حرمت بطریق وجوب کا فائدہ

دیتا ہے[6] ——— قرآن میں فرمایا :-

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ[7] اور اپنے مال ناروا طریقہ سے مت کھاؤ۔

جب کوئی قرینہ موجود ہو تو نہی سے اور معنی بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً دعا کے لیے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا[8] اے رب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔

---

[1] سورۃ المائدہ - ۳۸

[2] سورۃ الاعراف - ۳۱

[3] سورۃ البقرۃ - ۲۳

[4] سورۃ السجدہ - ۴۰

[5] سورۃ البقرۃ - ۱۸۵

[6] علم اصول الفقہ از خلاف، ص ۲۳۰

[7] سورۃ البقرۃ - ۱۸۸

[8] سورۃ آل عمران - ۸

کراہت کے لیے مثلاً یہ آیت کریمہ :-

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا	اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے
عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ	میں مت پوچھو کہ اگر ان کا اظہار کیا جائے، تو
تَسُؤْکُمْ۔[1]	تمہیں پسند نہ آئے۔

خاص اپنی حقیقی وضعی دلالت کی بناء پر جس بات پر روشنی ڈالتا ہے وہ ایک قطعی و حتمی حکم ہوتا ہے۔ جس میں ظن کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :-

فَکَفَّارَتُہٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ[2] تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

اس آیت میں دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ اس سے کم اور نہ زیادہ۔ اس لیے کہ حقیقی خاص میں خصوص کے سوا کسی چیز کا احتمال باقی نہیں ہوتا۔ بخلاف ازیں عام بہت کم حالات میں اپنے عموم پر باقی رہتا ہے اور اس میں ہمیشہ تخصیص کی گنجائش ہوتی ہے۔

مجمل و مبیّن :-

مجمل وہ ہے جو اپنے مفہوم پر دلالت کرنے میں واضح نہ ہو۔[3] یا بالفاظ صحیح تر جو دو باتوں میں سے ایک پر دلالت کرتا ہو۔ اور اس کی نسبت سے دونوں برابر ہوں۔ اور ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہ ہو۔

داؤد ظاہری[4] کہتے ہیں کہ قرآن میں مجمل کا وجود نہیں۔[5] صحیح تر بات یہ ہے کہ قرآن

---

[1] سورۃ المائدۃ - ۱۰۴
[2] سورۃ المائدۃ - ۹۲
[3] الاتقان، ج ۲ - ص ۳۰
[4] داؤد بن علی بن خلف اصبہانی اہل ظاہر کے امام تھے۔ آپ کی کنیت ابو سلیمان ہے ظاہری کے لقب سے مشہور تھے۔ بغداد میں علماء کی سیادت و قیادت آپ کی ذات پر ختم ہو گئی تھی ۔ ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ (وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۷۵)
[5] الاتقان، ج ۲ - ص ۳۰ -

میں مجمل موجود تو ہے۔ مگر وہ اپنے اجمال پر باقی نہیں رہتا۔ خصوصاً اوامر و مشروعات میں کوئی چیز مجمل نہیں۔

مجمل میں جو ابہام و اخفاء پایا جاتا ہے اس کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ غرابتِ لفظ :

مثلاً "هَلُوعٌ" کا لفظ۔ مگر سیاقِ قرآنی سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

قرآن میں فرمایا :۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا[1] ۝

۲۔ وقوعِ اشتراک :

مثلاً مندرجہ ذیل آیت "عَسْعَسَ" کا لفظ

"وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ[2]" یہ لفظ آنے جانے دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے[3]۔

۳۔ مرجعِ ضمیر کا اختلاف :

اس کی مثال مندرجہ ذیل آیت ہے :۔

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ[4]۔ — پاکیزہ کلمات اس کی طرف چڑھتے ہیں اور عمل صالح ان کو بلند کرتا ہے۔

مذکورہ صدر آیت میں "يَرْفَعُهُ" کی ضمیر فاعل اسی جانب لوٹتی ہے جس طرف "إِلَيْهِ" کی ضمیر۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کا مرجع اللہ کا لفظ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ضمیر "العمل" کی طرف لوٹتی ہو۔ اندریں صورت آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکیزہ کلمات عمل کو بلند

---

[1] سورۃ المعارج ۱۹-۲۱ (البرہان، ج ۲-ص ۱۷۶-) [2] سورۃ التکویر، ۱۸-

[3] الاتقان، ج ۲ ص ۳۰ [4] سورۃ فاطر-۱۰

کرتے اور بارگاہ ایزدی تک پہنچا دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ضمیر "الکلمۃ" کی طرف لوٹتی ہو۔ آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ کلمہ طیبہ یعنی توحید عمل صالح کو بلند کرتی ہے۔ اس لیے کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل صحیح نہیں ہوتا[1]

۴۔ تقدیم وتاخیر:

بسا اوقات تقدیم وتاخیر بھی اجمال وابہام کی موجب بنتی ہے۔ اس کی مثال یہ آیت ہے:۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى[2]

عبارت دراصل یوں ہونی چاہیئے تھی:۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى لَكَانَ لِزَامًا[3]

مگر یہ غموض وخفاء جو مجمل میں دو معنوں کے تردد وتذبذب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ہنگامی وعارضی ہوتا ہے اور جلد ہی زائل ہو جاتا ہے۔ جب یہ ابہام زائل ہو جاتا ہے تو مجمل کو مفصل، مفسر یا مبین کہتے ہیں۔

مجمل کی توضیح وتشریح یا تو اس کے ساتھ متصل ہوتی ہے[4] مثلاً:

حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ[5] — یہاں تک کہ سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے متمیز ہو جائے۔

مندرجہ صدر آیت کریمہ میں جب "من الفجر" کا اضافہ کیا گیا تو کلام کا مطلب واضح ہو گیا اور تردد واحتمال باقی نہ رہا[6]

---

[1] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۰ — [2] سورۃ طٰہٰ۔ ۱۲۹

[3] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۱۔

[4] الاتقان، ج ۲۔ ص ۳۱

[5] سورۃ البقرۃ۔ ۱۸۷

[6] البرھان، ج ۲۔ ص ۲۱۵۔

یا کسی جُدا گانہ آیت میں اس کی توضیح وتفسیر وارد ہوتی ہے[۱]۔ مثلاً:۔

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ[۲] — بعض چہرے اس روز مسرور و شادمان ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اس آیت سے رُویتِ باری تعالیٰ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس کی مزید توضیح مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے:۔

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ[۳] — آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصل رُویت ممکن ہے۔ البتہ اس کا حصر و احاطہ جس کو ادراک کہتے ہیں ممکن نہیں[۴]۔

بعض اوقات حدیثِ نبوی سے بھی مجملاتِ قرآن کی توضیح کی جاتی ہے[۵]۔ کیونکہ قرآن و حدیث دونوں ایک دوسرے کے مؤید ہیں۔ اور دونوں کے سوتے ایک ہی چشمۂ فیض سے پھوٹتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے عموم کی تخصیص کرتا اور اس کے اجمال کی توضیح و تشریح کرتا ہے[۶]۔

اکثر شرعی الفاظ اپنے لغوی معانی سے منقول ہوتے ہیں۔ مثلاً "صلوٰۃ" کا لفظ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال سے اس پر روشنی ڈالی۔ حضور کا ارشاد گرامی ہے:۔

صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ — نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو۔

---

۱ الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۳۱۔

۲ سورۃ القیامۃ۔ ۲۲۔ ۲۳

۳ سورۃ الانعام۔ ۱۰۳

۴ البرہان۔ ج ۲۔ ص ۱۶۲

۵ الاتقان، ج ۲۔ ص ۱۳۱

۶ البرہان۔ ج ۲۔ ص ۱۲۹

اسی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوٰۃ کی مقدار بتائی اور مناسکِ حج کی تفصیلات پر روشنی ڈالی[1]

قرآن کریم میں فرمایا :-

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ[2] کسی کو معلوم نہیں کہ اُن کے لیے کس قدر مسرت و شادمانی پوشیدہ رکھی گئی ہے

آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی توضیح میں فرمایا :-

"اس (جنت) میں وہ چیزیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سُنی اور نہ کسی دل پر ان کا گزر ہوا - جو چیزیں تمہیں معلوم ہیں، اُن کا تو ذکر ہی چھوڑ دیجئے"[3]

---

[1] الاتقان، ج ۲ - ص ۱۳۱ نیز البرھان، ج ۲ - ص ۱۸۴ -

[2] سورۃ السجدۃ - ۱۷

[3] البرھان، ج ۲ - ص ۱۳۰

فصل سوم

اعجاز القرآن

قرآن کریم نے فصحائے عرب کو دعوتِ مقابلہ دی تھی۔ اس چیلنج کو دیے ہوئے ایک عرصہ دراز گذر گیا۔ مگر کسی کو اس کے قبول کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ بلکہ کفار نے اپنے عجز و تقصیر کا اعتراف کر لیا۔ اس لیے کہ قرآن غالب ہے مغلوب نہیں اور نہ کسی بشر کا کلام بھی نہیں۔

اعجاز القرآن کا موضوع اس قابل تھا کہ وہ بہت سے اہم مباحث کو جنم دیتا۔ اور علماء قرآنی بلاغت کے طرق و وجوہ اور اس کے نادر و یکتا اندازِ تصویر و تعبیر کے پردہ کو چاک کرتے چنانچہ علماء نے اس ضمن میں سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ اور قرآنی بلاغت کے کشف و اظہار کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ مگر افسوس ناک امر یہ ہے کہ وہ قرآنی آیات پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے اور ان کو قرآنی وحدت سے الگ کر کے دیکھتے تھے تحلیل و تجزیہ کے دوران ان کی بحث و تحقیق کا مرکز و محور صرف الفاظ و معانی ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کریم کا حسنِ بیان ان کی نگاہ سے اوجھل رہا۔ کلامی مباحث کی موشگافیوں میں الجھ کر ان کا قرآنی ذوق بگڑ گیا اور وہ کتاب الٰہی کے اعجاز و بلاغت کے ذوق آشنا نہ ہو سکے۔

غالباً مشہور ادیب و خطیب الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ اولین شخص تھا جس نے اپنی کتاب "نظم القرآن" میں اعجاز القرآن سے متعلق مباحث کو موضوع سخن بنایا اور ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب ہمارے ہاتھوں تک نہ پہنچ سکی۔ مگر الجاحظ نے اپنی مشہور کتاب "الحیوان" میں اس کتاب کی طرف اشارے کیے ہیں۔

الجاحظ رقمطراز ہے۔

"میں نے اپنی ایک کتاب میں ایسی آیات جمع کردی ہیں جن سے ایجاز و حذف زوائد وفضول اور استعارات کا فرق و امتیاز واضح ہوتا ہے۔ مطالعہ کرتے وقت تم اس کو اختصار و جامعیت کا نادر نمونہ پاؤ گے مختصر الفاظ میں معانی کثیرہ کو اس طرح جمع کیا ہے کہ اسے دریا بکوزہ کا مصداق قرار دے سکتے ہیں۔ مثلاً اہل جنت کی شراب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُونَ ۝ ۔ ان دونوں کلمات میں دنیوی شراب کے تمام عیوب کو جمع کردیا ہے۔ اہل جنت کے میوہ جات کے تذکرہ میں فرمایا: لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ۔ دونوں الفاظ میں میوہ جات کے جملہ محاسن کو یکجا کردیا ہے[1]"

کچھ بعید نہیں کہ محمد بن زید[2] واسطی متوفی ۳۰۶ھ نے اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں الجاحظ کی کتاب سے استفادہ کیا ہو۔ افسوس ہے کہ اس کتاب تک بھی ہمیں رسائی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ عبدالقاہر جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز میں جابجا اس کے حوالے ملتے ہیں۔ عبدالقاہر جرجانی نے واسطی کی کتاب کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ ایک کبیر الحجم جس کا نام "المعتضد" ہے اور دوسری اس سے مختصر تھی۔

عبدالقاہر جرجانی اسلوب قرآنی کے سچے ذوق آشنا تھے[3] حقیقت یہ ہے کہ کتاب خداوندی کے فنی حسن و جمال کے فہم و ادراک میں وہ اپنے معاصرین سے گوئے سبقت

---

[1] تاریخ آداب العرب للرافعی ج ۲ ص ۱۵۰ حاشیہ نمبر ا

[2] کشف الظنون ج ا ص ۱۲۰

[3] عبدالقاہر بن عبدالرحمن بن محمد اصول بلاغت کے واضع تھے۔ دلائل الاعجاز و اسرار البلاغۃ آپ کی مشہور تصانیف ہیں ۴۷۱ھ میں وفات پائی (انباہ الرواۃ ج ۲ ص ۱۸۲)

دے گئے تھے۔ آیت قرآنی "وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا" کی تفسیر میں موصوف نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے اندازِ تعبیر و بیان کے سمجھنے میں انہوں نے کس قدر ذہانت و فطانت کا ثبوت دیا ہے۔

علامہ جرجانی فرماتے ہیں۔

"استعارہ کی ایک قسم وہ بھی ہے جس کا ذکر و بیان اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نظم کلام اور اس کی حقیقت کو معلوم نہ کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ آیت کریمہ "وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا" کا ذکر کرتے ہیں تو صرف استعارہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور صرف اسی کو فضیلت و عظمت کا موجب ٹھہراتے ہیں۔ لوگوں کی گفتگو اس سے آگے نہیں چلتی۔ حالانکہ اصل بات یوں نہیں۔ اس کلام میں جو خوبی پائی جاتی ہے اور اس کو پڑھنے سے جو رعب سامع پہ طاری ہوتا ہے۔ وہ صرف استعارہ کی وجہ سے نہیں، اس کلام میں جو حسن و جمال بھی پایا جاتا ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ اس میں فعل کو ایک چیز کی جانب مسند کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ چیز اصلی فاعل کے سبب کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسند الیہ کو رفع دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اصلی فاعل کو منصوب لایا جاتا ہے۔ اس سے بظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ پہلی چیز کی طرف فعل کا اسناد دوسرے اسم کی وجہ سے ہے جو اس کا اصلی و حقیقی فاعل ہے نیز اس لیے کہ ان دونوں اسموں کے درمیان گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

طَابَ زَيْدٌ نَفْسًا وَ قَرَّ عَمْرٌو عَيْنًا وَ تَصَبَّبَ عَرَقًا وَ كَرُمَ أَصْلًا وَ حَسُنَ وَجْهًا

اور دیگر مثلہ جن میں فعل کو اصلی فاعل کے بجائے اس کے سبب کی جانب

---

۵ سورۂ مریم۔ ۴

مسند کیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان جملوں میں وارد شدہ جملہ افعال کا اصلی فاعل دوسرا اسم ہے۔ مثلاً اشتعل کا اصلی فاعل شیب (بڑھاپا) ہے۔ اسی طرح طاب کا حقیقی فاعل "نفس" اور قر کا "عین" ہے مگر ان کو پہلے اسم کی طرف مسند کیا گیا ہے۔ اگر پہلے کے بجائے ان کو دوسرے اسم کی جانب مسند کیا جائے جو ان کا حقیقی فاعل ہے تو اس عبارت کا حسن جاتا رہتا ہے"۔[1]

علامہ واسطی کے بعد الرمانی[2] متوفی ۳۸۴ھ نے اپنی مشہور کتاب "الاعجاز" تصنیف کی ہے۔ مگر اس میں انہوں نے کسی نئی رائے کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی قرآنی اسلوب کی باریکیوں سے تعرض کیا۔ پھر قاضی ابوبکر باقلانی متوفی ۴۰۳ھ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اعجاز القرآن" تالیف کی۔ اس میں بہت سے بلاغی مباحث جمع کر دیے۔ مگر وسعت و جامعیت کے باوصف اس کتاب میں بلاغت سے متعلق صرف وہی مسائل بیان کیے گئے ہیں جن کا اس دور میں چرچا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب میں لاتعداد کلامی مسائل بھی جمع کر دیے ہیں جن کا قرآن کے فنی حسن و جمال سے کچھ تعلق نہیں۔

مذکورہ صدر بیانات سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ جن علمائے متقدمین نے قرآنی بلاغت کے موضوع پر قلم اٹھایا تھا وہ زیادہ تر ان مسائل میں مشغول رہے جو خالص فنی میدان سے کوسوں دور تھے وہ تبویب و تقسیم کی الجھنوں میں اس حد

---

[1] دلائل الاعجاز ص ۷۹ ـ ۸۰ نیز تلخیص البیان للشریف الرضی ص ۲۲۰

[2] الرمانی کا رسالہ "النکت فی اعجاز القرآن" دار المعارف قاہرہ میں "بیان القرآن للخطابی" کے حاشیہ پر چھپ چکا ہے اس کے ساتھ ہی عبد القاہر جرجانی کا رسالہ "الشافیۃ" بھی ڈاکٹر محمد خلف اللہ اور پروفیسر محمد زغلول سلام کے حواشی اور تحقیق کے ساتھ زیور طبع سے مزین ہو چکا ہے۔

تک منہمک رہے کہ تصویر و تعبیر سے متعلق قرآن کی خصوصیات عامہ کے کشف و اظہار کے لیے وقت نہ نکال سکے۔

اس کے نتیجہ میں قرآن کا یہ پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل رہا کہ وہ کس طرح جذبات و احساسات میں ہیجان پیدا کر کے نفوسِ انسانی کو حرکت آشنا کرتا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں باندھ دیتا ہے۔

متاخرین کی خدماتِ جلیلہ:

عصرِ حاضر میں عربی ادب کی جو تحریک اٹھی اس نے لوگوں کو قرآن کے فنی حسن و جمال کے عناصر سے آگاہ و آشنا کرنے کے سلسلہ میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ چنانچہ تفسیر المنار کے مصنف سید رشید رضا نے فہم قرآن کے ضمن میں خاطر خواہ کام کیا ہے صاحب موصوف کے گرامی قدر استاد امام شیخ محمد عبدہ کی مساعی بھی اس ضمن میں ناقابلِ فراموش ہیں۔ سید رشید رضا المنار میں اکثر ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مشہور ادیب مصطفیٰ صادق الرافعی نے بھی اس سلسلہ میں اہم خدمات انجام دیں۔ چنانچہ موصوف نے اپنی کتاب "تاریخ آداب العرب" کی دوسری جلد کو قرآن اور بلاغتِ نبویہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر کارنامہ سید قطب شہید رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التصویر الفنی فی القرآن" لکھ کر انجام دیا۔

یہ کتاب استنباط صحیح اور پختگی فکر و نظر میں یکتا و منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ سید قطب رحمۃ اللہ نے اس کتاب میں قرآن کے فنی حسن و جمال کو بڑے ہی جاذب و دلکش طرز و انداز میں بیان کیا ہے۔

مصطفیٰ صادق رافعی نے قرآن کریم کے صوتی نظم و ربط کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

قرآن کریم عدیم المثال صوتی ہم آہنگی کا حامل ہے۔ اور اس ضمن میں کوئی

کتاب اس کی حریف نہیں بن سکتی اصوات و مخارج کے اعتبار سے۔ اس کے حروف میں ایک خاص قسم کی یگانگت پائی جاتی ہے۔ یہ حروف ھمس و جہر شدت و رخاوت تفخیم و ترقیق اور تکرار میں باہم بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں[1]۔"

مصنف موصوف اس کی بعض امثلہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"جب تم قرآنی الفاظ کے نظم و نسق پر غور کرو گے تو ان کی صرفی و لغوی حرکات کو وضع و ترکیب کے اعتبار سے اصل حروف کے قائم مقام پاؤ گے۔ یہ حرکات حروف کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ اور نظم موسیقی میں ان سے مربوط ہوتی ہیں بسا اوقات ایک حرکت کسی وجہ سے ثقیل ہوتی ہے اور اس لیے اس میں حلاوت و شیرینی کی کمی ہوتی ہے۔ مگر جب یہی حرکت ہم قرآن میں دیکھتے ہیں تو وہ عجیب شان کی حامل ہوتی ہے۔ جو حروف و حرکات اس حرکت سے پہلے ہوتے ہیں وہ باہم مل جل کر اس میں عجیب طرح کی یک رنگی و خوش آہنگی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور وہ اپنی جگہ پر نہایت موزون اور ہلکی پھلکی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی مثال میں ہم "النُّذُرُ"[2] کا لفظ پیش کر سکتے ہیں۔ یہ نذیر کی جمع ہے۔ چونکہ نون اور ذال دونوں پر ضمہ ہے اس لیے یہ ثقیل ہے۔ مزید برآں اس لفظ میں چنداں روانی و سلاست بھی نہیں پائی جاتی۔ مگر قرآن میں جہاں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ وہاں ان مصائب میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی[3]۔"

---

[1] تاریخ آداب العرب للرافعی ج ۲ ص ۲۲۵

[2] سورۃ القمر - ۳۶

[3] تاریخ آداب العرب للرافعی ج ۲ ص ۲۳۹

رافعی مزید فرماتے ہیں۔

"قرآن کریم سب کا سب نادر کلام اور ندرتِ بیان میں اپنی مثال آپ ہے اس کی بڑی وجہ قرآن کریم کی روح ترکیب ہے جس پر کلام الٰہی کا مدار وانحصار ہے۔ قرآن کے سوا یہ روح عربی زبان میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ اسی روح کے بل بوتے پر قرآن کریم بشری استطاعت کی حدود سے خارج ہے۔ اگر اس میں وہ روح نہ ہوتی تو اس کے اجزاء میں تفاوت وتباین نظر آنے لگتا۔ اسی روح نے اس کے اجزاء کو باہم مربوط ومتصل بنا دیا ہے۔"[1]

سیّد قطب کا زاویۂ نگاہ:

سیّد قطب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے درس ومطالعہ میں ایک دوسری راہ پر گامزن ہوئے۔ چنانچہ نہ تنہا قرآنی الفاظ کی موسیقی ان کے لیے جاذب توجہ ثابت ہوئی۔ اور نہ اس کی ترکیبات کی سحر کاری ان کو اپنے اندر منہمک کر سکی۔ بخلاف ازیں ان کے فکر ونظر کا مرکز ومحور وہ قرآنی الفاظ تھے جن کو تعبیر وبیان اور اظہارِ مطالب کے لیے پسند کیا گیا ہے۔ مزید برآں سید قطب کا شاعرانہ بلکہ ساحرانہ طرز بیان سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ اور وہ بڑی کامیابی سے اسلوبِ قرآن کے حسن وجمال پر روشنی ڈالتے جاتے ہیں۔

سیّد قطب فرماتے ہیں۔

"تصویر کشی سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کو اسلوب قرآن میں دوسرے الفاظ پر ترجیح دی گئی ہو۔ الفاظ کچھ اس انداز سے ترتیب دیے گئے ہوں کہ ایک ذہنی وخیالی چیز کو محسوس ومُبصَر شکل میں پیش کر دیں۔ اس تصویر

[1] تاریخ آداب العرب للرافعی ج ۲ ص ۲۶۰

ہیں اس انداز سے رنگ بھرا جائے کہ اس میں حرکت و زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں ایک ذہنی چیز ہیئت و حرکت اختیار کرے۔ نفسانی حالت مشاہدہ بن جائے اور ایک انسانی تصویر زندہ ہو کر انسانی شکل میں سامنے آ جائے۔ امور طبعیہ مجسم و مرئی بن جائیں۔ حوادث و مشاہد اور قصص و مناظر حیات و حرکت سے بہرہ ور ہو کر زندہ صورت میں سامنے آئیں اور بولنے لگیں۔[1]"

سید قطب اپنی کتاب "التصویر الفنی فی القرآن" کی اس سے اگلی فصلوں میں اپنے طرزِ فکر و نظر کی صحت و سلامت پر دلائل کے انبار لگاتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک فصل میں تخیل حسی و تجسیم کا ذکر کیا ہے۔ دوسری میں نظم و نسقِ فنی کا اور تیسری فصل کو قرآنی قصص و واقعات کے لیے وقف کر دیا ہے۔[2]

سید قطب نے اس ضمن میں جس قدر داد تحقیق دی ہے اس کی غرض و غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ قرآن کے اعجاز کو عصر حاضر کی اصطلاح کے مطابق جانچنا پرکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا موجودہ طبقہ بھی قرآن میں فنی حسن و جمال کے دیکھنے کا متمنی ہے۔ اور یہ بھی چاہتا ہے کہ یہ قدرت قاری میں بھی پیدا ہو اور وہ اپنے شعور و وجدان سے اس ضمن میں استفادہ کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کے معاصر عربوں کو سب سے پہلے قرآنی اسلوب ہی نے مسحور و مخمور کیا تھا۔ وہ اس کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے مگر ایسا نہ کر سکے۔ جب انہوں نے قرآن کے مطالب و معانی پر غور کیا تو وہ اس کے حسنِ بیان کے قائل ہو گئے اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

نظر بریں ہم اس ضمن میں صرف قرآن کے فنی پہلو پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں یہ ایک مستقل عنصر ہے اور قرآن کریم کے اعجاز اور اس کے دائمی و ابدی اسلوب

---

[1] التصویر الفنی فی القرآن از سید قطب ص ۳۳

[2] حوالہ مذکور ص ۱۸۷

و انداز کی انفرادیت و یکتائی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ فنی حسن و جمال کے عنصر میں جو دینی و علمی غایات و مقاصد پائے جاتے ہیں اور جن پر سید رشید رضا نے تفصیل روشنی ڈالی ہے۔ سردست وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

سید رشید رضا نے مندرجہ ذیل موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

۱۔ قرآن کریم علوم دینیہ و تشریعیہ کا مخزن ہے۔

۲۔ جن مسائل سے لوگ نابلد تھے قرآن نے انسانوں کو ان سے آشنا کیا۔

۳۔ قرآنی مسائل کا ابطال ممکن نہیں ہے[۱]

بلاشبہ ان امور سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے کہ یہ امور لاتعداد براہین و دلائل سے ثابت شدہ ہیں۔ البتہ یہ امور و مسائل قرآنی بلاغت سے زیادہ فلسفۂ قرآن سے متعلق ہیں علاوہ ازیں قرآن نے فصحائے عرب کو جس بات پر دعوتِ معارضہ دی تھی وہ یہ امور ہرگز نہ تھے۔ بخلاف ازیں عربوں کو اس امر پر دعوت مبارزت دی گئی تھی کہ وہ اس کے اسلوب و انداز کی نظیر پیش کریں۔ نیز یہ کہ منظر کشی میں قرآن کریم کو جو اعلیٰ مقام حاصل ہے اس کا مقابلہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتابِ عزیز کی سحر بیانی ہی اس کا اعجاز ہے۔ آغاز وحی میں ہی اس کی جادو بیانی لوگوں کے دلوں کو مسحور و مسخر کر چکی تھی۔ حالانکہ اس وقت نہ تشریعی آیات اتری تھیں۔ نہ علمی امور پر مشتمل آیات کا کوئی وجود تھا۔ نہ کونیات اور زندگی و انسان سے متعلق آیات کا کوئی نشان تھا۔

جب ہم علوم القرآن سے متعلق قدیم کتب مثلاً اتقان سیوطی پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ ہمارے اسلاف نے کس طرح قرآنی اسلوب کو وجوہِ اعجاز میں سے ایک وجہ قرار دیا تھا۔ تو ہمیں مختلف ابواب میں بکثرت ایسے عنوانات دکھائی دیتے ہیں جو اعجاز کے جدید مفہوم کی نشان دہی کرتے ہیں تاہم مطالعہ کو جاری رکھنے کے باوجود ہمیں اس میں

---

[۱] تفسیر المنار ج ۱ ص ۱۹۸ تا ۲۰۸ نیز مناہل العرفان زرقانی ج ۲ ص ۲۲۷ تا ۲۰۲۔

جمالِ قرآنی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ دورانِ مطالعہ یہ حقیقت ضرور اجاگر ہوتی ہے۔ کہ ہمارے علمائے سلف تفریع وتبویب اور شواہد قلیلہ سے کثیر قواعد بلاغیہ کے استخراج واستنباط کے بے حد شائق تھے۔ سیوطی ہی کو دیکھیے موصوف نے اتقان میں متقدمین کی لاتعداد کتابوں سے اخذ کرکے قرآن سے متعلق تمام بلاغی مباحث کو یکجا کردیا ہے۔ اور وہ نہایت امانت ودیانت سے کتبِ قدیمہ کا حوالہ دیتے جاتے ہیں۔

چنانچہ سیوطی کی اتقان میں قرآن کے تشبیہ واستعارہ کنایہ وتعریض حقیقت ومجاز حصر وتخصیص ایجاز واطناب خبر وانشاء جدل ومناظرہ اور امثال واقسام سب مباحث پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ قرآن کے ادبی فنون میں سے کوئی فن سیوطی کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہا۔ مفسرین سلف میں سے جس کسی نے بھی قرآن کے فنی حسن وجمال کے بارے میں کوئی خوبصورت جملہ کہا تھا سیوطی نے اس کو ذکر کردیا ہے۔

اگرچہ ہم اُسلوبِ قرآن کے عنصر کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور اعجاز القرآن کے سلسلہ میں اس کو ایک اساسی واصولی عنصر قرار دیتے ہیں۔ تاہم ان رسمی وتقلیدی مباحث میں ہم کو قرآن کے اصلی سحر کا منبع کہیں نظر نہیں آتا۔ چونکہ ہم اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کی سحرکاری اس کے ہر مقطع ومشہد کے نظم ونسق میں مضمر ہے۔ اس لیے ہم اتقان سیوطی کے بعض عنوانات اور ان کے پیش کردہ قرآنی شواہد وامثلہ صاحب موصوف کے نقد وتبصرہ سمیت نقل کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ ہم کس طرح ان میں حسن وجمال کے مقامات کو ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ ہم اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ ہمارے اور امام سیوطی کے مباحث کے عنوانات یکساں اور مشترک ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے خیال میں خارجی وظاہری اصطلاحات قرآن کی داخلی وباطنی عمیق روحانیت کو تبدیل نہیں کرسکتیں۔

قرآن میں تشبیہ، استعارہ کا استعمال:

سیوطی اس باب میں تشبیہ کی تعریف آلات تشبیہ طرفین اور وجہ شبہ کے اعتبار سے تشبیہ کے اقسام بیان کرتے ہیں۔ تشبیہ کو دو قسموں (مفرد و مرکب) میں تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

تشبیہ مرکب کی تعریف یہ ہے کہ وجہ شبہ چند امور کے مجموعہ سے ماخوذ ہو۔ مثلاً یہ آیت کریمہ:

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا۔[1] گدھے کی طرح جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہوں

مذکورہ صدر آیت میں تشبیہ گدھے کے حالات سے مرکب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کتابوں جیسی مفید چیز اس پہ لادی گئی ہے۔ وہ ان کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے مگر اسے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری آیت میں فرمایا:۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ[2] دنیوی زندگی کی مثال پانی کی ہے جس کو ہم نے آسمان سے اتارا۔

قرآن کریم میں اس موقع پر دس جملے جمع ہو گئے ہیں اور ان کے مجموعہ سے تشبیہ مرکب ماخوذ ہے۔ اگر ان میں سے کوئی جملہ ساقط ہو جائے تو تشبیہ میں خلل پیدا ہو جائے گا۔ ان آیات میں دنیا کے جلد فنا پذیر ہونے اس کی نعمتوں کے مائل بزوال ہونے اور لوگوں کے اس کے دام فریب میں مبتلا ہونے کو بارش کے پانی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ پانی آسمان سے اترتا ہے۔ پھر اس سے قسم قسم کی گھاس اگتی ہے۔ اور زمین نئی نویلی دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ ہو جاتی ہے۔ جب لوگ اپنی امیدیں اس

---

[1] سورۃ الجمعۃ۔ ۵

[2] سورۃ یونس۔ ۲۴

سے وابستہ کرتے اور سمجھتے ہیں کہ اب کوئی آفت اس کو تباہ نہیں کر سکتی تو اچانک عذابِ خداوندی اس کو اپنی گرفت میں لے کر ملیا میٹ کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ یوں ہو جاتی ہے کہ گویا کبھی آبادی نہ تھی۔

ہم امام سیوطی کی بیان کردہ تشبیہ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف وجہ شبہ کے استخراج اور اس قرآنی تشبیہ کو دس جملوں سے ماخوذ قرار دینے میں حق بجانب ہیں جہاں تک مختصر اور زوال پذیر دنیوی زندگی میں حسن و جمال کا تعلق ہے۔ سیوطی نے اس مقام کی نشان دہی نہیں کی۔ اور نہ ان صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو ہر جملہ میں طولاً یا قصراً پائی جاتی ہیں۔ اس لیے مصور کے مختلف النوع مراحل کے پیش نظر عرض خیالی ہیں جو بُعد و نفاذ ۔۔ پایا جاتا ہے وہ تشبیہ مرکب میں شامل نہیں ہے۔ سیوطی کا کام صرف آیت کے عام مفہوم پر روشنی ڈالنا تھا اور وہ کام موصوف نے خوش اسلوبی سے انجام دے دیا۔

سیوطیؒ آگے چل کر اسی باب میں استعارہ کا ذکر کرتے اور ارکان استعارہ کے پیش نظر اس کو پانچ اقسام میں منقسم کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ہر قسم کے اثبات میں مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ جب آیت کریمہ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَؕ تک پہنچتے ہیں تو اس کو استعارہ محسوس بطریق محسوس قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> طلوع صبح کے وقت مشرق سے رفتہ رفتہ روشنی کے نمودار ہونے کے لیے آہستہ آہستہ سانس لینے کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح روشنی تدریجی طور پر نمودار ہوتی ہے اسی طرح سانس بھی رفتہ رفتہ

---

۵۱ الاتقان ج ۲ ص ۷۰ ۔ نیز تلخیص البیان فی مجازات القرآن للشریف الرضی ص ۱۵۵

۵۲ سورۃ التکویر ۔ ۱۸

۵۳ الاتقان ج ۲ ص ۴ ۔ نیز مجازات القرآن للرضی ص ۳۰۰

کیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں محسوسات کے قبیل سے ہیں "
مگر سیوطی یہ بیان کرنا بھول گئے کہ اس آیت میں صبح کو زیورِ حیات سے آراستہ کرکے ایک ایسا زندہ انسان ٹھہرایا گیا ہے جو نہ صرف سانس لیتا بلکہ جذبات واحساسات سے بھی بہرہ ور ہے۔

اسی طرح سیوطی آیت قرآنی بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ[1] کو استعارہ محسوس برائے معقول بطریق عقل قرار دیتے ہیں۔ مذکورہ صدر آیت میں قذف و دمغ (پھینکنا اور دبا لینا) محسوس اور مستعار ہیں۔ حق و باطل عقلی چیزیں ہیں اور دونوں مستعار لہٗ ہیں[2]

مجاز و کنایہ:

ہم تشبیہ واستعارہ سے متعلق جو بحث کر چکے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ قرآنی طرزِ تعبیر و بیان کے بارے میں ہم جو تصور رکھتے ہیں اس میں اعتدال سے کام لیں۔ علمائے سلف کا زاویہ نگاہ بھی یہی ہے۔ یہ اعتدال تشبیہ واستعارہ کے سلسلہ میں نہایت ضروری ہے ان کے علاوہ دیگر مسائل کے فہم و تصور میں فکر و نظر کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ قدیم تصنیفات میں ان کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ ہمارے قدماء ان مسائل کی تفریع و ترتیب اور ان کے شواہد و امثلہ پیش کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ وہ ہر نص کی روحِ ترکیب سے اس کا فہم و ادراک حاصل کر لیتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مجاز عام کے بارے میں بات کر رہے ہوں جس میں مشابہت کا علاقہ نہیں ہوتا۔ یا ان کا موضوعِ سخن کنایہ ایجاز مساوات واطناب خبر وانشاء یا ان سے ملتے جلتے مباحث ہوں دورِ حاضر کے علماء کے لیے قدیم تصنیفات سے استفادہ آسان بھی ہے اور مفید بھی

---

[1] سورۃ الانبیاء۔ ۱۸
[2] الاتقان ج ۲ ص ۴۷

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علمائے متقدمین کے لیے عربی اور خصوصاً قرآنی اسلوب کی طلب وتلاش آسان ترتھی اور وہ اس کے اصلی منابع سے زیادہ قریب تھے۔ ہم اس ضمن میں جب ان کے افکار و آراء پیش کرتے ہیں تو یہ انہی کے نور کی ضیا پاشی ہے جس سے ہم مستنیر ہوتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ بعض علماء نے قرآن میں مجاز کے وجود و وقوع سے انکار کیا ہے۔ اس ضمن میں ظاہریہ[1] فرقہ کے علماء نیز شوافع میں سے ابن القاص[2] مالکیہ میں سے ابن خویز منداذ[3] کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں ان کا نقطۂ استدلال یہ ہے کہ مجاز ایک طرح کا جھوٹ ہے اور قرآن کریم کا دامن جھوٹ سے پاک ہے دوسری بات یہ ہے کہ متکلم مجاز کی طرف اس وقت رجوع کرتا ہے جب حقیقت متعذر ہو۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز بھی دشوار اور محال نہیں ہے۔

قرآن کے ذوق آشنا اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ یہ شبہ باطل ہے۔ اگر قرآن سے مجاز کو خارج کر دیا جائے تو اس کا حسن آدھا رہ جائے۔ بلغاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مجاز حقیقت سے بلیغ تر ہے۔ اور اگر قرآن کا مجاز سے خالی ہونا ضروری ہوتا تو اس کا حذف وتاکید اور واقعات کی تکرار سے منزّہ ہونا بھی واجب ہوتا[4]

چونکہ بعض علماء کنایہ کو مجاز کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ اس لیے جو علماء قرآن میں وقوع مجاز کے منکر ہیں انہوں نے قرآن میں کنایہ کے وجود سے بھی انکار کیا ہے۔

---

[1] امام داؤد بن علی بن خلف ظاہری کے تبارع کو ظاہریہ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ظواہرِ نصوص سے اخذ و احتجاج کرتے تھے۔

[2] ابن القاص کا نام احمد طبری اور کنیت ابو العباس ہے یہ شافعی مسلک کے عظیم فقیہ تھے "ادب القاضی" ان کی مشہور تصنیف ہے ۳۳۵ھ میں وفات پائی (طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۰۳)

[3] ابن خویز منداذ مالکی مسلک کے مشہور فقیہ تھے۔ یہ امام الابہری کے شاگرد تھے ۳۹۰ھ میں وفات پائی [4] الاتقان ج ۲ ص ۵۹

مگر کنایہ کا مجاز کے علاوہ ایک اور مفہوم بھی ہے۔ کنایہ اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے اس کے معنی کے لوازم مراد لیے جائیں۔ قرآن میں یہ بکثرت وارد ہوا ہے۔ اس لیے کہ رمز واشارہ کے لیے کنایہ سے بہتر دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کے بیشتر مقامات میں جہاں تصریح کی گنجائش نہ تھی کنایہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً شادی بیاہ کی غرض وغایت نسل انسانی کا تحفظ ہے۔ قرآن نے اس کو "الحرث" (کھیتی) سے تعبیر کیا۔

قرآن میں فرمایا:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ[1] — تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ تم اپنی کھیتی کو جیسے چاہو آؤ۔

زوجین کے باہمی ربط وتعلق کی بنا پر ان کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ[2] — عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

اسی طرح مندرجہ ذیل آیت میں تعبیر وبیان کا ادب سکھاتے ہوئے فرمایا۔

أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَآءَ[3] — یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔

نیز فرمایا۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ[4] — روزہ کی رات میں عورتوں کے ساتھ تفریح طبع کو تمہارے لیے حلال قرار دیا

---

[1] سورۃ البقرۃ۔ ۲۲۳ (الاتقان ج ۲ ص ۴۹)

[2] سورۃ البقرۃ ۱۸۷ (البرھان ج ۲ ص ۳۰۲ و مجازات القرآن ص ۲۵۴)

[3] سورۃ النساء۔ ۴۳

[4] سورۃ البقرۃ۔ ۱۸۷

دوسری جگہ فرمایا:

فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا۔[۵۱] — جب وہ (آدم) اس (حوا) کے پاس گئے تو اس نے ہلکا سا بوجھ اٹھا لیا کہ امید سے ہو گئیں۔

خوبصورت ترین کنایہ کی مثال مندرجہ ذیل آیت ہے:

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ۔[۵۲] — جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

نیز یہ آیت:

وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ۔[۵۳] — اور وہ مرد اور عورتیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتی ہیں۔

ان آیات میں "فروج" سے قمیص اور کپڑے کا دامن مراد ہے[۵۴] مقصود یہ ہے کہ مومن مرد و عورت کا دامن اخلاقی آلودگی سے ملوّث نہیں ہوتا اور وہ پاک دامن اور عفیف ہوتے ہیں۔

قرآن میں فرمایا:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔[۵۵] — اور اپنے کپڑے صاف رکھ۔

مذکورہ صدر آیت میں کپڑوں کی صفائی سے پاکدامنی اور عفت مراد ہے[۵۶] اس طرز تعبیر و ادا کو "کنایۃ عن کنایۃ" کہتے ہیں۔ مفسرین نے مذکورہ ذیل آیت کی تفسیر میں یہی بات کہی ہے۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا[۵۷] — اور مریم بنت عمران جو عفیف اور پاکدامن رہی

---

[۵۱] سورۃ الاعراف ۔ ۱۸۹
[۵۲] سورۃ المومنون ۔ ۵
[۵۳] سورۃ الاحزاب ۔ ۳۵
[۵۴] البرھان ج ۲ ص ۳۰۵
[۵۵] سورۃ المدثر ۔ ۴
[۵۶] مجازات القرآن ص ۲۰۳، وذیل مشکل القرآن ۱۰۷
[۵۷] سورۃ التحریم ۔ ۱۲

احصان فرج (شرمگاہ کی حفاظت) پاکدامنی اور عفت کا ملہ سے کنایہ ہے [51]

قرآن کریم رمز و ایماء کا بڑی حد تک دلدادہ ہے وہ خداوندی ذات وصفات سے متعلق دینی حقائق کو اس طرز و انداز سے بیان کرتا ہے کہ ان کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی حُسن بیان کے نتیجہ میں وہ ذہنی افکار جو مادی صورت سے مجرد ہوتے ہیں محسوس صورت میں سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے جود و کرم کی وسعت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ [52]	اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

جہاں بندوں کو اسراف و تبذیر سے منع کیا وہاں فرمایا۔

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ [53]	اور اپنے ہاتھ کو پوری طرح نہ کھول۔

مطلب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ اس طرح نہ خرچ کرو جیسے کوئی شخص ہاتھ کھول دے اور خرچ سے باز نہ ہے۔ اسی طرح مندرجہ ذیل آیت میں غیبی امور کو "مفتاح الغیب" (غیب کی کنجیاں) کہہ کر پکارا۔

ارشاد فرمایا:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ [54]	اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اس کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا۔

خداوند عالم ہی رزاق حقیقی اور خزانوں کا مالک ہے۔ اس مفہوم کو کنایہ کے رنگ میں یوں ادا کیا۔

---

[51] الاتقان ج ۲ ص ۹۷ نیز البرهان ج ۲ ص ۳۰۵-۳۰۶
[52] سورۃ المائدۃ ۶۴ (البرهان ج ۲ ص ۳۰۸ نیز الاتقان ج ۲ ص ۹۷
[53] سورۃ الاسراء - ۲۹
[54] سورۃ الانعام - ۵۹ (مجازات القرآن ص ۱۳۶)

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ؕ۵۱	اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس موجود نہ ہوں اور ہم اس کو ایک خاص اندازہ کے مطابق ہی اتارتے ہیں۔

اسی طرح قرآن میں فرمایا:

وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۵۲	اور انہوں نے کہا گرمی کے موسم میں جنگ کے لیے نہ جاؤ آپ فرما دیں کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے

اس آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جہنم کی آگ دنیوی آگ سے زیادہ گرم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے قرآن کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن کے مخاطب اس بات سے پہلے ہی آگاہ تھے۔ پھر قرآن نے کونسی نئی بات بتائی۔ اس آیت کی اصلی غرض جہاد سے پیچھے رہنے والوں کو یہ بتانا ہے کہ جو لوگ گرمی کی شدت کا عذر پیش کرتے ہیں۔ وہ عنقریب جہنم کی ناقابل بیان گرمی اور اس کی شدت و حدت سے دوچار ہوں گے۔

---

۵۱ سورۃ الحجر۔ ۲۱

۵۲ سورۃ التوبۃ۔ ۸۱

فصل چہارم

قرآنِ حکیم کا صوتی اِعجاز

قرآن کریم کا صوتی حسن وجمال:

قرآنِ کریم کی ہر آیت و سورت ہر مقطع و مطلع اور ہر آغاز و انجام میں ایک خاص قسم کا صوتی حسن وجمال پایا جاتا ہے۔ یہ حسن ایک خاص اسلوب و انداز کا حامل موسیقی سے بھرپور اور نغمہ سے معمور ہوتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ کتاب عزیز کی ایک سورت کا دوسری سورت اور ایک مقطع کا دوسرے مقطع کے ساتھ موازنہ ومقابلہ بھی درست نہیں۔ جب ہم کسی خاص سورت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ فلاں مخصوص طرز و انداز کی حامل ہے تو اس سے ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا واضح اور نمایاں موید بالدلیل طرز ومنہاج یہ ہے۔ ورنہ قرآنی بلاغت اور اس کی جادو بیانی کا تانا بانا بالکل یک رنگ وہم آہنگ ہے۔ البتہ اس کے لہجہ و سخن میں موسیقی کا سا تنوع پایا جاتا ہے۔

سیّد قطب (شہید رحمہ اللہ تعالیٰ) کی تائید میں اگر ہم یہ کہیں کہ قرآنِ کریم کی سحر بیانی کا راز اس کے نظم ونسق میں مضمر ہے۔ تو یہ بات بعید از قیاس نہ ہو گی۔ یہ نظم و ترتیب شعر ونثر کے اوصاف وخصائص کی جامع ہے۔

سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں۔

قرآن کریم اوزان وقوافی کے حدود وقیود سے پاک ہونے کی بنا پر تعبیر و بیان کی آزادی کی صفات سے بہرہ ور ہے مگر اس کے دوش بدوش اس میں شعر کی باطنی موسیقی اور ایسے ہم وزن فواصل (آیت کے آخری لفظ کو فاصلہ کہتے ہیں۔ فواصل اس کی جمع

ہے) پلٹے جاتے ہیں جو شعری اوزان وقوافی سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔اس طرح قرآن حکیم شعر ونثر دونوں کے اوصاف وخصائص کا جامع ہے۔"
(التصویر الفنی فی القرآن از سید قطبؒ ص ۸۶)

یہ داخلی موسیقی قرآن کریم کی ہر ہر آیت اور ہر لفظ سے نمایاں ہے۔ہر لفظ اپنا ایک جداگانہ حسنِ صورت اور ایک منفرد رنگ ڈھنگ رکھتا ہے۔یہ دوسری بات ہے کہ کسی میں یہ رنگ آمیزی ہلکی ہوتی ہے اور کسی میں گہری اور شوخ وشنگ۔ ذرا مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمایئے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝[1]	کچھ چہرے اس روز بارونق ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔اور کچھ چہرے منہ بسورتے ہوئے رنجیدہ ہوں گے اور یہ خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کو سخت عذاب دیا جائے گا۔

صلحاء واشقیاء کی منظرکشی اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح مندرجہ ذیل آیت کو دیکھئے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ[2]

ان آیات کا تلفظ ہی بڑی حد تک ان کے مفہوم کی ترجمانی کرتا ہے

دوسری جگہ فرمایا

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ[3]	جس کو آگ سے دور اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔

لفظ "زحزح" کی آواز ہی سے دوری کا مفہوم واضح ہو رہا ہے۔عربی لغت

---

[1] سورۃ القیامۃ ۲۲-۲۵ [2] سورۃ التکویر-۱۵

[3] سورۃ آل عمران ۱۸۵ - (تفسیر کشاف ج ۱ ص ۲۳۵)

میں دوسرا کوئی لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔

قرآن میں فرمایا:

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ[۱] — کچھ بعید نہیں کہ (جہنم) غصہ سے پھٹ جائے۔

اس آیت میں تمیّز کا لفظ پڑھ کر قاری کو اسی طرح غصہ آنے لگتا ہے جس طرح اس آیت میں جہنم کے غصہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الحاقۃ کی آیات کے فواصل (اواخر آیات) پڑھ کر قاری قلق و اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مذکورہ صدر سورت میں فرمایا:

مَآ أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ[۲] — میرا مال میرے کسی کام نہ آیا میری سلطنت مجھ سے جاتی رہی۔

ان فواصل میں ھاء سکتہ کی تکرار قاری پر قلق و ملال طاری کر دیتی ہے۔

ارشاد فرمایا:

وَيُسْقَىٰ مِن مَّآءٍ صَدِيدٍ ۝ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ[۳] — اور اس (کافر) کو پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ وہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیئے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔

اس آیت میں یَتَجَرَّعُهُ کے لفظ ہی سے گرانی اور ناپسندیدگی ٹپک رہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ کون شخص ہے جو قرآن کی کوئی چھوٹی یا بڑی مکی یا مدنی سورت پڑھے اور پھر اس کا نظم دلکش اور خوش آیند صوتی حسن اس کے جذبات و احساسات کو بیدار نہ کر دے۔ قرآن اپنے صوتی نظم و ترتیب کے اعتبار سے ایک منفرد و یکتا حیثیت کا حامل

---

[۱] سورۃ الملک - ۸

[۲] سورۃ الحاقۃ - ۲۹

[۳] سورۃ ابراہیم ۱۷ (الکشاف ج ۲ ص ۲۹۷)

ہے۔ خواہ اس کو مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے یا اس کی انفرادی سورتوں کا تجزیہ کیا جائے اس طرح قرآن کریم کی مختلف ومتنوع سورتوں سے ہم بسہولت ایسے اجزاء منتخب کر سکتے ہیں جو دعا سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر دیکھیں کہ بوقت سحر ان کی تلاوت و قرأت کیا لطف دیتی ہے۔

دعا بذات خود بھی ذات باری کی جانب بلند ہونے والا ایک نغمہ ہے۔ دعا عاجز داعی کے دل پر اسی صورت میں خوش آیند اثر ڈالتی ہے۔ جب اس کے الفاظ بڑے ہی چیدہ و برگزیدہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعائیں مقفیٰ و مُسجع اور باہم یک رنگ و ہم آہنگ ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں انبیاء وصلحاء کی جو دعائیں منقول ہیں وہ بھی حسنِ صوت اور سحر بیانی کی آئینہ دار ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ شوق وخوف یا بیم و رجا کی بناء پر صلحا کے عجز وانکسار کے مظاہر سے قرآن بھر پور اور معمور ہے۔ تو قرآن کریم کی ہر آیت سے ہمیں نغمہ سا اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے[1]

یہ قرآنی سحر بیانی ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ اس میں بیان کردہ دعاؤں کے ہر لفظ سے ایک خاص نغمہ پیدا ہوتا اور اس کے ہر لہجہ سے خیالات کی ایک وسیع دنیا جنم لیتی ہے۔ جب ہم نگاہ تصور سے دیکھتے ہیں کہ ایک نبی خلوت میں بڑے عجز والحاح کے ساتھ خدا کو پکار رہا ہے۔ اور اس کے خفیہ الفاظ آسمان کی جانب چڑھ رہے ہیں تو ہمیں موسیقی سے لبریز فضا کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اندازہ لگا بیٹھے کہ اگر ہم صلحاء کی ایک ایسی جماعت کا تصور کریں جن کا نقشہ مندرجہ ذیل آیت میں کھینچا گیا ہے تو کیا کیفیت ہو گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ وہ لوگ جو آسمان وزمین کی تخلیق کے بارے

[1] احیاء علوم الدین للغزالی ج ۱ ص ۳۰۱ - ۲۷۳ نیز کتاب الاذکار والدعوات

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ میں غور و فکر کرتے ہیں۔

ہم نگاہِ تصور سے دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ مرد ہوں یا عورتیں بوڑھے ہوں یا جوان بڑی نرم اور باترتیب آوازوں کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں۔ یہ آوازیں کبھی بلند اور کبھی نیچی ہوتی ہیں۔ یہ سب مل کر بارگاہ ایزدی میں گڑگڑاتے اور یہ ترانے الاپتے ہیں۔

(۱) رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔	اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے کار نہیں بنایا ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالے۔
(۲) رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۔	اے ہمارے رب جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اس کو تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔
(۳) رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۔	اے ہمارے رب ہم نے ایک شخص کو ایمان کی ندا دیتے سنا کہ ایمان لاؤ اور ہم ایمان لے آئے۔
(۴) رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۔ (سورۃ آل عمران ۱۹۱-۱۹۴)	اے ہمارے رب ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیوں کو دور کر دے اور ہم کو نیکیوں میں شامل کر کے موت دے۔

مذکورہ صدر آیات میں "ربنا" کے لفظ کی تکرار دل کو نرم کرتی اور اس میں ایمان کی حلاوت پیدا کرتی ہے۔ دعاؤں کے سلسلہ میں قرآنی الفاظ کی یک رنگی و ہم آہنگی کی بیسوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر ہم مزید نظائر و امثلہ پیش کر کے اپنے بیان کو طول نہیں دینا چاہتے اس لیے کہ ہمارا مقصد اس کتاب میں ایجاز و اختصار کے ساتھ ضروری مطالب کو پیش کرنا ہے۔ مزید برآں اصلی موضوع سخن قرآنی علوم و فنون ہیں۔ اور ہم نے بالاختصار تاریخی ادوار کے مطابق ان کو پیش کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے مختصراً اعجاز القرآن اور قرآن کریم کے فنی نظم و نسق پر بھی گفتگو کی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے قرآن کریم کا صوتی حسن و جمال! اس پر طرّہ یہ کہ آیات کے آخری الفاظ (فواصل) میں اشعار کے قوافی کی طرح کسی خاص وزن کا التزام نہیں پایا جاتا۔ ان میں حرکات و سکنات کی پابندی بھی نہیں ہوتی۔ اس کے نظم و نسق میں حشو و تطویل تکرار و زیادت اور حذف و نقصان کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ قرآن کے الفاظ کو باہم ملا کر ان میں ابہام و اجمال بھی نہیں پیدا کیا جاتا۔ مختصر یہ کہ فواصل (آیات کے آخری الفاظ) ہر قید و شرط سے آزاد ہوتے ہیں قرآنی نظم ہر تصنّع و تکلف سے پاک ہے۔ الفاظ میں کسی قسم کی تعقید (معنوی یا لفظی پیچیدگی) نہیں پائی جاتی۔ قرآنی اسلوب اپنی غرض و غایت کے پورا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا خواہ اس کا طرز و انداز کیسا بھی ہو۔ وہ نرم ہو یا سخت۔ پر سکون ہو یا ہیجان خیز۔ ہر حال میں وہ اس طرح رواں دواں ہوتا ہے جیسے بہتا ہوا پانی جس سے پودوں کو سیراب کیا جائے اور سختی کے وقت اس میں وہ شدت و حدت ہوتی ہے جیسے تیز و تند آندھی جو لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہو۔

خاتمۃ الکتاب!

قرآن کریم کی حقیقت و اصلیت

یہ ہے قرآن حکیم! نہ اس میں کوئی من گھڑت جھوٹی بات ہے نہ کسی کاذب کا ظن و تخمین۔ یہ شاعرانہ اور ادیبانہ اوہام و تخیلات کا پلندہ بھی نہیں۔ فصحاء کا کلام اس کے اچھوتے اور انوکھے اسلوب و انداز کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ وحی و تنزیل اور وحی ربانی ہے جو ذکر دوام کے طور پر سرورِ کائنات ؐ پر نازل ہوئی۔ یہ آنحضور ؐ کے کلام سے بھی ممیز و ممتاز ہے جو باقی انسانوں کی طرح (بشریت و انسانیت میں عظمت و فضیلت میں نہیں) ایک انسان تھے۔ یہ وحی بالکل اسی قسم کی تھی جیسی انبیائے سابقین علیہم السلام پر نازل ہوتی رہی تھی۔ اس میں ندرت اور عجوبہ پن نہیں پایا جاتا۔

یہ وحی قرآن ہے جو انفرادی و اجتماعی احداث و وقائع کے ساتھ ساتھ قسط وار تیئیس ۲۳ سالوں میں تدریجاً نازل ہوا۔ اس کے تدریجی نزول میں ہدایت و بشارت اور مومنوں کے لیے پند و موعظت کا سامان ہے خداوند کریم نے اس کتاب عزیز کو سینوں اور سفینوں میں محفوظ کر دیا۔ کسی کتاب کے لیے وہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ جو قرآن کے حصہ میں آیا قرآن کے سوا کوئی کتاب اپنی سُور و آیات حروف و الفاظ وجوہِ قرأت نقاط و رسم الخط اجزاء و منازل صُحف و مَصاحف تحسین خط اور تزیین طباعت کے ساتھ تواتر ہم تک نقل ہو کر نہیں پہنچی۔

علماء نے اس کتاب عزیز کو اپنی توجہات کا مرکز و محور بنا لیا۔ حتیٰ کہ اس کی آیات و حروف اور الفاظ معجمہ (نقطہ دار) و مہملہ (غیر منقوطہ) تک شمار کر لیے۔ علماء نے یہ بھی بتایا کہ قرآن حکیم میں سب سے بڑا لفظ کون سا ہے اور سب سے چھوٹا کونسا؟

نیز یہ کہ سب سے زیادہ حروفِ متحرکہ کس لفظ میں یکجا ہوئے ، بلکہ اس سے بھی فروتر درجہ کے مباحث میں مشغول رہے ۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ تحفظ قرآن میں حصہ لے کر انہوں نے خداوند تعالیٰ کے ازلی ارادہ کی تکمیل کی ہے ۔ اور اس لیے وہ مستحق اجر و ثواب ہیں ۔

جہاں تک ان دقیق قرآنی علوم کا تعلق ہے جو اس کے غایات و مقاصد اور کلیات و جزئیات پر روشنی ڈالتے اور کونیات حیات انسانی اور بنی نوعِ انسان کے سلسلہ میں قرآن کے روحانی فلسفہ کے آفاق و اطراف کی صورت گری کرتے ہیں تو ان کے اصول و قواعد کے وضع کرنے میں علماء نے بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے ۔ اسی خاطر علماء نے اپنے فکری مدارس کی بناء ڈالی ۔ علمی کتب تصنیف کیں اور ان کی اساس پر فلسفی فقہی اور روحانی مذاہب کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا ۔

اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ سابقہ مباحث میں ہم نے جن قرآنی علوم کی تفصیلات بیان کی ہیں ان سے قاری کا دل و دماغ جاگ اٹھا ہے ۔ چنانچہ " اسباب النزول " کے باب میں ہم نے وہ واقعات قلمبند کیے ہیں جو آیات کے فہم و ادراک اور ان کی صحیح ترین تاویل و تفسیر کے متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں ۔ پھر اہل تحقیق مفسرین کا وہ مقیاس و معیار بتایا جو انہوں نے اسباب نزول سے متعلق روایات کی ترجیح کے سلسلہ میں وضع کیا ہے ۔ اس کے بعد فنی نظم و نسق پر روشنی ڈالی جس سے اسباب نزول کی عدم معرفت کی صورت میں مدد لی جاتی ہے ۔

مکی و مدنی آیات اور سورتوں کے بیان میں ہم نے سب سے پہلے مکہ میں دعوت اسلامی کی رفتار کا ذکر کر کے مستشرقین کی تردید کی ہے تاکہ ہر باانصاف شخص آغاز وحی کی صاف و شفاف صورت دیکھ لے جس میں کوئی ابہام و التباس نہیں پایا جاتا ۔ سیرت النبی کے اسی پہلو کی تشریح و توضیح کی بناء پر ہر مورخ مفسر اور ادیب

وحی کے آیندہ مراحل و ادوار کا مقام متعین کر سکتا ہے۔ جو مکہ یا مدینہ میں پیش آئے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ وحی رات کو بھی اترتی اور دن کو بھی۔ گرمی میں بھی اور سردی میں بھی اسی طرح سفر و حضر اور صلح و جنگ میں بھی وحی کا سلسلہ جاری رہتا۔ ہم مکی سورتوں کے مراحل سہ گانہ پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال چکے ہیں۔ اسی طرح ہم نے مکی سورتوں کے الفاظ و فواصل نظم و ترتیب اور ان میں بیان کردہ احکام و عقائد کی نمایاں خصوصیات بھی تلمیند کی ہیں۔

۱۔ ابتدائی مکی سورتوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ ان میں وارد شدہ آیات نہایت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان میں حد درجہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ آیات کے آخری الفاظ (فواصل) ہم وزن و ہم قافیہ ہیں۔ ان میں عجیب قسم کا صوتی تناسب پایا جاتا ہے۔ کبھی پانی کی طرح بہتی اور کبھی موجوں کی طرح بل کھاتی ہیں۔ گاہے اونچی اور گاہے نیچی ہوتی ہیں۔ آواز میں کبھی شدت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی نرمی۔

۲۔ دوسرے مرحلہ کی مکی سورتوں کے بارے میں ہم نے بتایا تھا کہ پہلے مرحلہ کی سورتوں کے موضوعات نے ایک مستقل اور جداگانہ صورت اختیار کر لی ہے۔ جب یہ سورتیں اتریں اس وقت مشرکین اسلامی دعوت سے سہمے سہمے رہنے لگے تھے۔ تاہم ان دونوں مرحلوں کی سورتوں کا اسلوب و انداز تقریباً یکساں ہے۔ مقاطع و فواصل ملتے جلتے ہیں۔ رنگ آمیزی کی وہی فراوانی جو ابتدائی مرحلہ کی سورتوں میں ہے۔ صوتی حسن و جمال بھی بڑی حد تک یکساں نوعیت کا ہے۔

۳۔ تیسرے مرحلہ کی مکی سورتوں کا رنگ ڈھنگ بالکل نیا ہے۔ اس مرحلہ کی لمبی سورتیں مکی وحی کے آخری دور اور مدنی وحی کی ابتداء کے درمیان سنگھم اور نقطہ اتصال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس مرحلہ کی متعدد سورتیں لمبی لمبی ہیں بعض سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے کیا گیا ہے۔ بعض سورتوں میں جلیل القدر انبیاء کے قصص و واقعات بیان کیے

کیے گئے ہیں۔

مکی سورتوں کے مراحل سہ گانہ کے جو نمونے ہم نے پیش کیے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ کہ سابق و مسبوق سورتوں کی جانچ پرکھ کچھ بھی مشکل نہیں ہے بشرطیکہ ان سورتوں کو نظر انداز کر دیا جائے جن کی ترتیب زمانی کے بارے میں محققین مختلف الرائے ہیں۔ ہم نے ایسے آثار و علامات کی نشان دہی کر دی ہے جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مکہ کی ابتدائی سورتیں کون سی ہیں۔ کون سی متوسط اور کون سی آخری ہیں۔

مدینہ منورہ میں جو سورتیں نازل ہوئی تھیں ان کے مراحل کی تعیین نہایت آسان ہے۔ کیونکہ اس وقت اسلام پھیل چکا تھا اور لوگ عام طور پر سورتوں کے نزول سے آگاہ تھے۔ نظر بریں مدنی سورتوں میں سے ہم نے سورۂ انفال کے اہم مسائل بیان کر دیے تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم قرآن کے ادبی پہلو کے بجائے اس کے فقہی پہلو کو اجاگر کر رہے ہیں سورہ انفال کے مندرجات پر بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ مدنی سورتوں کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ ان میں عبادات و معاملات حلال و حرام شخصی احوال سیاسی و اقتصادی قوانین صلح و جنگ کے حالات غزوات کی تفصیلات اور اس قسم کے دیگر شرعی حقائق مذکور رہیں۔

غالباً قاری اس حقیقت سے آگاہ و آشنا ہو چکا ہے کہ ہم نے مکی و مدنی کے بیان میں کس لیے طوالت سے کام لیا اور اس کا راز کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مستشرقین اور ہمارے ملک کے مغرب زدہ مفکرین نے مکی مدنی سورتوں کے بارے میں جس قدر شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے اور کسی مسئلہ کے بارے میں نہیں کیا۔ انھوں نے اس ضمن میں بھی شکوک کا اظہار کیا ہے کہ آغاز وحی کے وقت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کتنی تھی۔ نیز یہ کہ آنحضورؐ کے خاص حالات کی بناء پر مکی و مدنی سورتوں کے اسلوب و انداز میں تبدیلی کس لیے پیدا ہوئی؟ مکی مدنی سورتوں کی ترتیب کے بارے

میں بھی وہ مطمئن نہ تھے۔ اسی طرح مدنی سورتوں میں جو مکی آیات موجود ہیں وہ برعکس وہ ان کے بارے میں بھی شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ حیرت ہے کہ اسلامی تاریخ سے نابلد ہونے کے باوصف وہ قرآن کریم کو اپنی خواہشات کے مطابق مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ قرآنی بلاغت کے بھی ذوق آشنا نہ تھے۔ انھی اسباب کے پیش نظر ہم نے ان کے شبہات کے دندان شکن جواب دیے اور ان کے تیروں سے ہی ان کو گھائل کر دیا۔

اگلی فصلوں میں ہم نے بیان کیا ہے کہ قرآنی سورتوں کے حروفِ مقطعات کے ساتھ شروع کرتے میں کیا حکمت مضمر تھی۔ پھر ہم نے مشہور قراء کا تعارف کرایا اور قرأت متواتر آحاد اور شاذ کا فرق بیان کیا ہے۔ ہم نے یہ حقیقت کھول کر بیان کر دی ہے کہ محدثین کے اسانید نے تسلسلِ قرأت پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا۔ ہم نے ناسخ و منسوخ کے بارے میں صحیح ترین اور مبنی براعتدال مسلک بھی بیان کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بتایا کہ نسخ و تخصیص، نسخ و بداء، نسخ و انساء اور نسخ احکام و اخبار کے مابین گہرا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے ہم نے وزنی دلائل کی روشنی میں یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ قرآن کی جملہ آیات درا صل محکم ہیں منسوخ نہیں اِلّا یہ کہ کسی صریح دلیل سے کسی آیت کا منسوخ ہونا ثابت ہو جائے۔

قرآنی طرز تحریر کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے عثمانی رسم الخط اور اس کے موافق حکم ربانی ہونے کے بارے میں صحیح نقطہ نظر واضح کر دیا ہے۔ عثمانی رسم الخط کی نصرت و حمایت میں ہم نے مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ان لوگوں کی تائید کی ہے جو جو کہتے ہیں کہ جو شخص قدیم رسم الخط نہ جانتا ہو وہ قرآن کریم کو موجودہ اور عام طور سے مقبول رسم الخط میں تحریر کر سکتا ہے۔ ہم نے برملا کہہ دیا کہ علمائے لغت اور قراء ہی قرآن کریم کو عثمانی رسم الخط میں پڑھنے پڑھانے پر قادر ہیں۔ محکمات و

متشابہات کے بارے میں ہم نے سلف و خلف کے مذاہب بیان کر دیئے ہیں۔ ہم نے بتایا تھا کہ ذات و صفات باری تعالیٰ کو کنایہ کے انداز میں بیان کرنا ہی قرین حسن و جمال ہے۔

قرآنی تفسیر و اعجاز کے ضمن میں ہم نے جو آخری باب باندھا تھا اس میں ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ ہم فن تفسیر کے ارتقائی مراحل کو موضوع سخن بنائیں۔ اور یہ بتائیں کہ یہ علم کن ادوار و مراحل سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچا۔ تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرای کا فرق و امتیاز واضح کرنا بھی ہم پر لازم تھا۔ نیز یہ کہ قرآن آپ اپنی تفسیر کیسے اور کیوں کرتا ہے؟ علاوہ ازیں عام و خاص مطلق و مقید مجمل و مفصل اور نص و ظاہر کی تعریف و توضیح بھی نہایت ضروری تھی۔

آخر کار ہم اعجاز القرآن کی بحث تک پہنچتے ہیں۔ ہمارے خیال میں قرآن عزیز کی جادو بیانی کا راز اس کی نظم و ترتیب میں مضمر ہے۔ یہ نظم اپنی داخلی موسیقی، اپنے ہم وزن فواصل اور قوافی سے بے نیاز کر دینے والی قافیہ بندی کی بناء پر شعر و نثر کے اوصاف و خصائص کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن الفاظ جامدہ کے باوصف معجز ہے۔ حالانکہ بڑے سے بڑا فن کار آب و رنگ اور زیب و زینت کے باوجود اپنے فن میں یہ کمال پیدا نہیں کر سکتا۔ تشبیہ استعارہ کنایہ اور دیگر انواع مجاز کے بیان میں ہم نے متقدمین کی بے جان اصطلاحات کو از سر نو زندہ و پایندہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ صدر مباحث اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ قرآنی فصاحت و بلاغت اور اس کی جادو بیانی کا تانا بانا باہمد گر رشتہ و پیوستہ ہے۔ مگر اس کے نغموں اور ترانوں میں رنگا رنگ کی جو موسیقی پائی جاتی ہے اس نے اس میں تنوع پیدا کر دیا ہے۔

یہ ہے قرآن عزیز! جب بولتا ہے تو حق بولتا ہے۔ تعلیم دیتا ہے تو صرف رشد و ہدایت کی۔ جب صورت گری کرنے پر آتا ہے تو حسین ترین شعبہ زندگی کا منظر پیش

کرتا ہے۔ اور جب اسے ترتیل سے پڑھا جاتا ہے تو کرۂ ارضی کے سب نغمے بے کیف نظر آتے ہیں۔

یہ فرمان باری کس قدر حق ہے کہ۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝

احقر العباد

غلام احمد حریری

یکم اپریل ۱۹۶۶ء

ڈی۔۶۱ پیپلز کالونی ۔ فیصل آباد

فہرست

مصادر و مآخذ (بزبانِ عربی)

بترتیب حروفِ تہجی

(۱) اتحاف فضلاء البشر لاحمد الدمیاطی بالقاہرۃ سنہ ۱۳۵۹ھ

(۲) الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی مطبعۃ حجازی بالقاہرۃ سنہ ۱۳۶۰ھ

(۳) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم لشمس الدین محمد بن احمد بن ابی بکر باعتناء دی خویہ لیدن سنہ ۱۸۷۷م

(۴) احکام القرآن لابن العربی القاہرۃ سنہ ۱۳۳۱ھ

(۵) احیاء علوم الدین للغزالی القاہرۃ سنہ ۱۳۴۶ھ

(۶) ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم لابی السعود مطبعۃ بولاق سنہ ۱۲۷۵ھ

(۷) اسباب النزول للواحدی القاہرۃ سنہ ۱۳۵۱ھ

(۸) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر العسقلانی القاہرۃ سنہ ۱۳۵۸ھ

(۹) الاعلام خیر الدین الزرکلی الطبعۃ الجدیدۃ فی عشرۃ اجزاء

(۱۰) انباہ الرواۃ للقفطی القاہرۃ سنہ ۱۳۷۴ھ

(۱۱) املاء مامنّ بہ الرحمٰن للعکبری القاہرۃ۔ سنہ ۱۳۲۱ھ

(۱۲) انوار التنزیل واسرار التاویل للبیضاوی

(۱۳) اعجاز القرآن للباقلانی القاہرۃ سنہ ۱۳۴۹ھ

(۱۴) البحر المحیط لابی حیان الاندلسی القاہرۃ ۱۳۰۸ھ ۸ مجلدات

(۱۵) بدیع القرآن لابن ابی الاصبع القاہرۃ ۱۳۰۰ھ

(۱۶) البرہان فی علوم القرآن للزرکشی القاہرۃ ۱۳۷۶ھ اربعۃ اجزاء

(۱۷) بغیۃ الوعاۃ للسیوطی القاہرۃ ۱۳۲۶ھ

(۱۸) بیان اعجاز القرآن للخطابی دار المعارف القاہرۃ

(۱۹) تاریخ آداب العرب لمصطفیٰ صادق الرافعی القاہرۃ ۳ اجزاء ۱۳۵۹ھ

(۲۰) تاریخ بغداد للخطیب البغدادی بمصر ۱۳۴۹ھ

(۲۱) تاریخ مختصر الدول لابن العبری بیروت ۱۸۹۰م

(۲۲) تاویلات القرآن (انظر تفسیر الشیخ الاکبر)

(۲۳) تاویل مشکل القرآن لابن قتیبہ القاہرۃ ۱۳۷۳ھ

(۲۴) التبیان لبعض المباحث المتعلقۃ بالقرآن للشیخ طاہر الجزائری۔ القاہرۃ ۱۹۳۴م

(۲۵) تذکرۃ الحفاظ للذہبی طبعۃ حیدرآباد ۱۳۳۴ھ

(۲۶) التصویر الفنی فی القرآن للسید قطب القاہرۃ ۱۹۴۹م

(۲۷) تفسیر الجلالین طبعۃ بولاق ۱۲۸۰ھ

(۲۸) تفسیر الرازی القاہرۃ ۱۳۲۱ھ ۸ مجلدات

(۲۹) تفسیر سورۃ الانفال لمصطفیٰ زید القاہرۃ ۱۳۷۳ھ

(۳۰) تفسیر الشیخ الاکبر (المنسوب الیٰ ابن عربی وھو للکاشی) طبعۃ بولاق ۱۲۸۳ھ

(۳۱) تفسیر الطبری جامع البیان فی تفسیر القرآن القاہرۃ ۱۳۲۱ھ۔ ۳۰ جزءً فی ۱۰ مجلدات۔

(۳۲) تفسیر القاسمی (انظر محاسن التاویل)

(۳۳) تفسیر القرآن الکریم للسید محمد رشید رضا (انظر تفسیر المنار)

(۳۴) تفسیر القرطبی (انظر الجامع لاحکام القرآن)

(۳۵) تفسیر المنار للسید محمد رشید رضا القاہرۃ سنہ ۱۳۵۴ھ

(۳۶) تفسیر ابن کثیر القاہرۃ سنہ ۱۳۷۳

(۳۷) تلخیص البیان فی مجازات القرآن للشریف الرضی القاہرۃ سنہ ۱۹۵۵م

(۳۸) تہذیب التہذیب لابن حجر العسقلانی طبعۃ حیدرآباد سنہ ۱۳۲۷ھ

(۳۹) التیسیر فی القراءات السبع لابی عمرو الدانی طبعۃ استانۃ سنہ ۱۹۳۰م

(۴۰) جامع بیان العلم وفضلہ (انظر مختصر جامع بیان العلم)

(۴۱) جامع التاویل لمحکم التنزیل لمحمد بن بحر الاصفہانی نشرہ سعید الانصاری فی کلکتہ سنہ ۱۳۴۰ھ

(۴۲) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی دار الکتب المصریۃ سنہ ۱۳۵۸ھ

(۴۳) دراسات فی فقہ اللغۃ لمؤلف ہذا الکتاب مطبعۃ جامعۃ دمشق سنہ ۱۳۷۹ھ وفی بیروت سنہ ۱۳۸۲ھ

(۴۴) الجواہر فی تفسیر لطنطاوی جوہری القاہرۃ سنہ ۱۳۴۹ھ ۲۵ جزءاً فی ۱۳ مجلداً

(۴۵) الدر المنثور فی التفسیر بالماثور للسیوطی طبعۃ الحلبی بمصر سنہ ۱۳۱۴ھ

(۴۶) الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ لابن حجر حیدرآباد سنہ ۱۳۴۸ھ

(۴۷) دلائل الاعجاز لعبد القاہر الجرجانی سنہ ۱۳۳۱ھ

(۴۸) رسالۃ التوحید للامام محمد عبدہ سنہ ۱۳۵۷ھ

(۴۹) رسالۃ الشافیۃ فی اعجاز القرآن لعبد القاہر الجرجانی القاہرۃ دار المعارف

(۵۰) الرسالۃ المستطرفۃ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفۃ لمحمد بن جعفر الکتانی۔ الطبعۃ الاولیٰ سنہ ۱۳۳۲ھ

(۵۱) روح المعانی تفسیر الالوسی۔ ۳۰ جزءاً المطبعۃ المنیریۃ بالقاہرۃ

(۵۲) ریاض الصالحین للامام النووی القاہرۃ۔

(۵۳) زاد المعاد فی ھدی خیر العباد لابن قیم الجوزیۃ القاہرۃ سنہ ۱۳۲۴ھ

(۵۴) سنن الترمذی طبعۃ بولاق سنہ ۱۲۹۲ھ۔

(۵۵) سیرۃ الرسول لابن ھشام القاہرۃ۔

(۵۶) الشاطبیۃ (حرز الامانی ووجہ التہانی فی القراءات السبع المثانی) للشاطبی مصر سنہ ۱۲۸۶ھ

(۵۷) شذرات الذہب فی اخبار من ذہب لابن العماد الحنبلی سنہ ۱۳۵۰ھ

(۵۸) طبقات النحویین واللغویین للزبیدی ابی بکر محمد بن الحسن سنہ ۱۳۷۳ھ

(۵۹) طبقات الشافعیہ لابن السبکی سنہ ۱۳۲۴ھ

(۶۰) طبقات القراء لابن الجزری

(۶۱) الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۵ مجلد لیدن سنہ ۱۹۲۸م

(۶۲) طبقات المفسرین للسیوطی طبعۃ لیدن سنہ ۱۸۳۹م

(۶۳) طیبۃ النشر فی القراءات العشر لابن الجزری سنہ ۱۳۰۸ھ

(۶۴) الظاہرۃ القرآنیۃ لمالک بن بنی القاہرۃ سنہ ۱۹۵۸م

(۶۵) ظلال القرآن لسید قطب الشہید رحمہ اللہ تعالیٰ دار احیاء الکتب العربیۃ بالقاہرۃ

(۶۶) علم اصول الفقہ لعبد الوہاب خلاف القاہرۃ سنہ ۱۳۷۳ھ

(۶۷) علوم الحدیث ومصطلحہ لمولف ھذا الکتاب جامع دمشق سنہ ۱۳۷۹ھ

٦٨) غاية النهاية في طبقات القراء لابن الجزري آستانة سنة ١٩٣٥م : مجلدات

٦٩) فتح الباري لابن حجر طبعة بولاق سنة ١٣٠١ھ

٧٠) الفتوحات المكية لابن عربي بولاق سنة ١٢٦٩ھ

٧١) فضائل القرآن لابن كثير طبعة المنار سنة ١٣٤٧ھ

٧٢) الفهرست لابن النديم سنة ١٨٧٢م

٧٣) فوات الوفيات لمحمد بن شاكر الكتبي مصر سنة ١٢٩٩ھ

٧٤) الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل للزمخشري القاهرة سنة ١٣٥٤ھ

٧٥) كشف الظنون عن اسامي الكتب والفنون لحاجي خليفة الطبعة التركية سنة ١٣٦٠ھ

٧٦) لباب التاويل في معاني التنزيل (تفسير الخازن) بهامشه تفسير البغوي مصر سنة ١٣٣١ھ

٧٧) مجاز القرآن لابي عُبَيدة مَعمر بن المثنى القاهرة سنة ١٣٧٤ھ

٧٨) محاسن التاويل لمحمد جمال الدين القاسمي القاهرة سنة ١٣٧٦ھ

٧٩) محاضرات في اصول الفقه على مذاهب اهل السنة والامامية بغداد سنة ١٣٧٥ھ

٨٠) المحكم في نقط المصاحف لابي عمرو الداني۔ دمشق سنة ١٩٦٠م

٨١) مختصر جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البر اختصار احمد بن عمر المحمصاني البيروتي سنة ١٣٢٠ھ

٨٢) مختصر في شواذ القراءات لابن خالويه القاهرة سنة ١٩٣٤م

٨٣) مدارك التنزيل وحقائق التاويل (تفسير النسفي) القاهرة سنة ١٣٤٤ھ

٨٤) مذاهب التفسير الاسلامي للمستشرق جولدزيهر ترجمة الدكتور

(۸۵) مسند الامام احمد بن حنبل القاهرة سنہ ۱۳۱۳ھ
(۸۶) المصاحف لابن ابی داؤد۔ لیدن سنہ ۱۹۳۷م
(۸۷) المقصد لتلخیص ما فی المرشد لزکریا الانصاری القاهرة سنہ ۱۹۳۴م
(۸۸) المقنع فی رسم مصاحف الامصار لابی عمرو الدانی استانۃ سنہ ۱۹۳۲م
(۸۹) مناهل العرفان فی علوم القرآن لمحمد عبدالعظیم الزرقانی القاهرة
سنہ ۱۳۷۳ھ
(۹۰) النبأ العظیم۔ نظرات جدیدة فی القرآن للدکتور محمد عبداللہ دراز
رحمہ اللہ القاهرة سنہ ۱۳۷۶ھ
(۹۱) النجوم الزاهرة لابن تغری بردی دار الکتب المصریۃ
(۹۲) الناسخ والمنسوخ لابی جعفر النحاس القاهرة۔ سنہ ۱۳۲۳ھ
(۹۳) النشر فی القراءات العشر لابن الجزری طبعة دمشق سنہ ۱۳۴۵ھ
(۹۴) النقط لابی عمرو الدانی استانۃ سنہ ۱۹۳۲م
(۹۵) النکت فی اعجاز القرآن للرمانی دار المعارف القاهرة
(۹۶) وفیات الاعیان لابن خلکان القاهرة سنہ ۱۳۱۰ھ فی مجلدین
(۹۷) الوحی المحمدی للسید رشید رضا مطبعة المنار القاهرة سنہ ۱۳۵۲ھ

اَلْمَذَاھِبُ الْاِسْلَامِیَۃ یعنی

اِسْلامی مذاہب

تصنیف : ——— ابوزہرہ ۔ مصری

ترجمہ : ——— غلام احمد حریری، ایم ۔ اے

شیخ ابوزہرہ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، المذاہب الاسلامیہ مصر کے اس مایۂ ناز مصنف کی کاوش کا نتیجہ ہے جس کا ترجمہ جناب پروفیسر غلام احمد صاحب حریری نے نہایت شگفتہ انداز میں قارئین کرام کے سامنے پیش کیا ہے۔ شیخ ابوزہرہ کی یہ کتاب الملل والنحل شہرستانی، الفصل ابن حزم اور الفرق بین الفرق عبدالقادر بغدادی وغیرہ کی عربی کتب کا گویا نعم البدل ہے۔ کتاب کے سیکڑوں عنوانات میں سے صرف چند ایک نیچے دیے گئے ہیں تاکہ ایک ہی نظر میں اس کی افادی حیثیت سامنے آسکے۔

(۱) مسلمانوں کے اختلاف کے اسباب	(۵) سیاسی فرقوں کا دین سے ربط و تعلق	(۹) اعتقادی مذاہب اور ان کی تفصیلات
(۲) مسلمانوں کے اختلافات کی حدود	(۶) شیعہ فرقے اور ان میں سے ہر	(۱۰) مسئلہ خلق قرآن
(۳) سیاسی مذاہب	ایک پر مکمل تبصرہ	(۱۱) جدید فرقے
(۴) مسئلہ خلافت میں اختلاف کے	(۷) خوارج کے فرقے	(۱۲) بہائی فرقہ
مراحل و ادوار	(۸) خلافت کے مسئلہ میں مسلک جمہور	(۱۳) قادیانیت

فاضل مصنف نے بہائیوں اور قادیانیوں کے بارے میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کتابت طباعت اعلیٰ، کاغذ گلیز، جلد عمدہ، گردپوش دیدہ زیب، صفحات ۳۲۰۔ سائز ۲۰×۲۶/۸

قیمت ——— روپے

پاکستان کے عظیم مفکر اور مفسر قرآن

مولینا امین احسن اصلاحی کے قلم سے

تزکیۂ نفس

اہلِ تصوف کے فرسودہ اور غلط نظریات پر کڑی تنقید

اسلام میں تزکیۂ نفس کی جو اہمیت ہے وہ کسی مسلمان پوشیدہ نہیں۔ قرآن حکیم میں بعثتِ انبیاء کا مقصد، نفوس انسانی کا تزکیہ بیان فرمایا گیا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اُمت میں پیشہ ور خرقہ پوشوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے اتباع شریعت کے بجائے "علوم باطنی" کے درس دینے شروع کر دیے۔ مولینا امین احسن اصلاحی نے قرآن و سنت اور دین اسلام کے مجموعی مزاج سے استدلال کر کے اس اعتقاد کی غلطیوں اور اس سے پیدا شدہ مہلک نتائج پر کامیاب تنقید کی ہے۔

سائز ۱۸×۲۲/۸ ضخامت ۳۴۴ صفحات۔ مجلد کپڑا۔ سنہری ڈائی

قیمت ____ /= روپیے

مصنف کی دیگر بلند پایہ تصانیف

(۱) "پاکستانی عورت دوراہے پر" سائز ۱۸×۲۲/۸ آفٹ، ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ قیمت

(۲) "عائلی کمشن رپورٹ پر تبصرہ" سائز ۱۸×۲۲/۸ نیوز پرنٹ، ضخامت ۱۶۸ صفحات قیمت

(ناشرین)

ملک سنز پبلشرز، کارخانہ بازار فیصل آباد پاکستان فون ۲۳۷۵

فضائلِ درود شریف (عکسی)

مصنفہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ

اختلافِ مسالک کے باوجود حضرت شیخ الحدیث کی فاضلانہ تصانیف کا تمام مکاتیبِ فکر کے اہل علم حضرات نے خیر مقدم کیا ہے اور علماءٔ ومشائخ نے خاص طور پر انہیں پسند فرمایا ہے۔

کتاب ھٰذا کی سطر سطر محبوبِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عشق ومحبت کی آئینہ دار ہے۔

* کتابت واضح اور عمدہ ✱ کاغذ سفید۔ سائز ۱۸×۲۲/۸
* طباعت ونڈائنگ آفسٹ ✱ ضخامت ۱۶۴ صفحات
* قیمت ——— [illegible] روپے [illegible] پیسے

کتاب نمبر

——— (ناشرین) ———

ملک سنز پبلشرز کارخانہ بازار فیصل آباد
پاکستان
فون ۲۴۳۷۵

ملک سنز
کی خوبصورت اور معیاری مطبوعات







